# لبِ فُرات

ڈاکٹر سیّد صفدر حسین کے عزائیہ کلام کا مجموعہ

مع

## تنقید و تبصرہ

# لبِ فراُت

## عزائیہ کلام کا مجموعہ

| | |
|---|---|
| سالِ طبع | ۱۹۷۶ء |
| تعداد | ایک ہزار |
| کتابت | نبیل احمد خان |
| طابع | اُردو ڈائجسٹ پرنٹرز، لاہور |
| ناشر | سیّد ظفر حسن |
| قیمت | [redacted] روپے |

# بارگاہِ ادب

منظرؔ منزل۔ ۴۵ حیدر روڈ۔ اسلام پورہ

لاہور

# لبِ فُرات

ڈاکٹر سیّد صفدر حسینؔ کے عزائیہ کلام کا مجموعہ

مع

تنقید و تبصرہ

# لبِ فُرات

کیوں نہ اس شہرِ تجلی سے پشیماں ہو رات      کہکشانِ مہ و انجم ہے لبِ نہرِ فُرات

یہ دمکتے ہوئے گنبد، یہ چمکتے ہوئے بُرج      جن کی پیشانی پہ کندہ ہیں خدا کے آیات

ایک مینارِ ضیا کا بہ جہانِ تاریک      اِک دلیلِ سحرِ نو بہ دیارِ ظُلمات

اِک یہ سمٹا ہوا گوشہ کہ جہاں رات بھی دن      اِک وہ پھیلی ہوئی دنیا کہ جہاں دن بھی رات

ہیں اِسی خاک میں وہ عرشِ عُلا کے تارے      عزم سے جن کے بنی دین کی بگڑی ہوئی بات

اِن کے قدموں پہ کیا موت نے جس دن سجدہ      ہے اُسی دن سے شہیدوں کی کنیزی میں حیات

جن کا ہر نقشِ قدم کتبۂ تقدیرِ اُمم      جن کا ہر نقشِ قدم نقطۂ تاریخِ ثبات

تشنہ کامانِ محبت کو صدا دیتی ہے      جن کے مدفن کی خموشی بہ زبانِ ذرات

عرصۂ دانش و تہذیب سراب است سراب!

تو اگر خستہ و لب تشنہ بیا سوئے فرات!

# ترتیب

## حصۂ نظم

## حصۂ تنقید

مرثیہ نمبر ۱

# آئینِ وفا

نیّرِ برجِ امامت کی ضیا تھے عباسؑ

دربیانِ سیرت و حیاتِ حضرتِ ابوالفضل العباس علیہ السلام

بند: ۱۰۹

تاریخِ تصنیف: جون ۱۹۶۴ء

# رباعی

جذبۂ گرمیِ گفتار ابھی باقی ہے
یعنی شوقِ رَسَن و دَار ابھی باقی ہے
ہم کہ ہیں ناشرِ پیغامِ حسینؑ ابنِ علیؑ
ہم میں وہ جراَتِ انکار ابھی باقی ہے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نیّرِ برجِ امامت کی ضیا تھے عباسؑ — پیکرِ خاک میں حیدرؑ کی دُعا تھے عباسؑ
بہرِ شبیرؑ مشیّت کی عطا تھے عباسؑ — شوکتِ معرکۂ کرب و بلا تھے عباسؑ
اہلِ حق اِن کو زعیم الشہدا کہتے ہیں
اِن کے اخلاص کو معیارِ وفا کہتے ہیں

اِن کی تخلیق ہوئی دین کی نصرت کے لئے — فرض نے اِن کو چُنا اپنی وضاحت کے لئے
چہرہ تصویر بنا رنگِ شہادت کے لئے — اِن کی تلوار بنی ہاتھ مشیّت کے لئے
گُلِ زہراؑ نہ سہی سروِ چمن ہیں یہ بھی
مہرِ تابانِ امامت کی کرن ہیں یہ بھی

عزم وہ جس کے لئے تنگ ہو ظرفِ کونین — وہ شجاعت جو بنی قوّتِ بازوئے حسینؑ
وہ جلالت کہ جو تھی آیتِ ربّ الثقلین — ہمہ تن حوصلۂ فاتحِ صفین و حنین
سر بسر باپ کے اوصاف کی تنویر لیے
آئینہ عرش سے اُترا وہی تصویر لیے

دُودھ سے ماں کے ملی جرأت و ہمت اِن کو — خونِ حیدرؑ نے دیا جوشِ شجاعت اِن کو
خُلقِ شبّرؑ نے سکھائی تھی مروّت اِن کو — عزمِ شبیرؑ نے بخشی تھی جلالت اِن کو
جذبۂ شیرِ خدا قوّتِ ایمانِ حسینؑ
ایک جا زورِ علیؑ حُسنِ حسنؑ شانِ حسینؑ

اِن کو اسلاف کی اِک زندہ نشانی کہیے    ثانیِ شیرِ خدا جعفرِ ثانی کہیے
ہیبتِ رُخ کو شجاعت کی جوانی کہیے    تابِ رُخسار کو تلوار کا پانی کہیے
یہ وہ پانی کہ شجاعت کا ہے قلزم جس سے
ہُوا دو لاکھ کے لشکر میں تلاطم جس سے

اے مری طبعِ رسا ذہن کی پرواز دکھا    اے سخن معجزۂ نطقِ خدا ساز دکھا
اے زباں جوہرِ آئینۂ اعجاز دکھا    جنبشِ شہپرِ جبریلؑ کا انداز دکھا
عرش سے حُسنِ معانی کی ضیا آنے لگے
صاف پردوں کے سرکنے کی صدا آنے لگے

مدحِ عباسؑ کا منصب مری قسمت کو ملا    ایک اک بیت پہ لینا ہے محمدؐ سے صلا
ہاں مری طبعِ چمن خیز وہ گلزار کھلا    جس کے پھولوں کو لگی ہو نہ گلستاں کی ہوا
ذہن بیدار ہوں یوں بوئے گُلِ تر پھیلے
دُور تک نکہتِ گیسوئے معنبر پھیلے

جلوۂ نورِ حسینیؑ کی ہے عباسؑ میں ضو    ان کے آئینے پہ ہے شیرِ خدا کا پرتو
پہنچی اِس شمع میں سوزِ دلِ شبیرؑ کی لو    آیتیں مصحفِ رُخسار میں پیدا ہوئیں سَو
فیضِ شبیرؑ سے ذرّے میں دمک آنے لگی
غنچہ چٹکا گُلِ زہراؑ کی مہک آنے لگی

ہوئے پیدا تو کھُلی گود میں شبیرؑ کی آنکھ    عمر بھر دیکھی اُسی صاحبِ توقیر کی آنکھ
ہر بُنِ مُو سے نمایاں ہوئی تنویر کی آنکھ    آنکھ وہ آنکھ کہ کہیے جسے تاثیر کی آنکھ
عارضِ سبطِ پیمبرؐ کی ضیا کو دیکھا
آنکھ کچھ اور کھُلی جب تو خدا کو دیکھا

ساتویں بار جو اِس چاند نے دیکھا مہِ عید — ماں نے آراستہ کی گھر میں تقریبِ سعید
پائے شبیرؑ پہ رکھ کر سرِ فرزندِ رشید — کردی اِک رشتۂ اخلاص کی توثیقِ مزید
ہوئی عباسؑ کو تفویض غلامیِ حسینؑ
لوحِ قسمت پہ کھُدا نامِ گرامیِ حسینؑ

عِلم کا شوق تھا مائل ہمہ دانی کی طرف — مُلتفت ذوقِ نظر حُسنِ معانی کی طرف
جب بڑھی عُمر لڑکپن سے جوانی کی طرف — ہاتھ بڑھنے لگے تیغِ صفہانی کی طرف
کتنی بھرپور سجی کتنی طرحدار آئی
ہاتھ میں بیٹے کے جب باپ کی تلوار آئی

یوں ہی جب تیس برس عُمر کی تکمیل ہوئی — اور حالات کی اِس طور سے تشکیل ہوئی
شانِ دیں شوکت اورنگ میں تبدیل ہوئی — ہوسِ جاہ میں یہ سعی بہ تعجیل ہوئی
کہ محمدؐ کے گھرانے کو مٹایا جائے
اِس چراغِ اَبدیت کو بجھایا جائے

ہوئے عباسؑ اُسی دورِ تلاطم میں جوان — دل میں تھے مثلِ علیؑ خدمتِ حق کے ارمان
وہی تیور وہی قوت وہی کس بَل وہی شان — ہر نظر جذبۂ اخلاص و صداقت کی زبان
دل سے آواز یہ آتی تھی اُجالا کیجے
عزم کہتا تھا کہ دُنیا تہ و بالا کیجے

امتحاں گاہِ شجاعت ہوا دربارِ ولید — جب کہ موصول ہوا شام سے یہ حکمِ یزید
جس میں تھی شاہ سے بیعت طلبی کی تاکید — اور نہ مانیں تو کیا جائے وہیں اُن کو شہید
کی جو حاکم نے ذرا تیز نظر سوئے حسینؑ
آگیا تیغ بکف قوتِ بازوئے حسینؑ

کہا للکار کے او حاکمِ سفاک خموش
والیِ شام ہے کیا اے سگِ ناپاک خموش
اُس کی بیعت کرے سبطِ شہِ لولاک خموش
منہ سے کیا کہہ گیا تو منہ میں ترے خاک خموش
دیکھتا کیا ہے اِدھر آنکھ دکھانے والے
کس سے دبتے ہیں محمدؐ کے گھرانے والے

ہیبتِ شیر سے گونگی ہوئی حاکم کی زبان
گرچہ سر دفترِ اشرارِ مدینہ مروان
ذہن پر اُس کے مسلط تھا مثالِ شیطان
پھر بھی وہ چپ رہا جلتے رہے اُس کے ادسان
آنکھیں نیچی ہوئیں اُٹھ کر اُنھیں ملنے نہ دیا
رُعبِ جرّار نے کمبخت کو ہلنے نہ دیا

عارضی طور پہ یوں ٹل تو گئی بات مگر
مصلحت دیکھ کے حضرت نے کیا عزمِ سفر
رات کو قبرِ نبیؐ سے ہوئے رخصت سرور
چل پڑے خانۂ کعبہ کی طرف وقتِ سحر
اہلِ دل، اہلِ نظر، اہلِ صفا ساتھ لیے
یعنی جن جن کو مشیت نے چُنا ساتھ لیے

راہ طے کر کے ہوئے داخلِ مکہ شبیرؑ
چار سو پھیل گئی جلوۂ حق کی تنویر
ارضِ کعبہ کی بڑھی گردِ قدم سے توقیر
سیرتِ پاک نے دکھلادی نبیؐ کی تصویر
حسنِ اخلاق کا کلمہ پڑھا بیگانوں نے
آتے ہی گھیر لیا شمع کو پروانوں نے

قاصد آنے لگے لے لے کے وفا کے پیغام
گرمِ سازش ہوا سُن کر یہ سخن والیِ شام
خانۂ حق میں بچھا دیکھ کے تزویر کا دام
آپ نے کھول دیا باندھ کے حج کا احرام
سُن کے حالات کی خاموش گواہی آخر
اپنی منزل کو روانہ ہوا راہی آخر

پھر وہی دامنِ صحرا تھا وہی گردِ سفر — سایۂ نخل نہ تھا راہ میں تا حدِ نظر
ہر قدم مرحلۂ سخت سرِ راہ گذر — پہنچے منزل پہ زبالہ کی تو آئی یہ خبر
قتلِ مسلمؑ ہوئے کوفے میں قیامت آئی
ابنِ مرجانہ کے قبضے میں حکومت آئی

حادثہ یہ دلِ عباسؑ کے حق میں ہوا تیر — زوجۂ حضرتِ مسلمؑ تھیں حقیقی ہمشیر
دی تسلی یہ بہن کو کہ نہ ہو یوں دلگیر — اے خوشا مسلمِؑ جانباز اور اُن کی تقدیر
وہ ہوئے فدیۂ سلطانِ زمن صبر کرو
یہ تو اک شکر کا موقع ہے بہن صبر کرو

تم کو معلوم تھیں مقصدِ عزمِ شبیرؑ — طالبِ تخت نہیں زاہدِ قانع بہ حصیر
چاہتا ہوں کہ نہ ہو عدلِ خدا کی تحقیر — امتحاں گاہ میں ہیں آج صغیر اور کبیر
مانگ اور کوکھ ہے کیا امرِ الٰہی میں بہن
امتحاں فرض کا ہوتا ہے نباہی میں بہن

ہو نہ مایوس ابھی قہرِ خدا راہ میں ہے — رحم گو طینتِ مولائے حق آگاہ میں ہے
ولولہ نصرتِ حق کا بھی دلِ شاہ میں ہے — جوہرِ عدل بھی شمشیرِ یداللہ میں ہے
آپ چاہیں تو ابھی ظلم کا منہ فق کر دیں
ایک انگلی سے سیاہی کا جگر شق کر دیں

الغرض قافلہ ٹھہرا نہیں آگے ہی بڑھا — مائلِ قطعِ مسافت رہے شاہِ دوسرا
آ کے ملتے گئے رستے میں کچھ اربابِ صفا — پائے اقدس پہ فرزدق نے بھی آنکھوں کو ملا
عزمِ شبیرؑ سے عالم کی نظر دنگ رہی
دل کی آواز سے رفتار ہم آہنگ رہی

قادسیہ کے قریں تھا وہ گروہِ مدنی　　سامنے دشت سے بیساختہ آندھی سی اُٹھی
دامنِ گرد پھٹا، فوج نمودار ہوئی　　شہِ والا کے رفیقوں نے نظر تیغ پہ کی
بولے عباسؑ کہ کیوں سر پہ چڑھے آتے ہو
کس نے دی تم کو اجازت کہ بڑھے آتے ہو

باادب ہو یہ ہے سرکارِ خداوندِ زمیں　　میرا سزوار ہے ناموسِ دو عالم کا امیں
وارثِ علمِ نبیؐ دوشِ محمدؐ کا مکیں　　خوں کا دریا نہ بہا دوں تو میں عباسؑ نہیں
ہیں شغالوں کی قطاریں یہ پیادے کیا ہیں
زندہ رہنا ہے تو کہہ دو کہ ارادے کیا ہیں

کس کی ہمت تھی کہ دیتا کوئی غازی کو جواب　　شدتِ تشنہ دہانی سے کلیجے تھے کباب
کئی دن سے نہ ملا تھا انھیں اک قطرۂ آب　　ہر تگ و دو نے دکھایا تھا تماشائے سراب
مشکیں خالی تھیں اور اشکوں سے بھری تھیں آنکھیں
سائلِ فیضِ امامِ مدنی تھیں آنکھیں

افسرِ فوج تھا حُر ابنِ ریاحی اُن کا　　بات جو پیاس کی شدت سے نہ کر سکتا تھا
حال یہ دیکھ کے شبیرؑ کا دل بھر آیا　　مضطرب ہو کے یہ عباسؑ سے حضرت نے کہا
اِن کے سوکھے ہوئے ہونٹوں سے دُعا لو بھائی
اپنے اللہ کے بندوں کو بچا لو بھائی

حکم ہونٹوں سے نہ نکلا تھا کہ تعمیل ہوئی　　مشکیں اونٹوں سے اُتاری گئیں تعجیل ہوئی
رحم آسودہ ہوا فرض کی تکمیل ہوئی　　دیکھتے دیکھتے صحرا کی زمیں جھیل ہوئی
گھر کے ابرِ کرمِ ساقیِ کوثر آئے
مشک کاندھے پہ اُٹھائے علی اکبرؑ آئے

چھاگلیں لے کے بڑھا آپ علمدارِ جری　　فرس و قاطر و اُشتر ہوئے سیراب سبھی
سوکھے ہونٹوں پہ نمایاں تھی تشکر کی تری　　دل عقیدت سے بھرا آنکھ ندامت سے جھکی
شرمِ احساں سے ہوئی فوجِ ستمگر پانی
اِس کو کہتے ہیں کرم ہو گئے پتھر پانی

ہوا اُس روز وہیں دین کے لشکر کا قیام　　دوسرے دن تھے مہیائے سفر شاہِ انام
پا رکبو کہہ کے ہوئے زیبِ دہ زیں جو امام　　حُر نے پاس آ کے پکڑ لی فرسِ شہ کی لگام
عرض کی اور کسی سمت نہ جائیں حضرت!
راہ کوفے کی اِدھر ہے اِدھر آئیں حضرت!

حُر نے ہر چند یہ چاہا کہ نہ ہو بے ادبی　　نرم لہجہ تھا مگر بات تھی گستاخی کی
بس یہ سُننا تھا کہ انصار کی تلوار کھنچی　　سینۂ حُر پہ تھی عباسؑ کے نیزے کی انی
مُلتجی اِذن کا تھا قوتِ بازوئے حسینؑ
آنکھ تھی منتظرِ جنبشِ ابروئے حسینؑ

شاہ تھے حلم سے مجبور رضا کیا دیتے　　حُر کے انجام سے واقف تھے سزا کیا دیتے
اپنے پروانوں کو شعلوں کی ہوا کیا دیتے　　حُر تھا حُر اُس کو دُعاؤں کے سوا کیا دیتے
سب کو سمجھا کے ولی ابنِ ولی نے روکا
اپنے ضیغم کو حسینؑ ابنِ علیؑ نے روکا

جوڑ کر ہاتھ کہا حُر نے کہ مجبور ہوں میں　　امر ہے لائقِ تعزیر پہ مامور ہوں میں
اپنی اِس شومیِ تقدیر سے رنجور ہوں میں　　سجدے شاہد ہیں غلامِ شہِ جمہور ہوں میں
آرزو یہ ہے کہ حضرت نہ مصیبت میں پڑیں
کون چاہے گا کہ سرکار ہلاکت میں پڑیں

آپ ہیں سرورِ دیں بادشہِ کون و مکاں — نورِ حق، شمعِ ہدیٰ، زینتِ بزمِ دوجہاں
وہی کر سکتا ہے وصفِ شہِ ابرار بیاں — دھوئے جو کوثر و تسنیم کے پانی سے زباں

میں ہوں حاضر متوجہ ہو جدھر پائے صواب
آپ کا عزمِ ہمایوں ہے سراپائے صواب

میرے ماں باپ فدا دین کے سردار ہیں آپ — حُر مرا نام ہے اور سیدِ احرار ہیں آپ
عذر کیجے مری مجبوری پہ مختار ہیں آپ — دیجئے اتنی رضا رحمتِ غفار ہیں آپ

ساتھ ہو گردِ سواری کے یہ بندہ پیچھے
آپ آگے رہیں اور میرا رسالہ پیچھے

الغرض شاہ بڑھے سرحدِ عرفاں کی طرف — رُخ نشادر نے کیا شورشِ طوفاں کی طرف
لے گئی دل کی کشش منزلِ جاناں کی طرف — مُڑ گئی رحمتِ معبود بیاباں کی طرف

آئی آواز مبارک ہے ارادہ تیرا
قابَ قوسین سے نزدیک ہے جادہ تیرا

اے کہ سینہ ہے ترا نورِ خدا کی منزل — ہو مبارک تجھے یہ کرب و بلا کی منزل
آ گئی سامنے تسلیم و رضا کی منزل — یہ وہ منزل ہے کہیں جس کو وفا کی منزل

اہلِ عرفاں کو ملے گا یہیں منزل کا سراغ
عشق پائے گا یہیں کوچۂ جاناں کا سراغ

دامنِ موسمِ گل ہے ترے دامن کی ہوا — جس سے وابستہ رہے گی مری رحمت کی گھٹا
مطلعِ نور رہے گی ترے مدفن کی فضا — خاکِ مشہد کو ملے گا شرفِ خاکِ شفا

بک چکی میری رضا اُس کا خریدار ہے تو
آج سے دولتِ کونین کا مختار ہے تو

سُن کے یہ نعرۂ حق اسپِ حق آگاہ رُکا     سُونگھی جھک جھک کے زمیں اور فرسِ شاہ رُکا
کارواں کیوں نہ ستاروں کا رُکے ماہ رُکا     شقّۂ رایتِ اسلام سرِ راہ رُکا
پیاسے بچّوں کے بلکنے کی صدا آنے لگی
بوئے خوں لے کے ترائی سے ہوا آنے لگی

لبِ دریا قدمِ سیّدِ اکرم ٹھہرے     موکبِ شاہ رُکا حامی و ہمدم ٹھہرے
اب بڑھے کون کہ سلطانِ دوعالم ٹھہرے     خم تھا مُجرے کے لئے ماہِ محرّم ٹھہرے
ناخدا کشتیِ اُمّت کا لبِ جُو اُترا
تھام کر اپنے علمدار کا بازو اُترا

دوسری ماہِ محرّم سے دہم تک پیہم     امتحاں گاہ میں تھے نازشِ آدم کے قدم
مرحلے عشق کے اور فرض کے جتنے تھے اہم     سب میں عبّاسؑ علی شاملِ سُلطانِ اُمم
تا بہ عاشور رہے کارِ امامت میں شریک
جس طرح شیرِ خدا کارِ رسالت میں شریک

دیکھ کر بے ادبیِ سپہِ کوفہ و شام     کبھی ہوتا تھا جو برہم وہ علیؑ کا ضرغام
پیار سے دوشِ مبارک کو تھپکتے تھے امام     ہنس کے کہتے تھے کہ غصّہ ہے شجاعت پہ حرام
مرحمت شاہ کی جب آئینہ دکھلاتی تھی
ہر شکن ابروئے عبّاسؑ کی مٹ جاتی تھی

کہیں تدبیرِ جفا تھی کہیں دامِ تزویر     کہیں یہ فکر کہ دریا پہ نہ ٹھہریں شبّیرؑ
کہیں ہر بات میں تھی آلِ نبیؐ کی تحقیر     کہیں یہ گھات کہ اولادِ پیمبرؐ ہو اسیر
ہر وہ عقدہ کہ جو تشویش فزا ہوتا تھا
ناخنِ حضرتِ عبّاسؑ سے وا ہوتا تھا

معرکہ پہلا پسِ داخلۂ کرب و بلا  موکبِ دیں کے ترائی میں اترنے پہ ہوا
دشمنانِ شہِ ذی شاں کو یہ منظور نہ تھا  کہ لبِ نہر خیامِ شہ والا ہوں بپا
گھاٹ اُدھر روکنے بے دین و جفاکار بڑھے
اِس طرف غیظ میں عباسِؑ علمدار بڑھے

تیغ پر ہاتھ تھا اور دوش پہ بے چین تھی ڈھال  آگیا جوشِ وغا آنکھ کے ڈورے ہوئے لال
پیچ و خم کھا کے ہلے زلف کے بکھرے ہوئے بال  دی شجاعت نے ندا اے اسد اللہ کے لال
ایک لمحے کے لئے اِذنِ وغا مل جائے
چینِ اَبرو کی قسم گوشۂ زمیں ہل جائے

پیش قدمی کوئی کرتا یہ نہ تھی تاب و مجال  ابتری فوج میں ظاہر ہوئی جیسے بھونچال
شاطرانِ سپہِ شام تھے بھولے ہوئے چال  بد حواسی میں سمجھنے لگے تلوار کو ڈھال
دوش پر جائے کماں خنجرِ بُرّاں رکھا
تیغ ترکش میں رکھی میان میں پیکاں رکھا

اِس تلاطم کی ہوئی سبطِ نبیؐ کو جو خبر  بھائی کے جوشِ محبت پہ ہوا آب جگر
اشک آنکھوں سے بہے ریشِ مبارک ہوئی تر  بڑھ کے فرمایا کہ اے حیدرِ صفدر کے پسر
روک لو ہاتھ یہ اُمت کہیں برباد نہ ہو
میرا منشائے شہادت کہیں برباد نہ ہو

کیوں خفا ہوتے ہو شبیر ہے راضی بہ رضا  اُمتِ جد ہیں رہے اِن کو مبارک دریا
اِن کی خواہش ہے تو ریتی ہی پہ خیمے ہوں بپا  جو فریضہ ہے ہمارا بہ سہولت ہو ادا
مجھ پہ روشن ہے جو کچھ پردۂ تقدیر میں ہے
میرے غازی یہ ترائی تری جاگیر میں ہے

دیکھتا ہوں میں مشیت کے اشارے عباسؑ     تم بسو گے اسی دریا کے کنارے عباسؑ
موجیں دہرائیں گی افسانے تمہارے عباسؑ     مرے پیارے مرے اللہ کے پیارے عباسؑ
سیرتِ جعفرؑ طیار دکھانا ہے تمہیں
ایک تاریخ یہاں آکے بنانا ہے تمہیں

لبِ اعجازِ امامت سے سُنے جب یہ سخن     برہمی بھول گئی اپنی اداؤں کا چلن
خود سے شرما گئی آئی ہوئی ماتھے کی شکن     سرخیِ غیظ نے چہرے سے سمیٹا دامن
پھر سے بیساختہ پن آگیا تیوروں میں
ولولے قید ہوئے حلم کی زنجیروں میں

ضیغمِ شہ پہ جو روشن ہوا منشائے امام     تیغِ غازی ہوئی پھر زینتِ آغوشِ نیام
ہٹ کے دریا سے بپا ہو گئے ریتی پہ خیام     محملوں سے اتر آئے حرمِ شاہِ انام
چین پھر بھی نہ ملا غم کی فراوانی سے
ظلم کی آگ کا آغاز ہوا پانی سے

خاص احکام لئے لشکرِ اعدا پہنچا     فوج پر فوج، رسالے پہ رسالہ پہنچا
روک دو گھاٹ کو کوفے سے یہ شقّہ پہنچا     جس کی مولا نے خبر دی تھی وہ دن آپہنچا
دلِ عباسؑ میں اک جوشِ فراواں جاگا
جس کو حضرت نے سُلایا تھا وہ طوفاں جاگا

ساتویں سے متردد ہوئے انصارِ امام     بھر کے اک مشک بھی پہنچا نہ سکے تا بہ خیام
جب کنواں کھود کے بھی رہ گئے غازی ناکام     اور بے پاؤں بڑھی آٹھویں تاریخ کی شام
پھر تو وہ شیرِ نیستانِ شجاعت اٹھا
لے کے اک جذبۂ تحصیلِ سعادت اٹھا

ہوا حاضر بہ سرا پردۂ شاہِ دوسرا    پیچھے پیچھے تھی سکینہ لیے بچوں کا پرا
شہ نے پہچان کے تیور، نفسِ سرد بھرا    بولے عباسؑ کہ آتی ہے اب آوازِ درا
قافلہ عمر کا منزل کی طرف جاتا ہے
یہ غلام آپ کا ساحل کی طرف جاتا ہے

اب تو حضرت سُنی جاتی نہیں بچوں کی فغاں    کیا گلا کاٹ کے مر جاؤں میں یا شاہِ زماں
میرا منہ دیکھ کے رہ جاتے ہیں طفلِ ناداں    گاہ آآ کے دکھاتے ہیں مجھے خشک زباں
دل پہ گھر کر الم و غم کا سحاب آتا ہے
پسرِ ساقیِ کوثر ہوں حجاب آتا ہے

ہوش خادم نے سنبھالا تھا اسی دن کے لیے    دلِ مضطر تہ و بالا تھا اسی دن کے لیے
میری ماں نے مجھے پالا تھا اسی دن کے لیے    فرض نے موت کو ٹالا تھا اسی دن کے لیے
اب تو مولا مجھے لڑنے کی اجازت دیجے
یہ نہ ممکن ہو تو سقائی کی خدمت دیجے

وعدہ کرتا ہوں کہ تلوار نہ لے جاؤں گا    مشکیں خاموشی سے بھر لوں گا چلا آؤں گا
صبرِ حضرت کا نمونہ انھیں دکھلاؤں گا    سر جھکا کر تبر و تیر و سناں کھاؤں گا
ایک نیزے کی اجازت ہو ضرورت کے لیے
وہ بھی اپنی نہیں مشکوں کی حفاظت کے لیے

التجا مرضیِ آقا کے مطابق جو یہ تھی    رُخ سے ظاہر ہوا ایمائے حسینؑ ابنِ علیؑ
دلِ عباسؑ میں اُمید کی بجلی چمکی    تھا بہشتی تو سند مل گئی سقائی کی
اُٹھ کے بازو جو شہِ جن و بشر نے چومے
ہاتھ اقبال نے اور پاؤں ظفر نے چومے

حکمِ سردار سے ہوئے ہیں[2] پیادے تیار　　جن کی مشکوں کی حفاظت کے لئے تیس[3] سوار
ابنِ نافع سے بھی آگے تھے بُریرِ جرّار　　قائدِ دستہ، احرارِ علیؑ کا دلدار
سب سے آگے تھا علم دوش پہ لہرائے ہوئے
لب خشکیدۂ اصغرؑ کی قسم کھائے ہوئے

چاندنی رات تھی اور گیسوئے شب تابہ کمر　　نورِ پرچم سے خجل عارضِ شادابِ قمر
ٹھنڈے ٹھنڈے نفسِ سرد سے شبنم کے گُہر　　بزمِ فطرت کو یہ ڈر تھا کہ نہ لگ جائے نظر
لبِ دریا بنی ہاشم کے قمر کے جلوے
بھیگتی رات کو بخشیں گے سحر کے جلوے

گھاٹ روکے ہوئے دریا کا عدو چار ہزار　　جن کے دل میں تھا محمدؐ کے گھرانے سے غبار
حجر و شیث و عمر لشکرِ شر کے سردار　　پُر دغا، اہلِ جفا، دشمنِ دیں، بدکردار
جنگِ صفّین سے بھاگے ہوئے غم کھائے ہوئے
دستِ کرّارؑ سے زخموں کا مزا پائے ہوئے

بندشِ آب میں جوڑے ہوئے سر کو باہم　　لاف زن تھے کہ ہٹے ہیں کہیں مردوں کے قدم
بُزدلی کہتی تھی آجائے جو بوئے ضیغم　　ابھی اِک آن میں کھُل جائے شغالوں کا بھرم
گِریں اُٹھ اُٹھ کے غبارِ رہِ صحرا کی طرح
آبرو ہاتھ سے جاتی رہے دریا کی طرح

سرِ ساحل جو ٹہلتے تھے سلحشور جواں　　اُن کو تکتی تھی حقارت سے ہر اک موجِ رواں
روشنی چاند کی دھیمی وہ میانِ میداں　　سحرِ نور کا ہو جیسے دھندلکے میں سماں
یک بیک دُور سے بڑھتے ہوئے سائے دیکھے
کچھ جری دوش پہ مشکیزے اُٹھائے دیکھے

راس و چپ اُن کے محافظ تھے سمندوں پہ سوار — شاہدِ حوصلۂ عزم تھی جن کی رفتار
نہ پسِ پُشت سپر اور نہ کمر میں تلوار — چشمِ افلاک نے دیکھے تھے نہ ایسے جرّار
دل شگفتہ تھے دلیروں کے چمن کی صورت
دستِ فولاد میں نیزے تھے کرن کی صورت

آگے آگے عَلَمِ شیرِ خدا جلوہ فشاں — سایۂ دامنِ رحمت سرِ فوجِ یزداں
وہ علمدار جسے دیکھ کے فوجیں لرزاں — چھپ گئے تیر فگن پھینک کے گوشوں میں کماں
تھی جو ہیبت تو جگرداروں کو روکا نہ گیا
لاکھ دعوے تھے مگر ایک سے ٹوکا نہ گیا

بڑھ کے عباسؑ نے حجاج کے بیٹے سے کہا — سندِش آب کا کل شب سے سُنا تھا چرچا
گھاٹ کے روکنے والے ہیں کدھر کچھ نہ کھلا — لو خبردار کہ ہم جاتے ہیں سوئے دریا
اپنی ضربوں کی نشانی تمہیں دے جائیں گے
کاٹ کر نہر کو بے تیغ کے لے جائیں گے

تجھ میں ہمت ہو تو آ دیکھ شجاعوں کا جلال — ہم وہ ہیں چھپ کے رکھ دیتے ہیں مہتاب کی ڈھال
جب اُٹھاتے ہیں نظر مہر کو آتا ہے زوال — لیں جو انگڑائی تو ٹوٹے یہ ستاروں کا جال
ہم جو گرجیں تو پہاڑوں کے جگر ہلتے ہیں
قصرِ بدعت کی بنا ہلتی ہے دَر ہلتے ہیں

ہمہمہ سُن کے دلاور کا رسالے بھاگے — بُزدلے مر گئے دہشت سے جیالے بھاگے
میسرہ ٹوٹ گیا میمنے والے بھاگے — قلب اَبتر ہُوا پہلو کو سنبھالے بھاگے
ہر طرف غل تھا اُٹھو نیند سے جاگو بھاگو
شیر ساحل کے قریب آ گئے بھاگو بھاگو

اِک جواں مرد بھی باقی تھا نہ تا حدِّ نگاہ  خوف سے قعرِ مذلت میں چھپے تھے بدخواہ
چھٹ گئے فوج کے بادل تو کھلی گھاٹ کی راہ  لے کے مشکیزے بڑھے عرشِ شجاعت کے ہما
موجیں اُچھلیں قدم آنکھوں سے لگانے کے لئے
پانی بیتاب ہوا مشک میں آنے کے لئے

وہ ترائی کی ہوا سرد وہ ہُو کا عالم  سرنگوں چار طرف فوجِ یزیدی کا حشم
متحیر تھے ستارے، متبسّم شبنم  نہر پہ گاڑ دیا شیر نے حضرت کا علَم
لبِ جُو سبز پھریرا جو وہ لہرانے لگا
قبضہ ساحل پہ بہشتی کا نظر آنے لگا

تابعِ حکمِ علمدار تھے وہ تیس (٣٠) سوار  جن کی ثابت قدمی لفظِ شجاعت کا وقار
جن کے زخموں سے کیا گلشنِ ملت نے سنگار  خون سے جن کے لکھی وقت نے تاریخِ بہار
جن کا افسانہ روایاتِ نکو کی سرخی
چہرۂ فرض پہ ہے جن کے لہو کی سرخی

یہی رُو دار تھے اُن بیدلوں کی پشت پناہ  تا لبِ آب جنہیں لائی تھی شبیر کی چاہ
مشکیں بھر بھر کے برآمد ہوئے پیاسے ذی جاہ  فکر تھی آب پہنچ جائے سوئے خیمۂ شاہ
لے کے مشکیزوں کو حلقے میں وہ جرّار بڑھے
مرحبا کہہ کے رفیقوں کو علمدار بڑھے

اُس طرف لیس کمانیں ہوئیں تیر آنے لگے  کر کے سرگوشیاں آپس میں شریر آنے لگے
پنجۂ حرص میں، ہو ہو کے اسیر آنے لگے  لے کے ساتھ اپنے شغالوں کی بھیڑ آنے لگے
کافروں نے جو اُدھر ڈھنگ جفا کے بدلے
یاں بھی تیور غضب و قہرِ خدا کے بدلے

آئی پیشانی عباس پہ غصے کی شکن　　زلف بل کھانے لگی مثلِ شہِ قلعہ شکن
کھل اٹھا چہرۂ زیبا پہ شجاعت کا چمن　　کان میں آئی یداللہ کی آوازِ بزن
جوش نے دورۂ خوں کے جو نفس تیز کیا
ہاتھ نیزے پہ گیا گھوڑے کو مہمیز کیا

ساتھ ہی سب رُفقا نے بھی سنبھالے بھالے　　یا علیؑ کہہ کے فرس فوجِ عدو پر ڈالے
سامنے آئے جو دوزخ کے بسانے والے　　ہاتھ میں دے دیئے عصیاں کے قبالے کالے
ڈانڈ پر ڈانڈ سِنانوں پہ سِنانیں کاٹیں
جو کڑکنے پہ تُلی تھیں وہ کمانیں کاٹیں

شیر نے ڈال دی جس سمت غضبناک نظر　　اُس کی تلوار گری ہاتھ سے اور اُس کی سپر
اُس نے منہ موڑ کے دیکھا جو بدل کر تیور　　وہ دیا بڑھ کے طمانچہ کہ گرا خَود اُدھر
موڑ کر اُس کی کلائی جو سناں کو چھینا
چھید دی اِس کی زرہ اُس کی کماں کو چھینا

گرم بازارِ میدانِ وغا تھی ہر سو　　شدتِ معرکہ بیم و رجا تھی ہر سو
بھیس میں نیزۂ خطّی کے قضا تھی ہر سو　　موت منہ کھول کے جویائے غذا تھی ہر سو
کس تجمل سے ولی ابنِ ولی لڑتے تھے
وہی انداز تھا جس طرح علیؑ لڑتے تھے

ضربِ عباسؑ سے سب فوج کی حالت تھی تباہ　　رن میں طوفاں تھا بپا بھاگ رہے تھے گمراہ
اِس تلاطم میں یکایک جو پھٹا ابرِ سیاہ　　شمسۂ خیمۂ سرور نظر آیا ناگاہ
تھی صدا وقت کی، ہے بارگہِ شاہ قریب
چاند کہتا تھا کہ ہے فاطمہ کا ماہ قریب

مطمئن دل سے کیا حملہ آخر ایسا اور بھی جس سے ہوئی ہمتِ باطل پسپا
منتشر ہو گیا دریا کا محافظ دستہ بچ گیا نامِ علمدار کا ہر سُو ڈنکا
دم بخود فوج ہوئی شہرِ خموشاں کی طرح
خاک اُڑنے لگی ڈیروں میں بیاباں کی طرح

کہہ کے تکبیر رفیقانِ علمدار بڑھے مالکِ عزم بڑھے، صاحبِ کردار بڑھے
سُنی بچّوں کی صدا چھیڑ کے رہوار بڑھے پاس آئے تو مؤدب ہوئی رفتار بڑھے
باادب خادمِ سُلطانِ اُمم جاتے تھے
لے کے مشکیزے سُوئے بحرِ کرم جاتے تھے

بااثر ہو کے صغیروں کی دُعائیں آئیں دوشِ انصار پہ جنت کی ہوائیں آئیں
مشک کے بھیس میں رحمت کی گھٹائیں آئیں پانی حاضر ہے! یہ سقوں کی صدائیں آئیں
آج خالی کوئی ساغر کوئی کوزا نہ رہے
مطمئن دل ہوں جو بچّہ کوئی پیاسا نہ رہے

آج کی رات تو ہے فخر و مُباہات کی رات فتحِ عباسؑ کی شب ہمتِ سادات کی رات
بدر و صفین کے دیرینہ روایات کی رات خیمۂ شاہ میں مہماں ہے خوشی رات کی رات
کل سے اِک بوند نہ پانی کی کوئی پائے گا
ماں کی آغوش میں معصوموں کو غش آئے گا

کل سے ہوگا اسی کوشش میں نبیؐ کا جانی شکن آلود نہ عباسؑ کی ہو پیشانی
کل سے آئے گا نہ پھر فوجِ خدا میں پانی اِمتحاں گاہ کی پھر ہوگی فضا طوفانی
معرکے ہوں گے اِسی تشنہ دہانی کے لئے
خون سقّے کا بہے گا اِسی پانی کے لئے

کتنا پانی تھا مری حیرتِ معصوم نہ پوچھ — کتنے سیرابی کو ترسے کئے حلقوم نہ پوچھ
کتنے انصار رہے پانی سے محروم نہ پوچھ — شدتِ تشنہ لبی اے دلِ مغموم نہ پوچھ
وقت تھا وہ شہِ والا کا چمن تھا آباد
سب غزالوں سے شہِ دیں کا ختن تھا آباد

اتنے افراد میں کیا کرتا کفالت پانی — اپنی قلت پہ تھا خود غرقِ ندامت پانی
سوکھے ہونٹوں کو ہوا پھر بھی غنیمت پانی — سب کو خیمے میں ملا حسبِ ضرورت پانی
جملہ اطفالِ شہنشاہِ مدینہ نے پیا
پی چکے اصغرِ ناداں تو سکینہ نے پیا

پیاس دن بھر کی تھی جی بھر کے نہ پایا پینے — تشنگی اور بڑھی طول جو کھینچا شب نے
ٹھنڈی سانسیں جو بھریں بنتِ شہِ یثرب نے — پھر تو خود شاہ نے عباس نے اور زینب نے
اپنے حصے کا بھی بچوں کو پلایا پانی
بعض انصار نے منہ سے نہ لگایا پانی

آٹھویں صبح سے دربار میں پانی نہ رہا — خاک اڑنے لگی سرکار میں پانی نہ رہا
حد ہوئی مرکزِ انوار میں پانی نہ رہا — خیمۂ عترتِ اطہار میں پانی نہ رہا
اس طرف سے سوئے میداں جو ہوا جانے لگی
پیاسے اطفال کے رونے کی صدا آنے لگی

نہم ماہِ محرم بھی مصیبت کی تھی رات — قہرِ ساعت فزا لاتی تھی آفت کی تھی رات
ظلمِ حاکم کا نمونہ تھی شقاوت کی تھی رات — دن اگر قربِ قیامت تھا قیامت کی تھی رات
سجدۂ حق میں وہ دن رات گزارے سب نے
خاک پہ گیسوئے احوال سنوارے سب نے

قافیہ کی بے ضابطگی کا ہمیں احساس ہے ۔

وہ شب و روز جو گزرے شبِ عاشور آئی　　اک کسک دل میں لیے خستہ و رنجور آئی
بزمِ انجم میں چمک درد کی تا دُور آئی　　داغِ مہتاب میں بھی سوزشِ ناسُور آئی
ظلم بیجا کے جو اطوار نظر آتے تھے
شش جہت غم میں گرفتار نظر آتے تھے

آگ دہکی ہوئی تھی گردِ خیامِ شہِ دیں　　چار سُو جمع تھے شب خوں کے ارادے سے لعیں
بوند پانی کی نہ موجود تھی خیموں میں کہیں　　جاں بلب پیاس سے اطفال تھے مائیں غمگیں
مضطرب تھی کوئی قاسمؑ کوئی اکبرؑ کے لیے
ایک بی بی کا عجب حال تھا اصغرؑ کے لیے

سخت تشویش کے عالم میں تھے عباسؑ حزیں　　پیشِ حضرت کبھی پہنچے کبھی زینبؑ کے قریں
نبض کو دیکھ کے عابدؑ کی دُعائیں کبھی دیں　　چُوم لی پیار سے ناشاد سکینہؑ کی جبیں
فکر زوجہ کی نہ بچوں کی جدائی کا خیال
وجہِ تشویش تھا ہر حال میں بھائی کا خیال

لشکرِ شر میں کبھی لے کے یہ پہنچے پیغام　　کہ طلبگار ہیں اک رات کی مُہلت کے امام
کیا ہو شب بھر کو اٹھا لو جو شقاوت کے یہ دام　　ہم کو اَوراد و وظائف کے علاوہ نہیں کام
دل ہوں یکسو تو عبادت کا سرانجام کریں
سجدۂ شکر پہ اس زیست کا اِتمام کریں

صاعقہ بن کے گرے آپ جو پیٹا کوئی بچہ تڑپا　　اشک بھر لائے جو پیاسا کوئی بچہ تڑپا
کسی خیمے سے اگر آ گئی رونے کی صدا　　مضطرب ہو کے چلا بازوئے شاہِ دوسرا
آ کے کلثومؑ کے خیمے میں قیامت دیکھی
ضبط مشکل تھا وہ ہمشیر کی حالت دیکھی

رُو بہ قبلہ تھیں مُصلّے پہ جنابِ کلثومؑ     رو کے کہتی تھیں کہ اے قادرِ حیّ القیوم
گِھر گئے ہیں عجب آفت میں امامِ مظلوم     مصلحت تیری کہ اولاد سے میں ہوں محروم
کیا کروں نذر کہ ہدیہ نہیں رکھتی کوئی
دل ہے مجبور کہ فدیہ نہیں رکھتی کوئی

کل بپا ہوگا یہاں معرکۂ ذبحِ عظیم     کل ثمر لائے گا گلزارِ رضا و تسلیم
کیا کہوں تجھ سے کہ تُو خود ہے بصیر اور علیم     دل مرا خنجرِ احساس سے ہوتا ہے دو نیم
جس طرف دیکھتی ہوں موت کی تیاری ہے
میرے احساس پہ یہ رات بہت بھاری ہے

صبح لُٹ جائے گا سب خاک میں آباد یہ گھر     لال مسلم کے نہ کل ہوں گے نہ زینبؑ کے پسر
ٹکڑے ہو جائے گا گلزارِ جنابِ شبّرؑ     چھد کے رہ جائے گا میدان میں اکبرؑ کا جگر
بھائی آمادہ ہیں شش ماہے کی قربانی پر
رحم کر رحم مری بے سر و سامانی پر

دلِ پُر داغ کسے جا کے دکھاؤں اپنا     تو ہی ہمدرد ہے غم تجھ کو سناؤں اپنا
کس کو قربان کروں کس کو بچاؤں اپنا     کیسے ہمچشموں میں اعزاز بڑھاؤں اپنا
دستگیری ہو پیمبرؐ کے وصی کا صدقہ
رحم کلثومؑ پہ کر اپنے نبیؐ کا صدقہ

گوشِ عباسؑ میں پہنچی جو یہ پُر درد صدا     حالِ بیتابیِ ہمشیر پہ دل بھر آیا
سر جھکا کر عجب اندازِ لجاجت سے کہا     آپ کے جذبۂ ایثار پہ عباسؑ فدا
کام آ جائے بہن کے تو جگر حاضر ہے
فدیۂ راہِ خدا کیجئے سر حاضر ہے

یہ سخن سُن کے بہن چُپ ہوئی چہرہ چمکا — غم و اندوہ کا اُمڈا ہوا دریا ٹھہرا
عجب اندازِ تشکر سے نگاہوں نے کہا — میرے صفدر یہ بہن تیری شجاعت پہ فدا
یہ دُعا ہے کہ خدا تجھ کو برومند رکھے
سایۂ حضرتِ شبیرؑ میں خورسند رکھے

یوں ہی بڑھتی رہی عباسؑ کی ذمہ داری — ہر قدم مرحلہ، ہر سانس نئی دشواری
بڑھ کے خود دل نے اُٹھائے وہ فرائض بھاری — جن کی تکمیل میں ہوں خون کی نہریں جاری
کبھی نیزوں میں کبھی تیغوں کی دھاروں میں گئے
سر ہتھیلی پہ لیے ظلم شعاروں میں گئے

بسکہ عاشور کے دن سخت تھی عباسؑ کی پیاس — پھر بھی دریا میں جو اُترے تو رہے جمع حواس
یوں بھری مشک کہ حیراں ہوئے خضرؑ و الیاسؑ — خُنکیِ آب کو آنے نہ دیا ہاتھ کے پاس
آبروئے فرض کو توقیرِ وفا کو بخشی
تپشِ نَو دلِ اربابِ ولا کو بخشی

نکلے دریا سے تو خون اپنا بہاتے نکلے — ریگِ ساحل کو لبِ خشک دکھاتے نکلے
عشق اور فرض کی تقدیر جگاتے نکلے — صبر و ایثار کی تقدیر بناتے نکلے
پیاس اِس طرح سے ٹھکرا دے بھلا پانی کو
موڑ دیتی ہے وفا فطرتِ انسانی کو

قافلہ وقت کا گو زحمتِ ہر گام میں ہے — ماندگیِ شہدا حالتِ آرام میں ہے
دردِ اِس تشنہ لبی کا دلِ ایام میں ہے — خونِ دل آج بھی پانی کے عوض جام میں ہے
بچے لیتے ہیں جو گرمی میں کبھی پیاس کا نام
لب پہ آ جاتا ہے بیساختہ عباسؑ کا نام

وہی عباسؑ وفا نہ ہے جلالت جس کی     آج بھی سینۂ باطل میں ہے ہیبت جس کی
نااُمیدی میں اک اُمید تھی ہمت جس کی     خستہ حالوں کا بھروسا تھی شجاعت جس کی
یاس زینبؑ کی سمجھتی تھی سہارا جس کو
ہر طمانچے پہ سکینہؑ نے پکارا جس کو

آپ کے عزم کو یا حضرتِ عباسؑ سلام     آپ کی سیرتِ روشن سے شجاعت خوش نام
جان دی آپ نے اے قوتِ بازوئے امام     اور جھکنے نہ دیا پرچمِ دینِ اسلام
سینۂ دہر پہ ہر نقش ہے گہرا اس کا
آپ کے خون سے رنگیں ہے پھریرا اس کا

ہے ازل سے یہی قانونِ طبیعت آقا     کہ شجاعت ہے اک ایمان کی شدت آقا
معجزہ عشق کا تھا آپ کی سیرت آقا     آج بھی عقلِ مشکک کو ہے حیرت آقا
کٹ گئے ہاتھ تو پھر زیں پہ تھمے تھے کیونکر
پاؤں حضرت کے رکابوں میں جمے تھے کیونکر

نصرتِ روحِ شریعت بخدا آپ نے کی     نہ مثال اس کی ملے گی جو وفا آپ نے کی
ہاتھ میں مشک و علم لے کے دعا آپ نے کی     سنتِ جعفرِؑ طیار ادا آپ نے کی
مفتخر آپ سے ہے اس کی روایت آقا
سربلند آج بھی ہے پرچمِ ملت آقا

یہ جو اک رابطۂ مشک و علم ہے حضرت     ایک سرمایۂ تہذیبِ اُمم ہے حضرت
آپ کے دستِ بریدہ کی قسم ہے حضرت     لکھ کے نام آپ کا سجدے میں قلم ہے حضرت
جذبۂ بندۂ موروثیِ مولا ہو قبول
اپنے اس معتقدِ ناچیز کا سجدہ ہو قبول

مرثیہ نمبر ۲

# علمدارِ کربلا

صبحِ عاشورِ محرّم جو نمودار ہوئی

در بیانِ جہاد و شہادتِ حضرتِ عبّاسؑ علمدار

بند: ۷۲

تاریخِ تصنیف: ۱۹۷۰ء

# سلام

لگا کے ٹھیس حریفوں کے آبگینوں کو
بڑا عروج دیا ہم نے اِن زمینوں کو

غبار چھُونے لگا آسماں کے زینوں کو
کہاں اُچھال دیا ہم نے اِن زمینوں کو

بَنا کے چھوڑ گئے ہیں جو شہ نشینوں کو
پُکارتے ہیں در و بام اُن مکینوں کو

چڑھا کے آئے تھے ہم پہ جو آستینوں کو
وہ آج پوچھ رہے ہیں کھڑے جبینوں کو

غرورِ فن کے سبب جن کے خط نہ مٹتے تھے
ہماری تیغ نے کاٹا ہے اُن جبینوں کو

فلک نے دیکھ کے گلہائے کربلا یہ کہا
کہاں بسا گئے شبیرؑ اِن حسینوں کو

جبینیں خاکِ شفا سے دمک کے کہتی ہیں
سلام اَرضِ مقدس ترے مکینوں کو

حسینؑ آج نہیں ہیں مگر وہ راہ تو ہے
پکارتی ہے جواب تک مآل بینوں کو

بہارِ غم ہے محرم سے صرف تا بصفر
خدا دراز کرے اور اِن مہینوں کو

زمانہ اُن کو سمجھ لے اگر تو جنگ نہ ہو
رواج دے گئے شبیرؑ جن قرینوں کو

شہید ہوتے رہے اقربا مگر شبیرؑ
نگاہِ عفو سے دیکھا کئے لعینوں کو

کہاں دیارِ نجوم اور کہاں درِ حکام
گراں ہی ہے ضرورت بلند بینوں کو

اِسی کا نام ہے طوفانِ زندگی صفدر
ہوا کہاں سے کہاں لائی ہے سفینوں کو

بسم اللہ الرحمن الرحیم

صبحِ عاشورِ محرم جو نمودار ہوئی — بزمِ فطرت کی فضا مطلعِ انوار ہوئی
ہر کلی حمدِ خدا میں لبِ اظہار ہوئی — نکہتِ لالہ و گل خواب سے بیدار ہوئی
بوئے دوشیزۂ نسرین و سمن آنے لگی
سہمی سہمی ہوئی حجرے سے دلہن آنے لگی

چونک اٹھا سبزۂ خوابیدہ، بجا سازِ چمن — زمزمے کرنے لگے زمزمہ پردازِ چمن
رقص میں آئی جو رقاصۂ طنازِ چمن — مشتہر ہونے لگا چار طرف رازِ چمن
کھلے عقدے جو بہ یک نازِ تبسم گل کے
اور شاداب ہوئے زخم جگرِ بلبل کے

علی اکبرؑ کی اذاں تھی مترنم اعجاز — بن گیا عالمِ خاموش جہانِ تگ و تاز
ہو گیا گنگ خموشی کا بھی بجتا ہوا ساز — ہو گئی بند فرشتوں کے پروں کی آواز
عالمِ کیف میں حوروں کی جبینیں خم تھیں
جھلملاتے ہوئے تاروں کی بھی آنکھیں نم تھیں

بہرِ سجدہ خطِ ابیض کی جو تنویر بڑھی — بن گیا آئینۂ خلد گلستانِ نبیؐ
لائے تشریف مصلے پہ حسینؑ ابنِ علیؑ — صف بہ صف تھے رفقا بہرِ نمازِ سحری
نیتیں بندھتے ہی فردوس کے در کھلنے لگے
عملِ خیر کی میزان میں دل تلنے لگے

کیا جماعت تھی کہ مسجودِ ملک جس کا امام  جُنبشِ کلکِ قضا جس کے اشاروں کی غلام
آسمانوں کی بلندی جسے کرتی ہے سلام  عرش بھی فرش بچھائے جو کرے وہ اِقدام
روک دے پاؤں تو رفتارِ زمانہ رُک جائے
آنکھ اُٹھائے تو فرشتوں کی جماعت جھک جائے

وہ مصلّی کہ جو عُشّاقِ خدائے ذوالمنن  رہبرِ راہِ وفا سالکِ تقدیرِ زمن
منہ پہ کِھلتا ہوا آیاتِ الٰہی کا چمن  نیّتیں مرضیِ معبود سے باندھے دامن
عزم بالیدہ ہوئے وادیِ جنّت پاکر
عَلَمِ حق کے پھریرے کی ہوا کھا کھا کر

لب پہ ہر دم یہ مناجات کہ ربِّ اکبر!  تبر و تیر کی بارش میں بھی جھپکے نہ نظر
غم نہیں اِس کا جو کٹتے ہیں تو کٹ جائیں یہ سر  ہو سرافراز مگر اُسوۂ تطہیرِ بشر
تیرے احکام کی تعمیل میں مارے جائیں
خون میں ڈوب کے کوثر کے کنارے جائیں

الغرض یوں نہ بچھی تھی کہ ہوئی ختم نماز  جو سرافگندہ تھے سجدوں میں اُٹھے سرافراز
ناگہاں آنے لگی طبلِ وغا کی آواز  مُتبسّم ہوئے لبہائے شہنشاہِ حجاز
عکسِ انجام بہ آئینۂ حال آنے لگا
رکھی تسبیح تو چہرے پہ جلال آنے لگا

سُن کے آوازِ دُہل شہ کے نمکخوار اُٹھے  یا علیؑ کہہ کے مصلّوں سے وہ دیندار اُٹھے
مُسکراتے ہوئے تنتے ہوئے جرّار اُٹھے  جاگ اُٹھی روحِ شجاعت جو علمدار اُٹھے
وہ علمدار کہ تھا ناشرِ فرمانِ حسینؑ
حاملِ رایتِ حق مشعلِ دیں شانِ حسینؑ

جس کو اللہ نے بخشا عَلَمِ نُور فشاں — وہ عَلَم جس کی زیارت شرفِ کون و مکاں
جس کے دامن کو اُٹھائے ہوئے حُورانِ جناں — جس کے سائے میں ہوا خیر سے اسلام جواں
یہ وہ منصب تھا جو بخشا گیا جرّاروں کو
کربلا تک جو ملا چار علمداروں کو

حمزہؑ و جعفرؑ و حیدرؑ کا یہ اعزازِ جلیل — آج عبّاسؑ دلاور کے ہے زیرِ تحویل
جو دمِ معرکہ ہے شیرِ خدا کی تمثیل — دیکھ کر جس کو سمیٹے ہیں پروں کو جبریلؑ
اِمتحاں گاہِ وفا میں جو نمودار ہُوا
وارثِ حوصلۂ جعفرِ طیّار ہُوا

اَبروئے عزم پہ صفّین سے بَل تھا موجود — جس کو دُنیا کے رویّے نے کیا اور افزود
کربلا میں ہوا جس دن سے ورودِ مسعود — بن گئے پیکرِ آیاتِ جلالِ معبُود
شکنِ غیرتِ ابروئے شجاعت نہ گئی
کٹ گئے ہاتھ مگر رُخ کی جلالت نہ گئی

لبِ حضرت سے مشیّت کا اشارہ جو ہوا — جاں نثاروں کو یہ لائے سرِ میدانِ وَغا
صفیں آ آ کے جمانے لگے رَن میں رُفقا — دامنِ رایتِ اسلام سروں پر پھیلا
شاخِ طُوبیٰ کو بھی حال آگیا لہرانے لگی
عَلَمِ سبز سے جنّت کی ہَوا آنے لگی

قبل اِس کے کہ جمے معرکۂ تیر و تبَر — چڑھ کے ناقے پہ اِمامِ دو جہاں فخرِ بشر
چاہتے تھے کہ کہیں کلمۂ اخلاص مگر — شور باجوں کو فزوں کرنے لگے بانیٔ شر
ایسے ماحول میں مشکل تھا نصیحت کرنا
کارِ دشوار تھا اعلانِ حقیقت کرنا

صلحِ انصاف کا پھر بھی دیا حضرت نے پیام — لبِ حق گو سے گہر ریز ہوا حسنِ کلام
اپنے الفاظ کا جب دیکھ لیا خود انجام — کر کے فرض اپنا ادا ہو گئے خاموش امام
تیغیں تولے ہوئے نزدیک شریر آنے لگے
ابھی ناقے سے نہ اترے تھے کہ تیر آنے لگے

مختصر یہ ہے کہ رحمت ہوئی مائل بہ غضب — یعنی حضرت کے رفیقوں نے کیا اذن طلب
رخصتِ جنگ ملی، پیر و جواں سب کے سب — سبقتِ مرگ میں کوشاں ہوئے تا حدِ ادب
طفلِ نوخیز بھی غازی ہوئے جرار ہوئے
رہِ معبود میں سر دے کے سُبکبار ہوئے

فرض اپنا جو ادا کر چکے وہ فرض شناس — دھوپ ڈھلنے لگی، چہرہ ہوا سورج کا اُداس
راس و چپ کوئی بھی باقی نہ رہا شاہ کے پاس — بس اُدھر تھے علی اکبرؑ تو اِدھر تھے عباسؑ
عازمِ سیرِ گلستانِ جناں تھے دونوں
چشمِ حسرت سے سوئے شہ نگراں تھے دونوں

ایک تھا نورِ نظر، دوسرا تھا قوتِ جاں — ایک ہمشکلِ نبیؐ دوسرا حیدرؑ کا نشاں
ایک سے تابِ جگر، دوسرے سے دل کی تواں — یہ امانت تھی پدر کی، وہ بہن کا ارماں
مرحلہ سخت ہے کیونکر انھیں رخصت دے دیں
کس کو روکیں کسے مرنے کی اجازت دے دیں

حکمِ تقدیر سے یوں ہو گیا یہ مرحلہ حل — یعنی تھی پیاس کی شدت سے سکینہ بیکل
غش اُسے آ گیا ناگاہ مچی اک ہلچل — ساتھ ہی رن میں گرجنے لگے شامی بادل
دل بہادر کا بصد شدتِ احساس جھکا
پائے فرزندِ نبیؐ پر سرِ عباسؑ جھکا

جوڑ کر ہاتھ یہ کی عرض کہ یا شاہِ انام    پیاس سے مضطرب الحال ہیں اطفال تمام
میرا منہ تکتے ہیں ہاتھوں میں لیے خالی جام    کب تک اِن پیاسوں کی فریاد سُنے جائے غلام
پار گرداب بلا سے مری کشتی ہو جائے
دیں اجازت تو علمدار بہشتی ہو جائے

وعدہ کرتا ہوں کہ غُصّے میں نہیں آؤں گا    حلقۂ صبر سے باہر نہ کبھی جاؤں گا
مشک اِک نہر سے بھرنی ہے سو بھر لاؤں گا    تیغ کو تیغ پہ روکوں گا سناں کھاؤں گا
قول مجھ سے یہ شہنشاہِ اُمم لے لیجے
حشر برپا نہ کروں گا یہ قسم لے لیجے

جب یقیں ہو گیا، حد سے نہ بڑھے گا جرّار    بے تحاشا نہ کبھی ہو گی جری کی تلوار
پھر تو باقی نہ رہی کوئی بھی جائے انکار    مشک بھرنے کے لئے دے دیا اِذنِ پیکار
ہو کے رُخصت حرمِ پاک سے جرّار چلا
دوش پہ مشک و عَلَم لے کے علمدار چلا

منتظر تھا درِ خیمہ پہ جو غازی کا سمند    اُفقِ زیں پہ ہوا نیّرِ اقبال بلند
تابشِ رُخ سے چمکنے لگے ذرّوں کے سپند    ڈال دی جلوۂ رُخسار نے سورج پہ کمند
عکس نے خاک کو آئینۂ تنویر کیا
شوق نے فاصلۂ راہ کو تسخیر کیا

آنکھ جھپکی تھی کہ تھے سامنے فوجوں کے حضور    مچ گئی لشکرِ کفّار میں ہلچل تا دُور
برقِ شمشیر چمک کر ہوئی مائل بہ ظہور    لب مجاہد کے رجز خواں ہوئے حسبِ دستور
رن میں تھے نعرہ زناں مُنکرِ پیغامِ حسینؑ
چُپ ہوئے سب، جو گرجنے لگا ضرغامِ حسینؑ

ذکرِ غزوات تھا اشعارِ رجز میں یکسر
غزوۂ بدر و اُحد، فتحِ حُنین و خیبر
اُن محارب کا بیاں دھاک ہے جن کی سب پر
معرکے جن میں کھُلے تیغِ علیؑ کے جوہر
جوششِ طبع میں صِفّین و جَمَل کی باتیں
عرصۂ فرض کی، میدانِ عمل کی باتیں

اِس کا اعلان کہ ہے مشکِ سکینہ ہمراہ
شیر دریا کی طرف جائے گا حسبِ دلخواہ
راستہ روکنا ہو جن کو بڑھیں وہ واللہ
ابنِ حیدرؑ ہوں مجھے ٹوک کے دیکھے تو سپاہ
آستیں اُلٹوں تو لشکر تہ و بالا کر دوں
ریگِ ساحل کو ابھی خون کا دریا کر دوں

گلفشاں تھے لبِ ناطق کہ ہوئی بارشِ تیر
میان سے ابنِ یداللہ نے کھینچی شمشیر
شوکت و شان میں تھے آپ جو حیدر کی نظیر
پشتِ رہوار پہ تاباں تھی علیؑ کی تصویر
سایہ افگن تھا عَلَم بالِ ہُما کی صورت
برق اک ہاتھ میں تھی قہرِ خدا کی صورت

تھا جو نیت میں کہ پیاسوں کے لئے لائیں گے آب
ڈھل گیا تھا عملِ خیر میں سب زورِ شباب
ہر قدم، دشت میں تھی زیرِ قدم راہِ صواب
عرقِ جسمِ مُطہرؔ تھا کہ رحمت کا سحاب
عَلَم و مَشک جو والفتح کی تحریر بنے
جوہرِ تیغ اَنا لبرق کی تفسیر بنے

جس کو پایا نہ رہِ راست پہ مائل کاٹا
جس کو دیکھا عملِ خیر میں حائل کاٹا
جس کا دل کُفر پرستی کا تھا قائل کاٹا
سامنے آگیا جو شِمر شمائل کاٹا
چونکہ غازی تھا خفا گھاٹ کے رکھوالوں سے
بے حیا مُنہ کو چھپائے ہوئے تھے ڈھالوں سے

بسکہ تھی موت کی مُٹھی میں عنانِ لشکر
تھیں وہ قرنا کی صدائیں کہ فغانِ لشکر
اِک سمندر کا تلاطم تھا میانِ لشکر
مُنہ چھپائے ہوئے پھرتے تھے یلانِ لشکر
خوف سے شمر و عمر جان چُرائے ہوئے تھے
خود کو انبوہ میں فوجوں کے چھپائے ہوئے تھے

مُتزلزل تھی عناصر کی بِنا چار طرف
آگ اور خون کا طوفاں تھا بپا چار طرف
لشکرِ ظلم کی اُکھڑی تھی ہوا چار طرف
آبِ شمشیر تھا سیلابِ فنا چار طرف
دست و پا بکھرے تھے ٹوٹے ہوئے نیزوں کی طرح
بیرقیں ڈھیر تھیں اُکھڑے ہوئے خیموں کی طرح

قہرِ معبود تھا یا ضرب تھی اُس غازی کی
رُخ جدھر ہو گیا فولاد کی دیوار گری
موجزن دشت میں تھی خون کی ہر سو ندی
لاشیں یوں بہتی تھیں ٹوٹی ہوئی جیسے کشتی
راستے بند تھے کُشتوں سے ستمگاروں کے
پہلے حملے ہی میں مُنہ پھر گئے تلواروں کے

تھا جلالِ اسد اللہ بہ اجلالِ خُدا
راہِ حق پیشِ نظر، دوش پہ اقبالِ خُدا
فرق پر ظلِّ خُدا، پشت پہ افضالِ خدا
خشک ہونٹوں سے گہر بارِ اقوالِ خُدا
تیغ قبضے میں کہ اِک پیکرِ ضَو ہاتھ میں ہے
رُخ ہے خورشیدِ مُبیں اور مہِ نَو ہاتھ میں ہے

تھا جو برہم سرِ میدان، پسرِ شیرِ اللہ
بھاگنے کی بھی بھگوڑوں کو نہ ملتی تھی راہ
غیظ میں ڈوبی ہوئی تھی جو دلاور کی نگاہ
قعرِ دوزخ میں اماں ڈھونڈھ رہے تھے بدخواہ
خیر مقدم کی اُدھر سے جو صدا آتی تھی
پاؤں پکڑے تھی زمیں روح کھنچی جاتی تھی

دلِ غازی میں تھی بچپن سے شجاعت کی اُمنگ    گھر کے ماحول نے سکھلائے تھے پیکار کے ڈھنگ
عمر کے ساتھ ہوا شوخ جلالت کا رنگ    آج بھرپور جوانی میں یہ تھی پہلی جنگ
کیا تعجب کہ ٹک جھک کے زمیں تھامے ہوں
ہاتھ عباسؑ کا جبرئیلِ امیں تھامے ہوں

معجزہ دشت میں دکھلاتے تھے دست و بازو    مرغِ مذبوح کے مانند تڑپتے تھے عدو
آبِ شمشیر میں تھے غرق عدو تا بہ گلو    سُرخ تھی رن کی زمیں موت چھڑکتی تھی لہو
گردنیں کٹ کے بھی فوّارہ صفت خاک پہ تھیں
خونِ ناپاک کی چھینٹیں خس و خاشاک پہ تھیں

سرکشیدہ تھے جو اشجارِ تعدّی و گناہ    برقِ شمشیر سے جلنے لگے مانندِ گیاہ
تھے کھڑے کوہِ گراں بن کے جو گُردانِ سیاہ    ہوئے ثابت وہ دمِ جنگ غبارِ سرِ راہ
خاک اُڑنے لگی لشکر میں ستمگاروں کے
ہر طرف ڈھیر تھے ٹوٹے ہوئے ہتھیاروں کے

یونہی لڑتے گئے، بڑھتے گئے، دریا کی طرف    جزر و مد فوج میں تھا، زیر و زبر تھی ہر صف
نامور جو تھے اُنھیں کو کیا صفدر نے ہدف    ہر پرا توڑ دیا مثلِ شہنشاہِ نجف
یوں چلی تیغ کہ ایوانِ دغل بیٹھ گیا
جنبشِ باد سے بالو کا محل بیٹھ گیا

تیغِ غازی کی لپک حشر کی انگڑائی تھی    جس کے پرتو سے ہوا دشت کی بولائی تھی
یوں کئی بار زمیں خوف سے تھرّائی تھی    آگئی یاد جو حضرت سے قسم کھائی تھی
زلزلہ تھم گیا، گھوڑے نے قدم گاڑ دیا
جب اُلٹنے لگی گیتی تو علَم گاڑ دیا

گھاٹ پر شور تھا بھاگو کہ دلیر آپہنچا     وہ چمکتا ہے عَلَم اب نہیں دیر آپہنچا
باگیں پھیرو کہ نہیں راہ کا پھیر آپہنچا     فرسِ تیز جری صورتِ شیر آپہنچا
اُس کی ٹاپوں کی دھمک لے کے ہوا آتی ہے
دلِ گیتی کے دھڑکنے کی صدا آتی ہے

جھومتا اَبرِ شجاعت کا بڑھا سوئے فرات     چھُٹ گئی نبضِ سوارانِ خفیف الحرکات
رُخِ غازی سے عیاں فتح کے روشن آیات     ہو گئی بند شریروں کے لئے راہِ نجات
شرم کے بحر میں اربابِ فتن ڈوب گئے
دل جو دھڑکے تو پسینے میں بدن ڈوب گئے

گھاٹ کو چھوڑ کے جب بھاگ گیا لشکرِ کیں     پسرِ شیرِ خدا پہنچا ترائی کے قریں
رُعبِ صفدر سے لرزنے لگی ساحل کی زمیں     موجیں شاداں ہوئیں، مضطر ہوئیں، بیتاب ہوئیں
پائے شبدیز پہ سر اپنا جھکانے کے لیے
مشکِ معصومۂ شبیرؑ میں آنے کے لیے

ساحلِ نہر پہ لہرانے لگا سبز عَلَم     آنکھ خورشید کی جھپکاتا تھا جس کا چَم و خَم
دامنِ عترتِ اطہار تھا جس کا پرچم     جس کے سائے میں بڑھی حرمتِ محرابِ حرم
سر اُٹھائے ہوئے کہتا تھا پیمبرؐ کا نشاں
میں ہوا آج سے عباسؑ دلاور کا نشاں

الغرض مَشک بھری اور ہوئے خیمے کو رواں     دوشِ غازی پہ دُرَخشاں تھا جلالت کا نشاں
داہنے ہاتھ میں تاباں تھی حسامِ بُرّاں     دستِ چپ میں عَلَمِ فوجِ امامِ دو جہاں
سبھی دنیا میں فقط تیغِ دُودم لے کے لڑے
صرف عباسؑ تھے جو مشک و عَلَم لے کے لڑے

ایسے غازی کے بھلا کون مقابل ہوتا — کون اُس تیغ کا پھل قلب میں اپنے بوتا
چند سکّوں کے عوض جان کو اپنی کھوتا — اپنے ملبوس کو خود اپنے لہو سے دھوتا

بزدلی نے یہ کہا ننگ گوارا کرلو
جان پیاری ہے تو دریا سے کنارا کرلو

پھر بھی تاریخ یہ کہتی ہے کہ غیرت آئی — ایسی غیرت جو بھگوڑوں کو پھرا کر لائی
ایک تاریک گھٹا ظلم کی ہر سُو چھائی — حملۂ غیر منظّم نے قیامت ڈھائی

بازوئے شاہ کا پھر بھی نہ قدم رُکتا تھا
گھوڑا رُکتا تھا نہ تلوار کا دم رُکتا تھا

تھی یہ کوشش کہ پہنچ جائے کسی طرح یہ آب — اُس جگہ تک کہ ہیں جہاں پیاس سے بچّے بیتاب
آپ سرگرمِ عمل، لب پہ کچھ اشعارِ خطاب — لوحِ محفوظ میں روشن ہیں یہ الفاظ جناب

شہدا زندۂ جاوید ہوئے ہیں مر کے
کیا بگاڑے گی مرا موت تعاقب کر کے

برملا کہتا ہوں، جب تک ہے مرے دم میں دم — سر پہ تابندہ رہے گا یہی رایت بچشم
جانِ عباسؑ سے وابستہ ہے یہ حق کا عَلَم — سر بھی کٹ جائے تو ہرگز نہ جھکے گا پرچم

غم نہیں راہ میں گو سنگِ گراں باقی ہے
مشک لے جاؤں گا گر جسم میں جاں باقی ہے

مجھ کو ٹوکو گے تو شیرِ صفِ ہیجا ہوں میں — ورنہ کچھ بھی نہیں اک بندۂ مولا ہوں میں
اس لڑائی میں سپاہی نہیں سقا ہوں میں — دیکھو ہاتھوں میں لیے امن کا جھنڈا ہوں میں

جب بھی یہ معرکۂ رزم میں لہرائے گا
اس کے سائے میں جو آئے گا اماں پائے گا

ہم کہ اخلاقِ پیمبرؐ نے سنوارا ہم کو ڈھونڈتا پھرتا ہے طوفاں میں کنارا ہم کو
خضرِ منزل رہا فطرت کا اشارا ہم کو جب بھی ایمان کی غیرت نے پکارا ہم کو

حق و باطل کا ہر اک معرکہ سَر کرکے پھرے
قلعۂ کفر کو ہم زیر و زبر کرکے پھرے

چھپ کے بیٹھا ہے کہاں، شمرِ ستمگر سے کہو مجھ کو دیتا تھا اماں جو اُسی خود سَر سے کہو
حرملہ سے کہو، خولیِ بداختر سے کہو پسرِ سعد سے، سرِ دفترِ ابتر سے کہو

سامنے آئیں اور ایمان کی قوت دیکھیں
تشنہ لب خادمِ شبیرؑ کی ہمت دیکھیں

مختصر یہ کہ علمدار بڑھا سوئے خیام چھوڑ دی گردنِ رہوار پہ غازی نے لگام
ڈھال کی اوٹ میں تھی مشک، برہنہ تھی حسام سدِرہ جو ہوا آکر، ہوا کام اُس کا تمام

پانی پانی کیا فولاد کی دیواروں کو
عرقِ شرم نے چھینٹے دیئے سرداروں کو

ایک انبوہِ گراں، دیکھیں یہ کِس کِس پہ نظر بھیڑ ہی بھیڑ ہے ہر سمت کریں وار کدھر
کاٹیں تیغوں کی زباں، تیروں کے پَر گُرزوں کے سَر پُوریاں نیزوں کی توڑیں کہ کمانوں کی کمر

موجزن قلب میں تھا جذبۂ اسلام بہت
صرف دو ہاتھ تھے اور پیشِ نظر کام بہت

خوفِ تعزیر سے سب لیس ہوئے تھے اشرار ایک طوفان تھا جس کی کوئی حد تھی نہ شمار
روسیاہوں کا تھا انبوہ یمیں اور یسار چھپ کے نوفل نے کیا پشتِ مبارک پہ وار

داہنا ہاتھ جو شانے سے قلم ہو کے گرا
رُوحِ زہراؑ کے لئے کوہِ الم ہو کے گرا

اِس ستم پر بھی دلاور نے نہ پہلو بدلا     وہی انداز رہا اور وہی جوشِ وغا
ملعون تھے کہ کمیں گاہ سے پھر وار ہوا     دوسرا ظلم بنِ ورقہٗ جہنمی نے کیا
دستِ چپ خاک پہ تھا اب کے نشانہ بن کر
موت پاس آ گئی ضربت کا بہانہ بن کر

دانت سے مشک کو پکڑے رہا پھر بھی جرّار     وہی جرأت، وہی ہمت، وہی شیرانہ وقار
ناگہاں پشت سے سر پر ہوا اک گرز کا وار     آنکھ میں تیر لگا، گرنے لگا سینہ فگار
دی صدا یا شہِ دیں! خلد کے عازم کا سلام
لیجیے مخدومِ جہاں، آخری، خادم کا سلام

گوشِ مظلوم میں پہنچی جو صدائے ضرغام     تھام کر دل علی اکبرؑ کو پکارے یہ امام
لو علمدار ہوا ختم، ہوئی جنگ تمام     حادثہ وہ تھا کہ برہم تھا عناصر کا نظام
پھر بھی آنکھوں نے نہ گریہ صفتِ ابر کیا
فاتحِ جوشِ عناصر نے بڑا صبر کیا

ہاں کمر جھک گئی، چل پائے نہ حسبِ معمول     باپ کو تھامے ہوئے ساتھ تھے ہمشکلِ رسولؐ
صدمہ و ضعف سے بڑھتا ہی گیا راہ کا طول     پہنچے بھائی کے سرہانے جو دلِ افگار و ملول
گو کہ اک تیر سے زخمی تھی علمدار کی آنکھ
نورِ دیدار سے روشن ہوئی جرّار کی آنکھ

مسکرا کر یہ کہا آپ کے صدقے میں، امام!     اب پیمبرؐ کی زیارت سے مشرف ہے غلام
مجھ سے کہتے ہیں یہ بابا کہ کرو ان کو سلام     ہیں یہ مخدومِ جہاں، ختمِ رسل، فخرِ انام
میں نے اکبرؑ کی شباہت ہی سے پہچانا ہے
رخ کی تقدیس و جلالت ہی سے پہچانا ہے

ایک بی بی بھی سرہانے ہیں مرے گریہ کناں — رُوئے انور کی تجلّی سے یہ ہوتا ہے عیاں
یہی مخدومۂ دیں ہیں، یہی خاتونِ جناں — مجھ سے فرماتی ہیں بیٹے مرے میں موں تری ماں
ہو نہ مغموم، مری گود میں لیٹا ہے تُو
میرے عباسؑ مرا تیسرا بیٹا ہے تُو

اپنے محسن کے عوض میں نے تجھے پایا ہے — یہ مرا خوں ہے، پسینہ جو تجھے آیا ہے
دھوپ ہے تیز تو چادر کا مری سایا ہے — سو مرے لال! سرہانے یہ تری دایا ہے
سُن کے یہ نیند چلی آتی ہے اب تو مَولا
یہ عبا اپنی اُڑھا دیجیے مجھ کو مَولا

لہلہاتے ہیں شجر جنتِ رضواں کے تمام — شاخیں یوں خم ہیں کہ جیسے کوئی کرتا ہے سلام
پیشوائی کو مری آپ کے سارے خُدّام — ہیں درِ خُلد پہ ہاتھوں پہ لئے شہد کے جام
بوشمامہ بھی ہیں اور جَون بھی حاضر مَولا
یہ بنِ قین ہیں یہ ابنِ مظاہر مَولا

لیجیے[1] بڑھتے ہیں یٰسین حسنؑ سبز قبا — اپنے دامن کی ہَوا دیتے ہیں محبوبِ خدا
جام کوثر کا بڑھاتے ہیں شہِ عُقدہ کُشا — عرض کرتا ہے یہ خادم کہ نہیں اے بابا!
ہے ابھی آلِ شہنشاہِ مدینہ پیاسی
پانی کیا مُنہ سے لگاؤں ہے سکینہ پیاسی

بولے منہ چوم کے حضرت[2] کہ میں قربان عباسؑ — نزع میں بھی ہے سکینہ کا تمہیں دھیان عباسؑ
خیمے تاراج ہوں اس کا بھی ہے امکان عباسؑ — گھر میں جب آگ لگائیں گے مسلمان عباسؑ
تو اُسے آگ کے شعلوں سے نکالے گا کون؟
تم نہ ہو گے تو یتیموں کو سنبھالے گا کون؟

[1] متبادل مصرع: لیجیے بڑھتی ہیں یٰسین جنابِ زہرؑا — [2] متبادل ردیف: اخی

گھر کے سورج تھے تمہیں، دھوپ کہاں سے آئے؟ — اک اندھیرے کی خبر دیتے ہیں ڈھلتے سائے
کیوں نہ تقدیر کی آنکھوں میں اب آنسو آئے — اب یہ ممکن ہے کہ زینبؑ کی ردا چھن جائے
ناخنِ سعی پئے عقدہ کشائی نہ رہا
جو بھی ہو ظلم کہ عباسؑ سا بھائی نہ رہا

تم سکینہؑ کے ہے تمہاری عباسؑ — ہو گی بے آس کوئی دم میں وہ پیاری عباسؑ
آہ جب ہوگا لہو کان سے جاری عباسؑ — گھر میں گھس آئیں جس وقت یہ ناری عباسؑ
ڈھونڈتی تم کو وہ دریا کی طرف آئے گی
ہوگا مقتل میں اندھیرا تو کدھر جائے گی

گفتگو یہ تھی کہ ظاہر ہوئے آثارِ وفات — عَرَقِ مرگ کے پیشانی پہ جھلکے قطرات
رُک گئی آنکھ سوئے شاہِ رفیع الدرجات — سانس اُکھڑنے لگا، کٹنے لگی زنجیرِ حیات
قہر برپا کیا جب موت کی انگڑائی نے
بھائی کی گود میں دم توڑ دیا بھائی نے

مَوت جس طرح سے قسمت میں ہوئی تھی مرقوم — اُسی انداز سے عباسؑ نے پایا مقسُوم
خلق کو اس اَلمیّے سے ہوا یہ معلوم — یہ ہے دل والوں میں "آئینِ وفا" کا مفہوم
دیکھ لیں جادۂ معبُود پہ جانے والے
جان یوں دیتے ہیں احمدؐ کے گھرانے والے

مرحبا! قوتِ بازوئے حسینؑ ابنِ علیؑ — مُدتوں رسمِ وفا آپ کے سائے میں پَلی
روحِ عرفان و عمل آپ کے پیکر میں ڈھلی — آپ کے وصف میں ملتی ہیں احادیثِ جَلی
قولِ اَئمّہ کے سَنَد آپ کی عظمت کے لئے
نو امام آئے ہیں تُربت کی زیارت کے لئے

مَشک پیاسوں کی بھری، بھول گئے اپنی پیاس    آپ ہیں زورِ علیؑ، حِلمِ حسنؑ کے عکاس
تلخیٔ صبر میں ہے آپ کی جرأت سے مٹھاس    آپ مظلوم کی ڈھارس، حرمِ پاک کی آس
حق ادا کر کے شہِ پاک کی غمخواری کا
کر گئے خاتمہ بالخیر علمداری کا

آپ کے نام سے ملّت کا ستارہ روشن    آپ کے ذکر سے شاداب شجاعت کا چمن
آپ کی مَشک سے سرسبز عمل کے گلشن    سایۂ رحمتِ معبود علم کا دامن
دمِ عیسیٰ ہے ہَوا اِس کی پئے دینِ وفا
اِس کے پرچم سے سرافراز ہے آئینِ وفا

مرثیہ ختم ہے اَب میری دُعا بھی سُنیے    گریہ و زاریِ اربابِ وِلا بھی سُنیے
حضرتِ فاطمہ زہراؑ کی بُکا بھی سُنیے    جانِ حیدرؑ! دلِ صفدر کی صدا بھی سُنیے
یہ تمنّا ہے کہ پھر وعدہ یہ وفا ہو جائے
اِک جھلک آپ کے جذبے کی عطا ہو جائے

# قطعہ

مری نظر میں ہے تصویرِ شوکتِ اَسلاف
دیا تھا جن کی بَسالت نے آسماں میں شگاف
بِچھرادوں چہرۂ تقدیر اک طمانچے سے
مزاج اُس کا اگر میرے عزم کے ہو خلاف

مرثیہ نمبر ۳

# جلوۂ تہذیب

جلوہ افگن ہے زمانے میں ضیائے تہذیب

دربیانِ سیرتِ شہزادہ علی اکبرؑ

بند : ۹۷

تاریخِ تصنیف — اپریل ۱۹۶۵ء

# سلام

برستے ہیں ترے مشہد پہ سجدے بے حساب اب تک
جبیں رکھے ہوئے ہے آستاں پہ آفتاب اب تک

گرفتِ ذہن سے بالا ہے اکبرؑ کا شباب اب تک
زلیخا آرزوئے دید میں ہے محوِ خواب اب تک

ہنوز ان کی فضا میں ہے صدائے العطش گونجی
کہ موجیں علقمہ کی کھا رہی پیچ و تاب اب تک

حسینؑ ابنِ علیؑ چن چن کے لائے تھے شجاع ایسے
مورخ دے رہا ہے دادِ حسنِ انتخاب اب تک

فلک پر لہلہاتی ہے شفق خونِ شہیداں کی
اُسے خونِ جگر سے سینچتا ہے آفتاب اب تک

ابھی تک ضربِ حیدرؑ کی دھمک سینے میں اُس کے
پکار اُٹھتی ہے خیبر کی زمیں یا بوتراب اب تک

ہے اب بھی ذرہ ذرہ مضطرب گنجِ شہید ان کا
محبت دے رہی ہے استغاثے کا جواب اب تک

علیؑ مرتضیٰ کا حکمِ رجعت یاد ہے اس کو
گزرتا ہے نجف سے تھرتھراتا آفتاب اب تک

جلوسِ تعزیت میں ہیبتِ عباسؑ کہتی ہے
علمدارِ حسینی چل رہا ہے ہمرکاب اب تک

زمانہ کر رہا ہے شرح پیغامِ حسینی کی
خلا میں گونجتے ہیں نعرہ ہائے انقلاب اب تک

مرض اُمت کا مہلک ہے مگر صحت کا امکاں ہے
لہو اپنا دیئے جاتا ہے اکبرؑ کا شباب اب تک

ہمارے اشک خوشبوئے عقیدت لے کے آتے ہیں
چھڑکتے ہیں سرِ خاکِ شہیداں ہم گلاب اب تک

یہ تاثیرِ سخن فیضِ غمِ سرور نے بخشی ہے
کہ مقصدؔ کی ہر اک مجلس رہی ہے لاجواب اب تک

۱۰ سن ذی الحجہ ۱۳۸۴ھ

۱۳ اپریل ۱۹۶۵ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جلوہ افگن ہے زمانے میں ضیائے تہذیب          چہرۂ دہر کی زینت ہے صفائے تہذیب
نسلِ انساں کی ضمانت ہے بقائے تہذیب          حرفِ کُن پہلے ہوا پردہ کشائے تہذیب

لبِ قدرت جو ہلے کون و مکاں خلق ہوئے
بدلی کروٹ جو زمیں نے تو زماں خلق ہوئے

قلبِ فطرت میں خودی جب خلش انگیز ہوئی          یعنی شمعِ دلِ آدمؑ کی جو لو تیز ہوئی
سینہ ظلمت کا پھٹا صبح جنوں خیز ہوئی          زندگی ابلقِ ایام کو مہمیز ہوئی

کھا کے ٹھوکر قدمِ عزم کی جاتے جاگے
سینۂ دہر میں خوابیدہ ارادے جاگے

شوق کی آنکھ کھلی بیچ کا پردا سرکا          دیکھ کر آئینۂ وقت میں اپنا چہرہ
لبِ قدرت پہ ہوا ایک تبسم پیدا          اُس تبسم کے جو عقدوں کو نظر نے کھولا

حُسن از پردہ بر آمد بہ تجلی دم زد
عشق پیدا شُد و آتش بہ ہمہ عالم زد

ہے یہی حسن کا ادراک بنائے تہذیب          یہی احساس ہوا جلوہ نمائے تہذیب
یہی تزکیۂ باطن ہے صفائے تہذیب          تشنگی کا یہی جذبہ ہے غذائے تہذیب

یہی تطہیر ہے مقدر یہی تنویر بھی ہے
یہی انسان کے ہر خواب کی تعبیر بھی ہے

یہی اِدراک بنا آدمیت کا جوہر  اِسی جوہر سے تجلّی ہے بہ آغوشِ نظر
ہے یہی حُسنِ اَدا حُسنِ تکلف یکسر  اور اِسی حسنِ تکلف سے سلاسل زیور
شرطِ پابندیِ احساس لگائی اِس نے
ہر جنوں کے لئے زنجیر بنائی اِس نے

اِسی جذبے سے ہے انساں کی ذہانت فنکار  اِسی شعلے سے لہکتے رہے دشت و گلزار
اِسی غازے سے ہوا چہرۂ ظلمت گلنار  اِسی سرمے سے ستارا ہوئی چشمِ شبِ تار
رختِ صد رنگ حقیقت کو پہنایا اِس نے
زخم کو بھی گُلِ شاداب بنایا اِس نے

اِنہیں آیاتِ مُنوّر نے اُجالی دُنیا  اِسی پرتو کا نتیجہ ہے جمالی دُنیا
چاہتی ہے یہ بہر حال مثالی دُنیا  ہو مصفّا عملی اور خیالی دُنیا
یعنی آراستہ باطن بھی ظاہر کی طرح
سینے روشن ہوں حبیب ابنِ مظاہر کی طرح

سارے ذرّے تپشِ مہر کے حامل ہو جائیں  سب کے دل معرفتِ حُسن کے قابل ہو جائیں
قطرے گوہر ہوں ستارے مہِ کامل ہو جائیں  جلوۂ طور سے آنکھیں متوسّل ہو جائیں
سیرتِ عبد میں معبود کی تنویریں ہوں
چہرے ایسے ہوں کہ والشمس کی تفسیریں ہوں

نازِ تخلیق یہی، رازِ تجلّی بھی یہی  جلوۂ طور یہی، آتشِ سینا بھی یہی
سینۂ گوتم و زرتشت کا شعلہ بھی یہی  حُسنِ یُوسف بھی یہی ہے یدِ بیضا بھی یہی
یہی ناگاہ دلِ کوہِ صفا سے نکلا
مشعلِ نور لئے غارِ حرا سے نکلا

یہی سرمایۂ انوارِ علومِ کونین     تھا سلونی بہ لبِ فاتحِ صفین و حُنین
یہی اسرارِ تجلی بہ حدیثِ ثقلین     اِنہیں اسرارِ تجلّی کا امیں قلبِ حسینؑ

ظلم ترسیدہ و لرزیدہ سیاہی جن سے
کربلا مہبطِ انوارِ الٰہی جن سے

اِنہیں جلوؤں سے خدائی بخدا روشن ہے     قلبِ مہر و مہ و انجم کا دیا روشن ہے
چشمِ عقل و دلِ اربابِ صفا روشن ہے     راہِ حق، راہِ عمل، راہِ وفا روشن ہے

مشعلیں نُور کی جلتی ہیں اِنہیں جادوں پر
اور قائم ہے تمدّن! اِنہیں بُنیادوں پر

آج بھی ذہن میں روشن ہیں ہدایت کے چراغ     دردِ ملت نے جلائے ہیں محبت کے چراغ
شبِ تاریک سے لڑتے ہیں نبوّت کے چراغ     شعلۂ قلبِ محمدؐ ہیں امامت کے چراغ

جلوۂ حق نے بنا رکھا ہے طالب سب کو
نور ملتا ہے علیٰ قدرِ مراتب سب کو

کربلا کیا ہے؟ اِنہیں آیاتِ درخشاں کی دلیل     ایک صدیوں کی روایات کی جیسے تکمیل
جس پہ برپا ہوئی قربانیٔ موعودِ خلیلؑ     علی اکبرؑ تھے یہاں اور وہاں اسماعیلؑ

خونِ کم مایہ اُدھر خونِ نبیؐ کے بدلے
لاکھ تلواریں اِدھر ایک چھُری کے بدلے

کِس قدر مرحلۂ صبر و تحمّل ہے اَدَق     ہاجرہ تک پئے فرزند رہیں محوِ قلق
لیکن ایثار کی تاریخ نے اُلٹا جو وَرق     اُمِ لیلیٰ کی جبیں پر نہ شکن تھی نہ عَرق

کر لیا حق کے لئے جبر گوارا اُس نے
موت کو سونپ دیا آنکھ کا تارا اُس نے

اے خوشا صلِ علیٰ اکبرِ غازی کا شباب — جس کی پرچھائیاں دیں خوابِ زلیخا کا جواب
مہِ یثرب، مہِ کنعاں سے زیادہ شاداب — اللہ اللہ وہ کھلتے ہوئے عارض کے گلاب
کیا تعجب کہ شفق اور شہابی ہو گی
دھوپ بھی پرتوِ عارض سے گلابی ہو گی

حبذا عارضِ شمشادِ گلستانِ بتولؑ — دیدۂ بلبلِ سدرہ ہو خنک جس سے وہ پھول
زلفیں وہ جن پہ تصدق شبِ معراج کا طول — جن کی خوشبو سے مدینے کو ملی بوئے رسولؐ
آنکھیں اصحاب کی روشن ہوئیں جلوہ دیکھا
اپنے محبوب پیمبرؐ کا سراپا دیکھا

رخِ روشن وہی، پیشانیِ انور بھی وہی — چشم و ابرو وہی، لہجہ وہی، تیور بھی وہی
دوش تک آئی ہوئی زلفِ معنبر بھی وہی — رخ پہ بل کھائے ہوئے بالوں کے گھونگر بھی وہی
جب چلے شیوۂ رفتارِ نبیؐ دکھلا کر
چونک اٹھیں شہر کی گلیاں وہی آہٹ پا کر

سیرۃً نامِ خدا خُلقِ نبیؐ کی تصویر — ارث میں جوہرِ شجاعت تھا علیؑ کی جاگیر
حلقۂ زلف میں بچپن سے جلالت بھی اسیر — تھے کھلونے تبر و تیغ و سنان و شمشیر
شانے بے ساختہ جھولے میں لچک جاتے تھے
سن کے تلوار کی جھنکار ہمک جاتے تھے

ماہِ نو کو کبھی تلوار سمجھ کر ہمکے — ہمکے یوں جیسے علیؑ دیکھ کے اژدر ہمکے
سن کے آوازِ اذاں جھولے میں اکثر ہمکے — جب بھی عباسؑ قریب آئے تو اکبرؑ ہمکے
کیوں نہ بچپن سے شجاعت کا اسے پیار ملے
شہسواری کو جسے دوشِ علمدار ملے

مختصر یہ کہ ہوئی سیرتِ اکبرؑ کامل — طاعتِ حق کو سدا زیست کا سمجھا حاصل
حالِ فرزند سے خورسند رہا باپ کا دل — یہی دن تھے کہ ہوا تخت نشیں اک جاہل
شوقِ لذت میں اوامر تھے نواہی جس کو
باپ ورثے میں عطا کر گیا شاہی جس کو

عہد میں اُس کے نمایاں ہوئی یہ صورتِ حال — حق ہر اک شخص سے کرنے لگا نصرت کا سوال
دینِ اللہ کو درکار تھی اُس پُشت کی ڈھال — عزم جس کا ہو قوی کوہِ گراں کی تمثال
جس کے سینے میں دھڑکتا ہو براہیم کا دل
جس کا دل مستقلاً کوثر و تسنیم کا دل

وقت آیا کہ کریں ظلم کی تکذیب حسینؑ — اپنے کردار سے دیں خیر کی ترغیب حسینؑ
از سرِ نو کریں اخلاق کی ترتیب حسینؑ — پھر سے تہذیب کو دیں صورتِ تہذیب حسینؑ
جس سے پھر گلشنِ ملت میں بہار آ جائے
دلِ اسلام کی دھڑکن کو قرار آ جائے

یہی جذبہ لئے شبیرؑ مدینے سے چلے — فدیۂ حق کے لئے ساتھ تھے گودی کے پلے
پیکرِ عزم و عمل نور کے سانچے میں ڈھلے — جامہ زیب ایسے کہ ہتھیار بھی لگتے تھے بھلے
مہ جبیں ایسے کہ حوروں کو بھی پیار آ جائے
جس بیاباں میں چلیں اُس میں بہار آ جائے

درمیانی جو منازل تھے وہ طے کر کے تمام — ہوئے راہی طرفِ منزلِ مقصود امامؑ
اور بڑھنے لگی رستے کی صعوبت ہر گام — لب پہ ہر حال میں آتا رہا اللہ کا نام
پہنچا جب قافلہ حضرت کا زبالہ کے قریب
شاہزادے کا فرس تھا شہِ والا کے قریب

پشتِ رہوار پہ اک بار جو جھپکی آئی — حالتِ خواب میں حضرت نے یہ آواز سُنی
گامزن راہِ خدا میں ہیں حسینؑ ابنِ علیؑ — موت ہے ارضِ مقدس سے جِلو میں اُن کی

رُخ کسی شہر کی جانب ہے نہ جنگل کی طرف
اِک کشش ہے جو لئے جاتی ہے مقتل کی طرف

سُن کے یہ بات ہوئے خواب سے بیدار جو شاہ — آنکھ کھُلتے ہی زباں سے کہا اِنّا لِلّٰہ
گوشِ اکبرؑ میں یہ آواز جو پہنچی ناگاہ — پوچھا کیا بات ہے بابا؟ مجھے کیجے آگاہ

شہِ ذی جاہ نے دُہرائی جو وہ حالتِ خواب
وجہِ حیرت ہوئی فرزند کو کیفیتِ خواب

باندھ کر ہاتھ یہ کی عرض کہ یا شاہِ ہُدا — دل ہے بے چین، یہ کیا رمز ہے مجھ پر نہ کھُلا
مضطرب آپ ہیں، کیا حق پہ نہیں ہم بابا — کہا شبیرؑ نے برحق یہ سفر ہے بخدا

صادق الوعد ہوں ٹیڑھا نہیں جادہ میرا
مرضیِ حق کے مطابق ہے ارادہ میرا

سُن کے مژدہ رخِ اکبرؑ پہ بحالی آئی — جاگ اُٹھے جلوۂ رُخسار وہ سُرخی چھائی
پھُوٹی چہرے سے کرن جوش میں لی انگڑائی — کہا حضرت سے کہ یا سیّدی و آقائی

حق پہ جب ہم ہیں تو پھر موت کی پروا کیا ہے
عزمِ راسخ کے لئے آگ کا دریا کیا ہے

قافلہ بڑھتا رہا اور مقامات وہ آئے — کہ شجاعت کے کرشمے علی اکبرؑ نے دکھائے
خندہ روئی سے کبھی حوصلے لشکر کے بڑھائے — کبھی گستاخیِ حُر دیکھ کے بل زُلف نے کھائے

جوش وہ تھا کہ زمانہ تہ و بالا ہوتا
مُسکرا کر جو نہ حضرت نے سنبھالا ہوتا

وقت ٹلتا رہا بڑھتے رہے شاہِ ذی جاہ
الغرض آگئی وہ وادیِ بے آب و گیاہ
جس کی عظمت پہ یداللہ کے آنسو تھے گواہ
منزل آرا ہوئی جس میں علی اکبرؑ کی نگاہ
جس کی عباسؑ سے غازی کو ترائی بھائی
جس سے آتی ہے صدا آج بھی بھائی بھائی

نہ ملا آلِ عبا کو مگر اس بن میں بھی چین
تیسرے دن سے گھرے نرغۂ اعدا میں حسینؑ
بند پانی ہوا سیدانیاں کرنے لگیں بین
وہ گھڑی آگئی آخر کہ امامِ کونین
اپنا سر لے کے بڑھیں حفظِ شریعت کے لئے
مہلت اک شب کی ملی شہ کو عبادت کے لئے

شب عاشور رہے محوِ عبادت احرار
گرد خیموں کے طلایہ بھی پھرے شب یک بار
ہوئے گردوں سے نمایاں جو سحر کے آثار
آئے پھر اپنے مصلّے پہ امامِ ابرار
مسکرا کر کہا اکبرؑ سے اذاں دو بیٹا
عالمِ پیر کو آہنگِ جواں دو بیٹا

بارک اللہ! وہ اکبرؑ کی اذاں کی تاثیر
تھم گیا وقت سرِ راہ مثالِ رہگیر
عرش تک دونوں جہاں چپ تھے بہ کیفِ تکبیر
بن گیا عالمِ آوازِ جہانِ تصویر
سر بسجدہ ہوئی ہر شاخِ شجر جھک جھک کر
نفَسِ سرد بھرا بادِ صبا نے رُک کر

ہوئے فارغ جو نمازِ سحری سے جرّار
شاہِ دیں داخلِ خیمہ ہوئے سج کر ہتھیار
مرحلہ ہو گیا رخصت کا بھی طے آخرکار
پردہ خیمے کا جو فضّہ نے اٹھایا اک بار
جانِ آفاق گلے مل کے بہن سے نکلا
قافلہ بادِ بہاری کا چمن سے نکلا

نصرتِ حق کے لئے دیں کا شہنشاہ چلا      مطمئن نفس سوئے لشکرِ گمراہ چلا
گرد و پیش اپنے ستاروں کو لیے ماہ چلا      ختمِ حجت کے لئے ابنِ ید اللہ چلا
چڑھ کے ناقے پہ دیا خطبۂ عالی شہ نے
کی سرِ معرکہ تقریرِ مثالی شہ نے

لبِ دریائے فصاحت جو گہر ریز ہوا      نشۂ جہل و ہوس اور اُدھر تیز ہوا
جوش اِدھر شوقِ وغا کے لئے مہمیز ہوا      ایک آغوشِ اجل دشتِ بلا خیز ہوا
دُہلِ جنگ سے خاموش فضائیں جاگیں
شورِ تکبیر سے جنگل کی ہوائیں جاگیں

مختصر یہ کہ ہوا رن میں وغا کا آغاز      اپنے خیموں سے زرہ پھینک کے نکلے جانباز
پاٹ کر رکھ دیئے لاشوں سے نشیب اور فراز      ہر مجاہد کی شجاعت تھی خدا کا اعجاز
موت نے چُن لیا جب سارے وفاداروں کو
پیار سے تکنے لگی شہ کے جگر پاروں کو

کبھی قاسمؑ پہ کبھی عونؑ پہ آیا اُسے پیار      پھول سب توڑ لیے ہوگیا ویراں گلزار
خیمے جراروں کے خالی ہوئے اُجڑی سرکار      قتل دریا پہ ہوا بازوئے شاہِ ابرار
خاتمہ ہو گیا دلسوزی و جانبازی کا
مَل لیا وقت نے چہرے پہ لہو غازی کا

بعد عباسؑ کے کہتے تھے یہ باہم اعدا      دیکھیے کس کو عطا ہوتا ہے اب اذنِ وغا
شاہ کچھ سوچ رہے تھے کہ یہ ہاتف نے کہا      اب ادا فرض بر اہیم کا کیجے مولا
مُڑ کے دیکھا شہِ ذی جاہ نے اکبرؑ کی طرف
اور اشارہ کیا پھر خیمۂ اطہر کی طرف

مسکراتا ہوا خیمے میں گیا وہ مہتاب　　روشنی دیدۂ یعقوبؑ کی تھا جس کا شباب
پئے رخصت کیا ہمشکلِ نبیؐ نے جو خطاب　　امِ لیلیٰ سے زیادہ ہوئیں زینبؑ بیتاب
ماں تو تیار تھی ایثارِ مثالی کے لئے
وقت نازک تھا مگر پالنے والی کے لئے

پا کے رخصت کا اشارہ جو ہوا دل بے چین　　شدتِ غم سے جھکیں بنتِ شہِ بدر و حنین
ناگہاں آئی یہ آوازِ رسولُ الثقلین　　اے مری نورِ نظر! خواہرِ رنجورِ حسینؑ!
آہ و فریاد کے سامان یہ کیوں ہیں زینبؑ!
تیرے چھلکے ہوئے آنسو مرا خوں ہیں زینبؑ!

تیرے ایثار پہ نازاں ہے وفا اے بیٹی　　میرا دل روتا ہے آنسو نہ بہا اے بیٹی
منزلِ صبر میں بھیگے نہ ردا اے بیٹی　　ہے یہ ہنگامِ دعا، مانگ دعا اے بیٹی
عرض کر، لال ترا فخرِ اب و جد ہو جائے
میری امت کا یہ فدیہ نہ کہیں رد ہو جائے

کوکھ اور مانگ کی بیٹی کوئی قیمت ہے آج　　روحِ اسلام کی محتاجِ حمایت ہے آج
نزع میں مذہبِ ایثار و صداقت ہے آج　　اس کو خونِ علی اکبرؑ کی ضرورت ہے آج
اس کی نصرت میں تامل تجھے کیا ہے زینبؑ
مسلکِ حق ترا منہ دیکھ رہا ہے زینبؑ

فرض کے نام پہ اولاد گنوائی تو نے　　خود زرہ عونؑ و محمدؑ کو پہنائی تو نے
دیکھی پردے سے بغور اُن کی لڑائی تو نے　　لاشیں آئیں صفِ ماتم نہ بچھائی تو نے
ہاں مصلّے کو بچھایا صفِ ماتم کی جگہ
سجدۂ شکر کیا نالۂ پیہم کی جگہ

دخترِ شیرِ خدا، فخرِ خواتینِ عرب! مامتا کو تری ناگاہ یہ کیا ہوگیا اب
امتحاں صبر کا ہے ہوش میں آئے زینبؑ تجھ سے کرتی ہے وفا آخری پونجی بھی طلب
تیرا جد ہاتھ کو پھیلائے کھڑا ہے بیٹی
اِس کی اُمت پہ عجب وقت پڑا ہے بیٹی

تجھ سے اکبرؑ کا طلبگار ہے ربِ اکبر جو خدا کی ہے امانت اُسے دے دے اُٹھ کر
لاج نانا کی ترے ہاتھ ہے اے نورِ نظر جُھک نہ جائے مرا سر پیشِ خلیلِ داور
تازہ پھر حادثۂ ارضِ مِنا کرنا ہے
قرض اُس کا ترے بھائی کو ادا کرنا ہے

سُن کے نانا کی اِس آواز کو چونکیں زینبؑ رُخ مدینے کی طرف کر کے کہا یہ بہ ادب
ہوش آیا مجھے یا فخرِ رُسل خاصۂ رب قابلِ عفو ہے لیکن مرا اظہارِ تعب
ضعفِ ایماں نہیں جذبات کی شدت تھی وہ
اب بحل کیجئے، تقصیرِ محبت تھی وہ

مُنفعل ہے علی اکبرؑ کی یہ دائی نانا سہل تھی گود کے پالے کی جدائی نانا
مگر اک اور بھی صدمہ تھا دہائی نانا فکر یہ تھی کہ اکیلے نہ ہوں بھائی نانا
بازو پہلے ہی شکستہ ہیں کمر ٹوٹ نہ جائے
ہاتھ سے اُن کے ضعیفی کا عصا چھوٹ نہ جائے

خیر میں خوش ہوں رہِ حق میں علی اکبرؑ بھی نثار اور اکبرؑ تو جواں ہیں علی اصغرؑ بھی نثار
امتحاں ہے ابھی باقی تو برادر بھی نثار میرا مقنع بھی نثار اور مری چادر بھی نثار
صابرہ اب بھی ہے دو روز کی پیاسی نانا
آپ کے دین پہ صدقے یہ نواسی نانا

کہہ کے یہ دل کو قوی کر کے بھتیجے سے کہا — میں نہیں مانعِ تحصیلِ سعادت حاشا
فرض طالب ہے تمہارا تو سدھارو بیٹا — دے ہمیں صبر کی توفیق محمدؐ کا خدا
ہے پھوپی کو کہ چلی اس کا سہارا تم تھے
اس کی دھندلائی ہوئی آنکھ کا تارا تم تھے

ماں یہ بولی مرے ارمان نکالو اکبرؑ — میرا گرتا ہوا گھر جا کے سنبھالو اکبرؑ
منتظر سب ہیں بزرگوں کی دعا لو اکبرؑ — شوکتِ حرب کا دادا سے صلا لو اکبرؑ
الاماں اہلِ ستم رن میں پکاریں بیٹا
رائیگاں ہوں نہ مرے دودھ کی دھاریں بیٹا

فوج میں آمدِ غازی کا اُدھر تھا چرچا — اور اِدھر رخصتِ اکبرؑ کا تلاطم تھا بپا
کر کے تسلیم بزرگوں کو دلاور جو چلا — پکڑا دامن کو سکینہ نے تو لپٹی کبریٰؑ
صدقے ہوتا تھا کوئی گرد کوئی پھرتا تھا
پردۂ در کبھی اُٹھتا تھا کبھی گرتا تھا

اِس تلاطم میں برآمد جو ہوا وہ گلفام — منتظر تھے درِ خیمہ پہ شہِ عرش مقام
کس بشاشت سے لیا آپ نے بیٹے کا سلام — فدیۂ راہِ محبت کو دیا یہ انعام
جسم پر اسلحۂ جنگ سجایا خود ہی
زینِ مرکب پہ مجاہد کو بٹھایا خود ہی

لے کے اکبرؑ کو چلا جانبِ میداں جو عقاب — کوششِ ضبط پہ بھی باپ کا دل تھا بیتاب
پھر بھی تسلیم و رضا سے ہوئی طے راہِ ثواب — پیشِ خالق کیا یوں جذبۂ صادق نے خطاب
سرِ نوخاستۂ باغِ پیمبرؐ ہو قبول
ہدیۂ لختِ جگر خالقِ اکبر ہو قبول

اس طرف حضرتِ شبیرؑ دعا دے کے چلے     واں فرس پہ علی اکبرؑ سرِ میدان پہنچے
افسرانِ سپہِ شام یہ کہہ کہہ کے ہٹے     قوّت و حسن و شجاعت میں ہیں ان کے شہرے
سر بسر نور فگن جلوۂ پیغمبرؐ ہے
دھاک ہے جس کی شجاعوں میں وہ صفدر ہے

پہنچا مقتل میں جو فرزندِ امامِ ذی جاہ     تھم کے کی فوج کے اُمڈے ہوئے بادل پہ نگاہ
دی یہ ہاتف نے صدا اے خلفِ شیرِ الٰہ     رُو سیہ اپنے علم کھول چکے بسم اللہ
بدلی گھوڑے نے کنوتی کہ چڑھیں رن پہ چڑھیں
مگر اکبرؑ متأمل کہ وہ بڑھ لیں تو بڑھیں

تھا یہ نعرہ کہ جگر گوشۂ حیدرؑ ہوں میں     اے شغالانِ عرب شیرِ دلاور ہوں میں
مجھ کو پہچان لو ہمشکلِ پیمبرؐ ہوں میں     تم میں ہمت ہو تو آؤ علی اکبرؑ ہوں میں
قصد رکھتا ہوں کہ یہ سدِ سکندر اُلٹوں
آستینوں کو اُلٹ کر صفِ لشکر اُلٹوں

مجھ میں ہمت بھی ہے جرأت بھی ہے شوکت بھی ہے     باپ کا عزم بھی، عمو کی شجاعت بھی ہے
پُشت پر حمزہؑ و جعفرؑ کی روایت بھی ہے     اور میراث میں دادا کی جلالت بھی ہے
جن کو دعوائے شجاعت ہو، بلاؤ اُن کو
بھاگنا جن کو نہ آتا ہو لڑاؤ اُن کو

دیکھو اِس تیغ میں ہیں تیغِ علیؑ کے جوہر     والیِ شام تھا حاکم کا تمہارے جو پدر
قول اُس کا ہے کہ ثانی نہیں رکھتا اکبرؑ     مجھ کو ترکے میں ملی ہر صفتِ پیغمبرؐ
میری صورت میں ہے موجود نشانی اُن کی
مجھ کو دیکھو جو نہ دیکھی ہو جوانی اُن کی

کہہ دو نیزوں سے زباں اپنی نکالے کیا ہیں          یہ سناں کیا، یہ کماں کیا ہے یہ بھالے کیا ہیں
قدر انداز ہیں کیا برچھیوں والے کیا ہیں          سرِ حبابوں کے بہم ہیں یہ رسالے کیا ہیں
شان اِس آنکھ میں جچتی ہی نہیں شاہوں کی
شیر بھبکی میں نہیں آتے ہیں روباہوں کی

اِن صفوں میں جو فرس کو ابھی گرما کے پھروں          اُس کنارے تلک اس فوج کے جا جا کے پھروں
کوفہ و شام کا رستہ نہیں کھلا کے پھروں          بلکہ منزل یہ تمہاری تمہیں پہنچا کے پھروں
ایک بدلا ہوا عالم نظر آئے تم کو
آنکھ کھلتے ہی جہنم نظر آئے تم کو

جب کہ دینے لگی پیہم سپہِ خانہ خراب          بارشِ تیر سے، نُطقِ علی اکبرؑ کا جواب
ہو گئی میان میں شمشیرِ مجاہد بے تاب          دَف بجے ولولہ انگیز ہوا جوشِ شباب
حیدری شان سے غازی نے بڑھایا گھوڑا
ہنہناتا ہوا لشکر میں دَر آیا گھوڑا

یا علیؑ کہہ کے مجاہد نے نکالی تلوار          سایۂ نیّرِ اکبر میں ہلالی تلوار
بنی منجملۂ آیاتِ جلالی تلوار          غُل ہوا لو علی اکبرؑ نے سنبھالی تلوار
لیلیٰ صاعقہ خو صاعقہ بار آتی ہے
پھول زخموں کے برستے ہیں بہار آتی ہے

کیکپی وقت کو تھی سُن کے جَری کی للکار          خوں کی گھنگھور گھٹا جھوم کے اُٹھی یک بار
مینہ برسنے لگا پڑنے لگی مقتل میں پھوار          پہنچی جنگل سے ترائی میں سروں کی بوچھار
رن میں کس کس پہ نہ تھا تیغِ شرر بار کا قرض
گھاٹ ادا کرنے لگا خونِ علمدار کا قرض

تیغ کے ساتھ ہی گھوڑے کے بھی تیور تھے خراب　　شیر دل جس کو ملا تھا صفِ ہیجا میں خطاب
تھا نہ میدان میں رخشِ علی اکبرؑ کا جواب　　تُند خُو، تیز نفس، برق عناں، مہر رکاب
وہ تگ و دَو تھی کہ فوجوں کا بُرا حال کیا
یادِ قاسمؑ میں سمندوں کو بھی پامال کیا

مُرتجز شیرِ خدا، فاتحِ خیبر کا فَرَس　　ذُوالجناحِ شہِ والا تھا، پیمبر کا فرس
علی اکبرؑ کا فرس تھا، علی اکبرؑ کا فرس　　باگیں ڈھیلی جو وہ کرتے تو دلاور کا فرس
عرش تک جا کے فرشتوں کی دُعائیں لیتا
خود بُراقِ نبویؐ آ کے بلائیں لیتا

جسم تیار، سُبک چال، جوانی کی اُمنگ　　وہ کنوتی جو بدل دیتی تھی پیکار کا رنگ
گھات ایسی تھی کہ شیرانِ نیستاں بھی ہوں دنگ　　تیز گامی کے لئے دامنِ جنگاہ تھا تنگ
ناز یہ تھا کہ مجھے حاجتِ مہمیز نہیں
اِس پہ غصہ کہ بیاباں کی ہوا تیز نہیں

ایسے جاں دار فرس پہ علی اکبرؑ تھے سوار　　جوشِ نصرت نے بڑھایا تھا جمالِ رُخسار
عزم کہتا تھا کہ کیا چیز ہیں آہن کے حصار　　چاٹ جائے گی اِنھیں دم میں یہ ناگن تلوار
جس کا سونگھا ہوا میداں میں نہ پانی مانگے
رُونمائی میں جو زخموں کی نشانی مانگے

تھی خواصی میں ظفر اکبرِ جرّار کے ساتھ　　موت کا عہد بندھا تیغِ شرربار کے ساتھ
قافلے عمر کے بڑھنے لگے رہوار کے ساتھ　　زندگی تیز ہوئی وقت کی رفتار کے ساتھ
خم ہوئے گُرزِ گراں مثلِ کماں تیر ہوئے
خوف طاری ہوا ایسا کہ جواں پیر ہوئے

موت کہتی تھی غضب ہے یہ اکیلی تلوار ‏ مجھ کو کافی ہے اب تک یہ اکیلی تلوار
صدقے میں، ہے یہ مرے ساتھ کی کھیلی تلوار ‏ میری منہ بولی بہن میری سہیلی تلوار
چشم بد دور جھجک جاتی ہے بجلی اس سے
ملک الموت کی آنکھوں میں ہے خنکی اس سے

اک تلاطم تھا صفوں میں جدھر آیا جرار ‏ کہ اٹھی گر کے جو آندھی تو گرا اٹھ کے غبار
سنگ دل جو تھے انھیں چاٹ گئی تیغ کی دھار ‏ بزدلے کٹ گئے مانندِ گزر، مثلِ خیار
جن میں سودا تھا عداوت کا وہ سر کاٹ دیئے
زہر اگلتے جو فضا میں وہ شجر کاٹ دیئے

کبھی جاتے تھے یمیں اور کبھی آتے تھے یسار ‏ ہر طرف ملتی تھیں پرواز پہ روحیں تیار
شیر نے توڑ دیا فوج کی نخوت کا خمار ‏ لے کے اسواروں کو میدان سے بھاگے رہوار
پہرہ داروں کے دلوں کو نہ قرار آتا تھا
خوف سے خیمۂ سردار جھکا جاتا تھا

بدحواسی کے سبب فوج کے اکھڑے تھے قدم ‏ وہ لمبردار تھے روپوش کہ جن پہ تھا بھرم
بیرقیں منہ کو چھپائے تھیں لرزتے تھے علم ‏ دیدنی تھی پسرِ سعد کی حالت اس دم
ملک حاصل نہ ہوا جان اسی غم میں چلی
دولتِ رے کی ہوس لے کے جہنم میں چلی

جلوۂ برق عقابِ علی اکبرؑ پہ نثار ‏ دامنِ زیں کو نہ چھو سکتا تھا میداں کا غبار
انکھڑیاں سرخ کہ مستانہ روی کا تھا خمار ‏ قلبِ لشکر میں گھسا توڑ کے آہن کا حصار
پسرِ سعد کے خیمے پہ کئی بار گیا
بحرِ فولاد میں اس پار سے اس پار گیا

سب سے پہلے جو نشاں کھولے تھے کالے بھاگے
سپریں پھینک کے سرِ تن پہ سنبھالے بھاگے

میسرہ ٹوٹ گیا میمنے والے بھاگے
یہ صف اُکھڑی وہ صف اُکھڑی وہ رسالے بھاگے

اب بناتے رہیں افسانہ فسانے والے
پیٹھ دکھلا ہی گئے پیٹھ دکھانے والے

آزمودہ جو سپاہی تھے سنبھل کے بھاگے
اپنی رفتار کا انداز بدل کے بھاگے

جامہ ہائے بشریت سے نکل کے بھاگے
آج کس طرح ٹھہر جاتے وہ کل کے بھاگے

دُور از حال یہ عادت ہی نہیں تھی اُن میں
استقامت کی روایت ہی نہیں تھی اُن میں

کتنے ایسے تھے جنہیں کوئی صلہ تک نہ ملا
یعنی اِک زخم، نشانِ وغا تک نہ ملا

راہ میں بھاگنے والوں کا پتہ تک نہ ملا
بھاگے اس طرح کہ نقشِ کفِ پا تک نہ ملا

بگڑے اس طرح لڑائی تو بھلا کیا بنتا
پاؤں تھے سر پہ نشانِ کفِ پا کیا بنتا

بسکہ بپھرا ہوا تھا شیرِ ژیانِ شبیرؑ
غیظ میں بھی نہ بگڑتی تھی نبیؐ کی تصویر

دم میں کٹ کٹ کے گرے گرز و کمان و پر تیر
صاف وہ صف تھی جھکی جس پہ وہ بُراں شمشیر

تازہ کی اکبرِ غازی نے شجاعت کی مثال
بن گئے حیدرِ کرار کی جرأت کی مثال

بے جھجک چھاؤں میں تیغوں کی در آنا بھی وہی
زد پہ جو ہو اُسے ہنس ہنس کے رُلانا بھی وہی

جھومنا بھی وہی ہونٹوں کو چبانا بھی وہی
کوئی مانگے جو اماں مُنہ کو پھرانا بھی وہی

بھاگتی فوج کا پیچھا کبھی منظور نہ تھا
کہ یہ مردانِ اولوالعزم کا دستور نہ تھا

ڈھنگ جعفر کے دکھائے کبھی عباسؑ کے داؤ     قلبِ لشکر کو نہ تھا ہیبتِ غازی سے قرار
پس کے اُٹھتا تھا سمندوں کی جو ٹاپوں سے غبار     قید ہو جاتے تھے میداں کے بگولوں میں سوار
یوں بھٹکتے تھے نکلنے کی نہ جا ملتی تھی
راہ جس سمت بھی کھلتی تھی قضا ملتی تھی

دستِ جرار نے انبوہِ گراں کاٹ دیئے     سر پھری فوج کے رُو دار جواں کاٹ دیئے
تسمے باقی نہ رکھے تارِ رگِ جاں کاٹ دیئے     چہرے مسخ کئے نام و نشاں کاٹ دیئے
دل کی خواہش تھی کہ منہ کفر کا کالا ہو جائے
کوفہ و شام کی ظلمت تہ و بالا ہو جائے

یہ خیال آتے ہی دل میں ہوا جوش اور سوا     وار بڑھ بڑھ کے کئے ہو گیا محشر برپا
خاک میں مل گئی لشکر کی تمنائے جفا     بج گیا دہر میں ہمشکلِ نبیؐ کا ڈنکا
سامنے فوجِ ستم دادِ وغا دینے لگی
پشت سے روحِ علمدار دعا دینے لگی

مژدۂ فتح کی گردوں سے ندائیں آئیں     دل بڑھانے کو بزرگوں کی دعائیں آئیں
باغِ فردوس کی پرکیف ہوائیں آئیں     خیر مقدم کو فرشتوں کی صدائیں آئیں
افسرِ فوج تھے خم عہدِ غلامی کے لئے
سرنگوں رایتِ لشکر تھے سلامی کے لئے

فوج عاجز تھی جلالِ علی اکبرؑ کی قسم     سر نموداروں کے خم تھے سرِ سرورؑ کی قسم
مورچے ٹوٹ کے ابتر ہوئے حیدرؑ کی قسم     حسنِ تہذیب نکھر آیا پیمبرؐ کی قسم
کان تک آئی جو فریاد و فغاں کی آواز
رُک گئی تیغِ جری، سن کے اماں کی آواز

فوج اماں مانگتی ہو جب تو کریں کیا اکبرؑ　　بیچ لشکر میں رُکے، روک کے گھوڑا اکبرؑ
چار سُو فوج کے دَل، اور تنِ تنہا اکبرؑ　　جھوم کر کھانے لگے نیزے پہ نیزہ اکبرؑ
اِک شکن بھی تو جبیں پہ نہ نمودار ہوئی
مسکراتے تھے کہ برچھی کی اَنی پار ہوئی

ڈگمگانے لگا گھوڑے پہ وہ سروِ گلفام　　اور کہا لیجیے بابا علی اکبرؑ کا سلام
ساتھ ہی فتح کے باجوں نے دیا جیت کے پیام　　جھک گئے شکر کے سجدے میں شہِ عرش مقام
عرض کی تجھ سے خجل سبطِ محمدؐ نہ ہوا
شکر صد شکر کہ ہدیہ یہ مرا رَد نہ ہوا

تُو ہے شاہد کہ بھرے گھر کو لُٹایا میں نے　　تیری تائید سے ہر بوجھ اُٹھایا میں نے
قرض نانا کی محبت کا چکایا میں نے　　علی اکبرؑ کو بھی پروان چڑھایا میں نے
خونِ اصغرؑ بھی ہو درکار تو لاؤں اُس کو
لا کے پہلو میں برادر کے سُلاؤں اُس کو

شہ نے جب شکر کے سجدے سے فراغت پائی　　نم ہوئی آنکھ، رُخِ زرد پہ سُرخی چھائی
مُنہ سوئے نہر کیا اور کہا اے بھائی　　اب تو زائل ہوئی جاتی ہے مری بینائی
وقت بھائی کی مدد کا ہے اُٹھو اے عباسؑ
لاش اکبرؑ کی اُٹھانی ہے چلو اے عباسؑ

کہہ کے یہ شاہ چلے جانبِ میدانِ ستم　　گہہ رکابوں سے نکلتے کبھی جمتے تھے قدم
رحم اور فرض کے جذبوں میں کشاکش تھی بہم　　پاس لاشے کے جو پہنچے تو گرا کوہِ الم
کروٹیں نزع میں اکبرؑ کو بدلتے دیکھا
دَم جواں شیر کا آنکھوں سے نکلتے دیکھا

شاہِ مظلوم سے بیٹے کو جگایا نہ گیا    کپکپی جسم میں تھی ہاتھ بڑھایا نہ گیا
چاہا لاشے کو اُٹھانا تو اُٹھایا نہ گیا    سوچا زینبؑ کو بُلائیں تو بُلایا نہ گیا
مُڑ کے بچوں کو صدا دی، اِدھر آؤ بچو!
اُٹھ سکے بھائی کی میت تو اُٹھاؤ بچو!

ہمہ تن غم درِ خیمہ پہ تھیں بنتِ زہراؑ    سر پُر نور سے تھا گوشۂ چادر ڈھلکا
ناگہاں فرطِ الم میں یہ سُنی ماں کی صدا    بیٹی کیا روتی ہے پردہ درِ خیمہ کا اُٹھا
تیرے بھائی پہ بُرا وقت ہے چل اے زینبؑ
لاش اُٹھتی نہیں بیٹے کی نکل اے زینبؑ

پھٹ گیا سُن کے اس آواز کو زینبؑ کا جگر    دشت کو خیمۂ عصمت سے چلیں برہنہ سر
جان کا ہوش تھا غم میں نہ سر و پا کی خبر    پاؤں رکھتی تھیں اِدھر اور وہ پڑتا تھا اُدھر
چل کے کچھ دور قیامت کا یہ منظر دیکھا
شیر کی لاش کو دوشِ شہِ دیں پر دیکھا

لاشِ فرزندِ جواں مرگ اُٹھائے تھے حسینؑ    چاند کو اپنے کلیجے سے لگائے تھے حسینؑ
خون کو غازۂ رخسار بنائے تھے حسینؑ    روحِ تہذیب کو پروان چڑھائے تھے حسینؑ
عزمِ انسان کی وہ حد تھی کہ مَلک حیراں تھے
زیرِ پا سیکڑوں طوفانِ بلا لرزاں تھے

کیوں نہ ہو خون تھا وہ درد کا مارا ہوا خون    عرشِ اعظم کی بلندی سے اُتارا ہوا خون
تربیت گاہِ محمدؐ میں سنوارا ہوا خون    حیدری عزم کے جوہر سے نکھارا ہوا خون
جو ہر اک معرکے میں برق شرر بار رہا
صادق الوعد رہا، قائم الاقرار رہا

بھوک اور پیاس کی شدت ہو کہ گرمی کا تعب
فکرِ بربادیٔ نسل اور نہ غمِ نام و نسب
شوقِ سرتاجیِ عالم نہ ہوائے منصب
باعثِ ولولۂ شوق فقط مرضیٔ رب
ایسا ہی خون تھا درکارِ امامت کے لئے
کائنات اپنی لٹا دے جو ہدایت کے لئے

وہی خوں آج بھی ہے رونقِ بازارِ حیات
عزم نے جس کے بنائی تھی کل انسان کی بات
آبروئے چہرۂ کونین کی ہے جس کا ثبات
جس کے ہاتھوں میں سجا آئینۂ ذات و صفات
روئے تہذیب کا ہر نقش سنوارا اس نے
زندگی ڈوبتی تھی پار اتارا اس نے

بس مری طبعِ جواں سال بس اب روک قلم
بزم اور رزم کے کیا خوب دکھائے عالم
کیسی تصویریں ہوئیں تیرے مرقع میں بہم
کس نفاست سے ہوا جلوۂ تہذیب رقم
ناز برحق کہ یہ فیضانِ درِ سرور ہے
ذوقِ صفدر پہ نگاہِ کرمِ اکبر ہے

مرثیہ نمبر ۴

# چراغِ مصطفویؐ

بزمِ ہستی کے چراغوں میں ہے تنویرِ وجود

در بیانِ سیرت و احوالِ سید الشہدا

بند: ۱۱۷

تاریخِ تصنیف —— اپریل ۱۹۶۶ء

# سلام

خدا کے عدل کا جو تھا نظام آج بھی ہے
کہ عفو آج بھی ہے، انتقام آج بھی ہے

حسینؑ دہر میں تیرا پیام آج بھی ہے
کہ اقتدار کو سجدہ حرام آج بھی ہے

کھڑی ہے جو حق و باطل کے درمیاں دیوار
ہر ایک خشت کو اُس کی دوام آج بھی ہے

مُطیعِ عزمِ حسینیؑ ہے ابلقِ ایام
کہ اُن کے ہاتھ میں اس کی لگام آج بھی ہے

خرد سے دین کا رشتہ ابھی نہیں ٹوٹا
علیؑ کے درس کا فیضِ دوام آج بھی ہے

اُسی سے پوچھ لو شانِ جلالتِ زینبؑ
دمشق آج بھی، بازارِ شام آج بھی ہے

بیادِ تشنگیِ تشنگانِ کرب و بلا
سحر کے ہاتھ میں سورج کا جام آج بھی ہے

جو تیغ سے نہ جھکا اُس کو سرکشی نہ کہو
کہ اِس غرور کا ایمان نام آج بھی ہے

نظامِ شمس و قمر جس کے گرد پھرتا ہے
وہ قطبِ دیں وہ ہمارا امام آج بھی ہے

شقاوتوں سے بھی دُھندلا سکا نہ نامِ حسینؑ
جبینِ وقت پہ کندہ یہ نام آج بھی ہے

حُسینیت سے بھی ہے جو حسینؑ سے تھی خلش
یزیدیت بہ سرِ انتقام آج بھی ہے

ہیں گرچہ اُن کے عزا دار کشتۂ حالات
عزائے شہ کا مگر اہتمام آج بھی ہے

ہمارا ذوقِ سخن اِک جہاد ہے مُعتمدؔ
ہماری تیغِ زباں بے نیام آج بھی ہے

۲۰ مئی ۱۹۶۶ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بزمِ ہستی کے چراغوں میں ہے تنویرِ وجود
جلوۂ کون و مکاں گردشِ تصویرِ وجود

اللہ اللہ یہ گلکاریٔ تقدیرِ وجود
از ازل تا بہ ابد شوخیٔ تحریرِ وجود

عرش سے فرش تک اس کے ہیں مظاہر لاکھوں
ایک فنکارِ ازل کے ہیں نوادر لاکھوں

اک نئے دور کا آغاز تھا آدم کا وجود
حاصلِ فکر و عمل غایتِ تخلیقِ وجود

عالمِ نو کو ملا جس سے پیامِ مسعود
جس کے اعمال سے ظاہر ہوئے وصفِ محمود

جڑ دیئے خاک میں اشکوں کے نگینے جس نے
رکھ دیئے کھول کے فطرت کے دفینے جس نے

غازۂ چہرۂ تخلیق ہے انساں کا ظہور
رونقِ صحنِ چمن سنبل و ریحاں کا ظہور

وجہِ بالیدگیٔ روح ہے ایماں کا ظہور
لیکن آساں نہیں صاحبِ ایقاں کا ظہور

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

آدمی لختِ دلِ نار و جگر پارۂ نور
فطرتِ اہرمن و قدرتِ یزداں کا ظہور

خلوتِ رازِ ازل، انجمنستانِ شعور
پیکرِ ظلم و کرم، آئینۂ عجز و غرور

پھر بھی ہوتے ہیں فرشتے انہی انسانوں میں
کعبہ جس طرح کئی لاکھ صنم خانوں میں

چھان مارا نگہِ غور نے دشتِ امکاں — صبحِ کاذب کے دُھندلکوں پہ نظر ہے حیراں
راہِ مستقبلِ تاریک میں پھیلا ہے دُھواں — صرف ماضی میں ہیں کچھ لوگوں کے چہرے تاباں

ہمہ تن صدق کی قندیل، صفا کی قندیل
یہ جبینیں ہیں کہ ہیں عرشِ خدا کی قندیل

یہی انسان ہیں صناعِ ازل کا شہکار — جن کی آوازِ قدم سے ہوئی فطرت بیدار
سعی کو جن کی نہ دُھندلا سکا صدیوں کا غبار — اب بھی ہیں راہنما جن کے قدم کے آثار

روحِ تہذیب و تمدن ہے عطیہ جن کا
ایک تاریخ ہے ہر نقشِ کفِ پا جن کا

قصہ خواں ان کے عزائم کا لبِ دجلہ و نیل — یہ تمدن سے لپکتا ہوا گلزارِ خلیلؑ
بانیِ مذہبِ تسلیم و رضا اسمٰعیلؑ — مسلکِ دار و رسن عظمتِ عیسیٰؑ کی دلیل

پیکرِ حِلہ سپر، فخرِ اَب و جَد ہونا
منتہا سارے فضائل کا محمدؐ ہونا

خطِ پیشانیِ آدمؑ میں جو محفوظ تھا نور — چہرۂ ختمِ رسالتؐ میں ہوا اُس کا ظہور
جگمگانے لگا بطحا کا شبستانِ شعور — وادیِ جہل سے ہونے لگی ظلمت کافور

حوصلے خاکِ قدم کے حدِ امکاں سے بلند
شعلۂ طور ہوا سینۂ فاراں سے بلند

دین و دُنیا کو ملا ایک مکمل دستور — ہوا حاصل دلِ انساں کو اخوت کا شعور
فقر کو صبر، عبادت کو مزہ، غم کو سرور — کھل گیا عقل پہ یہ راز بحدِ مقدور

حق کُشی و ہوس ظلمت کا نشاں ہوتی ہے
عدل و انصاف سے تزئینِ جہاں ہوتی ہے

عرش تک پھیل گئے دائرہ ہائے امکاں    حلقۂ شوق بنا حلقۂ آغوشِ زماں
نئے آئینِ تمدن، نئی تنظیمِ جہاں    حسنِ گفتار سے تُلنے لگا پھولوں میں بیاں
رل گئے عقل و جنوں، کوئی لڑائی نہ رہی
دین و دنیا میں ہوا وصل، جدائی نہ رہی

نظمِ قدرت کا اشارہ جو ہوا بعدِ رسولؐ    دوشِ حیدرؑ نے کیا بارِ امانت کو قبول
دین و دنیا کے جو احمدؐ نے بنائے تھے اصول    اُن کی ترویج میں ہر سانس کو رکھا مشغول
روشِ فکر پہ آئینِ عدالت شاہد
حسنِ گفتار پہ اعجازِ بلاغت شاہد

زیرِ محرابِ حرم شانِ عبادت بھی دکھائی    عرصۂ جنگ میں شمشیر کی ضربت بھی دکھائی
رحم و انصاف میں اک باہمی نسبت بھی دکھائی    خضرؑ کا علم بھی، موسیٰؑ کی سیاست بھی دکھائی
متناقض صفتیں، حالتِ موزونی میں
ہو گئی صلحِ کلیمی و فلاطونی میں

ہر نفس شانہ کشِ گیسوئے وحی و الہام    ناخنِ عقدہ کشا، عقدہ کشائے اسلام
منطق و فلسفہ و حکمت و تاریخ و کلام    کون سا علم تھا جس کے نہ ہوئے آپ امام
اِس پہ شاہد ہیں احادیثِ نبیؐ اور قرآں
معجزے دو تھے محمدؐ کے، علیؑ اور قرآں

بعد اُن کے، وہی جادہ وہی رفتارِ حسنؑ    خلق و احسان و کرم، جوہرِ کردارِ حسنؑ
ایک قربانیِ خاموش تھا ایثارِ حسنؑ    گردنِ ملتِ بیضا ہے گراں بارِ حسنؑ
کیا ثابت کہ حق آگاہوں کا رستہ ہے الگ
دولتِ دیں ہے الگ، دولتِ دُنیا ہے الگ

وقت آیا تو ہوئے دین کے سردار حسینؑ — بن گئے حفظِ حرم کے لئے دیوار حسینؑ
منبعِ خیر و شرف ، مرکزِ انوار حسینؑ — بحرِ ظلمات میں اک نور کا مینار حسینؑ
کشتیاں جس کے اُجالے میں رواں ہیں اَب تک
سینے اربابِ محبت کے تپاں ہیں اَب تک

دس برس آپ نے کی صُلحِ حسنؑ کی تفسیر — گوشہ گیر آپ مدینے میں رہے مثلِ فقیر
وقت آیا تو اُٹھے سُن کے تقاضائے ضمیر — بن گئے کارِ ہدایت میں عزم کی تصویر
نفسِ اربابِ تشکک کی صفائی کردی
تاقیامت حق و باطل کی جدائی کردی

وہ زمانے کا تزلزل، وہ سیاست کا فتور — عقلِ کوتاہ کا وہ جہل، وہ ذہنوں کا قصور
حق کُشی عام ، شرِ لیغانہ خصائص سے نفور — رجسِ اعمال کا اِک پردہ، امارت کا غرور
موجزن تھی ہوسِ تاج و نگیں سجدے میں
ذہن، بُت خانہ عقائد کا جبیں سجدے میں

جب نہ اعمال میں کچھ فرقِ بد و نیک رہا — کھل کے ہونے لگے احکامِ الٰہی رسوا
گھونٹا جانے لگا انصاف و شرافت کا گلا — زورِ اسلام گھٹا ، جذبۂ الحاد بڑھا
روحِ اسلام میں شاہی کی جو لعنت آئی
جانشینِ شہِ لولاک کو غیرت آئی

قابلِ غور تھی اسلام کی یہ صورتِ حال — قوم کی خیرہ سری، وقت کی بگڑی ہوئی چال
دلِ شبیرؑ میں آیا جو ہدایت کا خیال — اپنے خالق سے کیا جذبۂ صادق نے سوال
تو ہو خوشنود تو اصلاح کی تدبیر کروں
خون سے دامنِ آفاق کی تطہیر کروں

مجھ سے توہینِ شریعت نہیں دیکھی جاتی
بیکسیِ بشریت نہیں دیکھی جاتی
نور پر یورشِ ظلمت نہیں دیکھی جاتی
حق پہ باطل کی حکومت نہیں دیکھی جاتی
اپنا حق مانگتا ہے مجھ سے اب وجد کا لہو
مضطرب ہے مری رگ رگ میں محمدؐ کا لہو

مجھ کو پالا تھا پیمبرؐ نے اسی دن کے لیے
بیٹھ کر اپنی جگہ خونِ جگر کون پیے
عذر اب کیا ہے، مشیت نے اشارے بھی کیے
وقت للکار رہا ہے، جسے جینا ہے جیے
جسے مرنا ہو ہتیلی پہ وہ سر لے کے بڑھے
شبِ تاریک میں پیغامِ سحر لے کے بڑھے

الغرض آپ نے مکے کی طرف رخ موڑا
ذرے ذرے کو مدینے کے سسکتا چھوڑا
عزم اور جبر کا ٹوٹا ہوا رشتہ جوڑا
رس رہا تھا دلِ تہذیب میں جو اک پھوڑا
اس کے نشتر کے لیے تیغِ علیؑ لے کے بڑھے
روحِ اسلام کی آیاتِ جلی لے کے بڑھے

سرمہ کش، گردِ سفر سے ہوئی چشمِ اقبال
دامنِ شوق کو پھیلانے لگے دشت و جبال
نخلِ صحرا کی ہر اک شاخ بنی دستِ سوال
سب سے پہلے ہوا مکے میں نزولِ اجلال
حرمِ پاک میں فرزندِ نبیؐ آ پہنچے
ابر یثرب سے اٹھا اور سوئے بطحا پہنچا

جب گل افشاں ہوئی مکے میں مدینے کی بہار
پھر تو ہر گوشہ ہوا فیضِ قدم سے گلزار
پرتوِ رخ سے درخشاں ہوئے بام و دیوار
خیر مقدم کے لیے آئے صغار اور کبار
ہو کے پابوس انھیں، طالعِ بیدار ملا
شدتِ عزم ملی، جذبۂ ایثار ملا

زینتِ ارضِ مقدّس تھے مدینے کے نجوم　　نکہت افشانِ حقائق تھے امامِ مظلوم
کہیں انوار کی بارش کہیں جلووں کا ہجوم　　ہر طرف تھی گُلِ بُستانِ رسالت کی دھوم
ناشرِ صدق جو سبطِ شہِ لولاک ہُوا
پردۂ حاکمِ حیلہ گراں چاک ہُوا

جس قدر نورِ حقیقت کی ضیا عام ہوئی　　اُتنی ہی تیرگیِ ظلم و جفا عام ہوئی
رسمِ بے حرمتیِ دینِ خدا عام ہوئی　　کفر بے پردہ ہوا اور دغا عام ہوئی
متعین کیا چُن کر ستم ایجادوں کو
وضعِ محتاج میں بھیجا گیا جلادوں کو

ہر طرف مُلک میں پھیلا دیئے دامِ تزویر　　قاتلوں کو دیا لالچ کہ جو بیچو گے ضمیر
بعد تکمیل کے پاؤ گے خطاب و جاگیر　　خانزادوں کی بدل دوں گا تمہارے تقدیر
مدّعا یہ تھا کہ گُل شمعِ ہدایت ہوجائے
بے اثر جذبۂ انصاف و صداقت ہوجائے

شہ نے جاسوسوں کی ہر سمت جو دیکھی تگ و تاز　　ذہنِ روشن پہ کھُلے عندیۂ قتل کے راز
عقلِ صالح نے دیا مشورۂ ترکِ حجاز　　عزمِ راسخ نے کیا اپنے سفر کا آغاز
فرض نے عہدِ شہادت ہمہ تن باندھ لیا
چھوڑ کر جامۂ احرام کفن باندھ لیا

خدمتِ شاہ میں کوفے سے جو آئے تھے خطوط　　اُن میں تھی جذبۂ دینی سے ارادت مربوط
دیکھنا تھا کہ وہ دعوے ہیں کہاں تک مضبوط　　حُبِّ دُنیا تو نہیں جذبۂ دیں سے مخلوط
مختصر یہ کہ جو حالات نے مجبور کیا
شاہؑ نے مسلمؑ جانباز کو مامور کیا

شہرِ کوفہ میں بمشکل ابھی پہنچا تھا سفیر      مائلِ حق نظر آنے لگا انبوہِ کثیر
اسی اثنا میں ہوا رنگِ سیاست تغیّر      حاکمِ شہر بنا ابنِ زیادِ بے پیر
خوفِ تعزیر سے سرداروں نے حق چھوڑ دیئے
حق سے باندھے تھے جو پیمانِ وفا توڑ دیئے

ولولے گھٹنے لگے جب، تو جفا اور بڑھی      دار پہ کھینچ دیئے سینکڑوں مداحِ علیؑ
وقعتِ ایلچیِ شاہ کی صورت یہ تھی      ہر کوئی دشمنِ جاں، دوست فقط اک ہانیؓ
پہرے تھے کوچہ و بازار میں سنگینوں کے
اہلِ سرمایہ ہم آواز تھے، بے دینوں کے

مختصر یہ کہ پُر آشوب تھا کوفے کا دیار      پڑ رہا تھا رُخِ ایماں پہ ضلالت کا غبار
خونِ مسلمؓ کے لئے عہد شکن تھے تیار      اہلِ دُنیا کو نہ تھا خوفِ خدا سے سروکار
سَر بسر دین کے احکام سے بیزاری تھی
زُہد کے بھیس میں مکاری و غداری تھی

کفر و باطل کی جو یلغار میں تھے شاہِ امام      نہ مدینے میں سکوں تھا نہ حرم میں آرام
چیرہ دستوں کے مراکز تھے رَے و کوفہ و شام      مطمئن حق و صداقت کے بھروسے پہ امام
اپنے موقف کو بدل دیں یہ گوارا ہی نہیں
عزمِ محکم کے بغیر اب کوئی چارا ہی نہیں

عزم وہ جس کی غلامی میں سلیمانِ خرد      سائباں جس کی جلالت کا ہو دامانِ خرد
عزم وہ جس سے کھُلے دیدۂ عرفانِ خرد      عزم وہ ہاتھ میں جس کے ہو گریبانِ خرد
عزم وہ فاتحِ طوفاں ہو سفینہ جس سے
عارضِ شام و سحر پہ ہو پسینہ جس سے

عزم وہ جس کے سفینے میں سمندر ڈوبے — ہوسِ چتر و عَلَم جس میں ہو وہ سر ڈوبے
جس کی موجوں میں غرورِ زر و گوہر ڈوبے — کبر اور ننگِ شہی، نازشِ افسر ڈوبے

عزم وہ جس سے گرجتے ہوئے دھارے مُڑ جائیں
عزم وہ جس سے پہاڑوں کے پرخچے اُڑ جائیں

عَزم وہ وقت کے طوفاں سے جو کرتا ہے جنگ — عزم وہ جس کی حرارت سے پگھل جائیں سنگ
عزم وہ جس کے لئے وسعتِ آفاق ہو تنگ — عزم وہ جس کو کہیں قلبِ مشیت کی اُمنگ

عزم وہ عزم کہ ایمان ہو سانچہ جس کا
پھیر دے روئے حوادث کو طمانچہ جس کا

عزم وہ عزم جو ہو وقت کی گردن پہ سوار — عزم وہ عزم جو حالات کی بدلے رفتار
ایسے ہی عزم نے حضرت سے کیا پھر اصرار — آ گئی زیرِ قدم راہِ شہادت آثار

بڑھے آگے تو مراحل نے بھی نقشہ بدلا
آ کے اِک موڑ پہ تاریخ نے رستہ بدلا

راہ میں تھے کہ فرزدق نے سنائی یہ خبر — قتلِ مسلمؑ ہوئے، کوفے کے ہیں حالات دگر
دل اِدھر آپ کی جانب تو حُسام ہیں اُدھر — سُن کے یہ حال پلٹنے کا بھی موقع تھا، مگر

اپنے موقف سے دلاور کبھی ہٹتے ہی نہیں
اس گھرانے کے قدم بڑھ کے پلٹتے ہی نہیں

عشق کے ہاتھ میں تھی جن کے ارادوں کی زمام — گوشۂ اَمن میں ملتا نہیں اُن کو آرام
بڑھے رد کر کے طرماح کی دعوت کو اِمام — لے کے موت آئی حیاتِ اَبدی کا پیغام

جادۂ عزم مُڑا کرب و بلا کی جانب
سر بکف عشق چلا کوئے وفا کی جانب

دوسری ماہِ محرّم کو ہوا ختم سفر     چلتے چلتے ہوئی اِک دشت پہ آفت میں سحر
علقمہ پر جو پڑی سیّدِ والا کی نظر     آپ نے چہرۂ عباسؑ کو دیکھا مڑ کر

ہنس کے فرمایا کہ لو آ گئی منزل بھائی
امتحاں گاہِ وفا ہے یہی ساحل بھائی

ہاں سنو! چرخ سے آوازِ بکا آتی ہے     گریۂ بنتِ پیمبرؐ کی صدا آتی ہے
خلد سے کان میں نانا کی دعا آتی ہے     دشت میں گلشنِ جنّت کی ہوا آتی ہے

اپنا حق بہرِ لہو مانگ رہی ہے مجھ سے
یہ زمیں میرا لہو مانگ رہی ہے مجھ سے

ہم کو آگے نہیں جانا ہے اب اس صحرا سے     قافلہ باگ پھرائے گا یہیں دُنیا سے
بچّے میرے اِسی ساحل پہ رہیں گے پیاسے     ایک قطرہ نہ ملے گا انھیں اِس دریا سے

مُنکشف مجھ پہ ہے حالات کی صورت بھیّا!
ہو مبارک تمھیں سقّائی کی خدمت بھیّا!

میں سمجھتا ہوں معتمد کا اشارا عباسؑ     میری آنکھوں میں ہے انجام تمھارا عباسؑ
ہاں! تمھیں ایک ہو مرنے کے سہارا عباسؑ     چھین لے گا تمھیں دریا کا کنارا عباسؑ

اور میں کیا کہوں تکمیلِ وفا ہوگی یہیں
سُنّتِ جعفرِ طیّار ادا ہوگی یہیں

یہ خبر دی ہے شہِ عقدہ کُشا نے عباسؑ     ہوں گے تاریخِ وفا تیرے فسانے عباسؑ
تجھ کو بخشا ہے عَلَم اپنا، خدا نے عباسؑ     لنگرِ کشتیِ دیں ہیں ترے شانے عباسؑ

نُصرتِ حق میں ہے تعجیل ابھی سے اِن کو
چومتے رہتے ہیں جبریلؑ ابھی سے اِن کو

تم جو ہوتے تو مری لاش اٹھاتے بھائی　　بیچ رستے میں مجھے چھوڑ نہ جاتے بھائی
اپنی چھاتی پہ سکینہ کو سلاتے بھائی　　اس کو اعدا کے طمانچوں سے بچاتے بھائی
مگر افسوس ! یہ اللہ کو منظور نہیں
تیز ہے قافلۂ وقت اجل دُور نہیں

دیکھتا ہوں میں ابھی سے کہ ستم کے آثار　　اُٹھ رہا ہے دلِ گیتی سے قیامت کا غبار
خیمۂ آلِ نبیؐ لوٹ رہے ہیں اشرار　　اور ترائی میں ہو تم ، مشکِ سکینہ بکنار
یوں تو سب کا وہ مُعینُ الضُعفا حافظ ہے
مگر اب چادرِ زینبؑ کا خدا حافظ ہے

خیر ہر مرحلہ آسان گذر جائے گا　　غم نہیں حفظِ شریعت میں جو سر جائے گا
خوں بہے گا تو یہ طوفان ٹھہر جائے گا　　چہرۂ دینِ نبیؐ اور نکھر جائے گا
روئے اسلام کو گل رنگ بنانے کے لئے
ہاں بڑھو خون کے دریا میں نہانے کے لئے

سروری ہم سے ہے دنیا میں سیادت ہم سے　　آج قائم ہے تو معیارِ شرافت ہم سے
سُرخرو کیوں نہ ہو میدانِ شہادت ہم سے　　تا ابد جائے گا فیضانِ رسالت ہم سے
خلق میں رازِ مشیت کے امیں ہیں ہم لوگ
وجہِ تخلیقِ جہاں ، نورِ یقیں ہیں ہم لوگ

حکم سرور سے رُکا قافلۂ اہلِ ہمم　　گڑ گیا بامِ ہدایت پہ محمدؐ کا علَم
دشت میں پھیل گئی نکہتِ گلزارِ ارم　　خاک نے چوم لئے قبلۂ عالم کے قدم
قائدِ موقفِ ایماں سرِ میداں پہنچا
حزبِ اللہ لئے حامیِ قرآں پہنچا

سو سے بھی کم تھے سعیانِ شہادت انجام     اور اُدھر حدِ تعین سے فزوں لشکرِ شام
پُشت پر جبر و شقاوت کی حکومت کا نظام     فاتحِ گردشِ دوراں تری ہمت کو سلام
رکھ کے دل سینۂ اربابِ وِلا میں تو نے
پھونک دی رُوح نئی ارض و سما میں تو نے

آنکھ کے سامنے تھی قلتِ ساماں ہر چند     تو کہ تھا باعثِ ایجادِ جہاں کا دلبند
تیرے بازو تھے قوی، تیرے عزائم تھے بلند     بے مثالی کا نمونہ تھے عزیز و فرزند
کس کو ہاتھ آئیں گے جیسے تجھے انصار ملے
بولتے عزم، گرجتے ہوئے کردار ملے

تیرے دامن کی ہوا ضامنِ تطہیرِ حیات     تیرے چہرے کی ضیا آئینۂ ذات و صفات
تیرے انفاس میں ہے نکہتِ گلزارِ نجات     منحصر تیرے اشارے پہ ہے عالم کا ثبات
خاک اور خون میں ہاں قافلہ غلطاں ہو جائے
بخششِ اُمتِ مرحوم کا ساماں ہو جائے

شاہدِ قوتِ ایماں ترا عزمِ بیباک     از اُفق تا بہ اُفق ہے ترے انکار کی دھاک
دیکھ لے آج یہ منظر بھی نگاہِ افلاک     اِس طرح جلتی ہے طوفانوں میں شمعِ ادراک
جو نظر یافتۂ علم و یقیں ہوتے ہیں
اُن کے قبضے میں زمان اور زمیں ہوتے ہیں

میرے مولا تری جانبازی و ہمت کے نثار     تیرے اس جذبۂ انصاف و عدالت کے نثار
تیرے ایثار کے قربان، شہادت کے نثار     مختصر فوج کی اس ہمت و جرأت کے نثار
بات کرتے ہیں تو بجلی سی چمک جاتی ہے
اِن کے قدموں کی دھمک تا بفلک جاتی ہے

دوش پہ اِن کے ہے گویا بارِ امانت بھاری — ایک اِک خون کے قطرے میں ہیں دریا جاری
اُن کی جانب نگراں خود ہے جنابِ باری — اِن کی قلت سے ہے کثرت پہ وہ دہشت طاری
کہ انہیں دیکھ کے دل سب کے ہلے جاتے ہیں
حوصلے خاک میں اعدا کے ملے جاتے ہیں

کربلا میں جو بڑھی تیرگیٔ لشکرِ شوم — چار جانب سے سمٹنے لگا باطل کا ہجوم
تیسری ماہِ محرّم کو ہوا یہ معلوم — دشت میں آمدِ سرکردۂ لشکر کی ہے دھوم
تیوریاں وقت نے بدلیں پسرِ سعد آیا
شمرِ تنبیہ کو اُس کی کئی دن بعد آیا

اُس کا آنا تھا کہ رفتارِ ستم تیز ہوئی — خاکِ میدانِ دغا کی شرر انگیز ہوئی
خطِ تاکیدِ بلا، فوج جنوں خیز ہوئی — طبعِ گرمِ پسرِ سعد کو مہمیز ہوئی
حملہ باطل نے کیا شاہِ امم سے پہلے
حالِ نیت کا کھلا روزِ دہم سے پہلے

آلِ ہاشم کو جو تھا کفر نہادوں سے عناد — چاہتے تھے کہ زمانے میں وہ برپا ہو فساد
جس سے کمزور ہو تعلیمِ نبیؐ کی بنیاد — کر دیں اسلام کے معمار کی محنت برباد
اِسی جذبے نے کیا برسرِ پیکار انھیں
نہ رہا رسمِ شرافت سے سروکار انھیں

جب یہ اندازِ نظر کفر کا دستور ہوا — قاسمِ نار و جناں جنگ پہ مجبور ہوا
سجدۂ راہِ وفا شاہ کو منظور ہوا — طالبِ مہلتِ شب سرورِ جمہور ہوا
قصد تھا رات عبادت میں گزاری جائے
دینِ اسلام کی تقدیر سنواری جائے

شمعیں گُل کر کے مخاطب ہوئے باصدق وصفا — مجملاً آپ کے پیغام کا مفہوم یہ تھا
میں نے بیعت سے عزیزو تمہیں آزاد کیا — امتحاں کے لئے باقی ہوں فقط میں تنہا
قوتِ جسمِ علیؑ، ذہنِ نبیؐ رکھتا ہوں
فاتحِ نفس ہوں ایمان قوی رکھتا ہوں

ہاں یہ سچ ہے کہ وفادار ہیں میرے انصار — اقربا بھی ہیں مرے مستعد و نیک شعار
سب رفیقوں سے ہے بہتر بھی یہی میرا اصرار — ساتھیو! مرگِ یقینی سے ہو تم لوگ دوچار
بحرِ عصیاں میں نہ ڈوبو گے نہ شرماؤ گے
میں شکایت نہ کروں گا جو چلے جاؤ گے

سُن کے آقا کے اِس ارشاد کو اُٹھے عباسؑ — ہم زباں اُن کے ہوئے شاہ کے سب رُتبہ شناس
اِس طرح ڈھل گیا الفاظ میں اُن کا احساس — مالکِ ہر دوسرا، بادشہِ عرش اساس
چھوڑ کر ہم درِ رحمت کو کدھر جائیں گے
ہیں جانباز گلے کاٹ کے مر جائیں گے

روزِ بد ایسا نہ اللہ کرے ہم کو نصیب — کہ اِن آنکھوں میں نہ باقی رہے تنویرِ حبیب
دستگیرِ غربا، آپ کے شیدا ہیں غریب — سرفروشی میں مگر اِن کے عزائم ہیں عجیب
چاہتے ہیں کہ جگر نیزوں پہ رکھ کر مر جائیں
حشر تک اُسوۂ شبیرؑ کو روشن کر جائیں

ترجمانِ دلِ عباسؑ تھا یہ عزمِ جلیل — ہر طرف سے ہوئی اقرارِ وفا میں تعجیل
بہرِ تائید وہ اُٹھے کہ نہ تھا جن کا عدیل — جذبۂ شوق سے سرشار تھی اولادِ عقیل
سب کی خواہش تھی کہ قربانِ شہِ دیں ہو جائیں
ریش و ملبوس و کفن، خون سے رنگیں ہو جائیں

کیسے جانباز تھے، کیا جوش تھا، کیسا آقا پَیر جائیں ہو اگر آگ کا حائل دریا
ٹھان لیں دل میں تو دُنیا کا بدل دیں نقشا عزم و ہمت کے دھنی، پیکرِ تسلیم و رضا
موت سی چیز کو خاطر میں نہ لانے والے
دے کے سَر نازِ مشیّت کے اُٹھانے والے

سب کے سب محوِ عبادت رہے عاشور کی رات جگمگاتا رہا تقدیس سے ایوانِ حیات
بیچ کر اپنی خوشی، مرضیِ معبود کی بات دے گئے تیغ کے سائے میں عبادت کو ثبات
مُستعد ہو گئے سب جان سے جانے کے لئے
مَوت کو بڑھ کے کلیجے سے لگانے کے لئے

رات بھر اپنے مُصلّوں پہ رہے سب جانباز اپنے مولا سے رہا تا بسحر راز و نیاز
مطمئن تھے کہ ادا ہو گئی بے لوث نماز یک بیک آئی جو اکبرؑ کی اذاں کی آواز
دَورِ اک ختم ہوا، دوسرا آغاز ہُوا
جلوۂ صبح نئے عہد کا دمساز ہُوا

شبنم افشاں جو ہوئی باغِ حُسینی میں نسیم چار سو پھیل گئی عطرِ عقیدت کی شمیم
طاعتِ صبح میں یکجا ہوئے حضرت کے ندیم بجگر داری انصارِ رسولانِ قدیم
مطمئن ہو کے مُصلّوں سے وہ دیندار اُٹھے
خندہ رُو اپنی شہادت کے طلبگار اُٹھے

مثلِ طوفانِ بلا سامنے تھا لشکرِ شرّ چرخ پہ لرزہ بر اندام تھے آثارِ سحر
داغِ پیشانیِ اسلام، یزیدی افسر کوئی حجّاج کا بیٹا، کوئی ربعی کا پسر
بر سرِ جَور کوئی رَے کی حکومت کے لئے
آتش افشاں کوئی تکمیلِ عداوت کے لئے

آندھیاں چلتے میں روشن ہوئی یہ شمعِ ہُدا      جنگ سے قبل دہن بہرِ مناجات کھُلا
مدعا مختصراً سیدِ والا کا یہ تھا      میرے معبود تجھی پر ہے بھروسا میرا

آفتوں میں دلِ بیکس کا سہارا تُو ہے
لَو لگائی ہے تجھی سے کہ ہمارا تُو ہے

التجا یہ ہے کہ اے مرکزِ احسان و کرم      ابتلا گاہ میں بڑھتے ہی رہیں میرے قدم
جذبۂ صبر و رضا ہو نہ کسی حال میں کم      میرے احباب کو بھی دے مری ہمت، مرا دَم

حفظِ توحید کے جذبے میں شہادت پائیں
تیرا سایہ، تری قربت، تری رحمت پائیں

کہہ کے یہ آپ نے ترتیب دی چھوٹی سی سپاہ      جس کا ہر فرد تھا تہذیب و شرافت کا ماہ
وہ حبیب اور وہ بنِ قینِ حقیقت آگاہ      باوفا عونؑ و محمدؑ سے دلیر و ذی جاہ

جلوہ افگن، کہیں اکبرؑ تھا، کہیں قاسمؑ تھے
حاملِ رایتِ حق، ماہِ بنی ہاشمؑ تھے

بعدِ ترتیبِ سپہ، آئے ہدایت کے لئے      بارشِ نطق ہوئی آخری حجت کے لئے
لب گہر ریز ہوئے کشفِ حقیقت کے لئے      جن میں تبلیغ تھی توحید و عدالت کے لئے

اپنے رشتے کا بیاں آخری پیغمبرؐ سے
اعتراف اُس کا جو پایا تھا نبیؐ کے دَر سے

اسی انداز سے جاری رہی تقریر تمام      جس کے ہر لفظ میں تھا حسنِ عمل کا پیغام
کس کی ہمت تھی کہ ہو قاطعِ برہانِ امامؑ      سر ندامت سے جھکائے ہوئے تھا لشکرِ شام

سُننے والوں میں پرستارِ خدا کوئی نہ تھا
لشکرِ شوم میں اِک حُرؑ کے سوا کوئی نہ تھا

حُر کہ تھا شاہدِ اخلاقِ جنابِ شبیرؑ　　جانتا تھا کہ یہ ہیں مُصحفِ حق کی تفسیر
اِن کا کردار ہے اوصافِ نبیؐ کی تصویر　　کر گئی دل پہ اثر اُس کے حسینؑ کی تقریر
مضطرب ہو کے سوئے سیّدِ ابرار چلا
نام حُر تھا تو پئے نصرتِ احرار چلا

اُس کا آنا تھا کہ میدان سے تیر آنے لگے　　تیر کیا ظُلم و شقاوت کے سفیر آنے لگے
نذرِ جاں لے کے یہاں اہلِ ضمیر آنے لگے　　نصرتِ حق کو صغیر اور کبیر آنے لگے
تھا مقدر میں مگر حُر کے ہراول ہونا
ہاں اسے کہتے ہیں دعوے کا مُدلّل ہونا

بعدِ انصار عزیزانِ گرامی نکلے　　چشمِ افلاک میں یکتا تھے جو نامی نکلے
جن کی سیرت میں نہ تھی نام کو خامی نکلے　　پرتوِ سیّدِ مکّی و تہامی نکلے
جلوہ ہر شخص میں تھا قوّتِ ایمانی کا
علی اصغرؑ پہ ہوا خاتمہ قربانی کا

دفنِ اصغرؑ سے جو شبیرؑ نے فرصت پائی　　چہرۂ سیّدِ عالی پہ بحالی چھائی
جس پہ قرباں دو جہاں ہاتھ وہ دولت آئی　　مُدّتِ تکمیلِ نبوّت کی بشارت لائی
آپ خیمے میں گئے آخری رخصت کے لئے
مشورے بھی دیئے عابدؑ کو قیادت کے لئے

سب کو تسکین دی اور سب کو تسلّی کے پیام　　مطمئن ہو کے برآمد ہوئے خیمے سے امامؑ
ہُو کا عالم تھا کہ خالی تھے رفیقوں کے خیام　　نہ پسر تھے، نہ برادر، نہ مصاحب، نہ غلام
چار سُو دشت میں ظلمت کی گھٹا چھائی تھی
جس میں یکتائی کا عالم تھا وہ تنہائی تھی

رنگ لایا تھا عجب فوجِ ستمگر کا جنوں — کہیں بکھرے ہوئے لاشے، کہیں بہتا ہوا خوں
بے کفن صاحبِ عزت تھے، حمیت مدفوں — گھر تھا برباد مگر ذوق و وفا تھا ممنوں
شکر اس کا کہ ہوئے ہدیۂ نصرت مقبول
آرزو یہ کہ ہو میری بھی شہادت مقبول

لیکن اظہارِ شجاعت پئے تکمیلِ جہاد — ابھی باقی تھا بآئینِ ہدایت بنیاد
موجزن خون میں تھی جرأتِ خونِ اجداد — حمزہؓ و جعفرؓ و حیدرؓ کے مہمات تھے یاد
جگمگاتی تھی سرِ ذہن، نبیؐ کی تصویر
اور درخشاں تھی نگاہوں میں علیؑ کی تصویر

فرض تھا آپ پہ بھی منصبِ شمشیر زنی — مضطرب قلب میں تھا جذبۂ خیبر شکنی
زیرِ ملبوس تھی پوشیدہ جو بُردِ یمنی — اس کو چار آئینہ کہہ لو کہ سمجھ لو کفنی
جذبۂ فرض بڑھا صاعقۂ جاں بن کر
دبدبہ ساتھ تھا چترِ سرِ ایماں بن کر

چہرۂ پاک میں تھا شوقِ عبادت کا جمال — رُعب آنکھوں سے تو چتون سے ٹپکتا تھا جلال
قوتِ قلب کا اللہ نے بخشا تھا کمال — پشت پر روحِ علیؑ محوِ دعائے اقبال
اپنے نانا سے شجاعت کی سند پائے ہوئے
حفظِ دیں کے لئے مرنے کی قسم کھائے ہوئے

عشق تھا دین سے اور ربط تھا ایمان کے ساتھ — تیغ پہلو میں، نظر فوج پہ، عَلم جان کے ساتھ
عشق ایثار کو نکلا تھا بڑی شان کے ساتھ — جو قدم اٹھتا تھا، اٹھتا تھا وہ ایقان کے ساتھ
قربِ حق کہتا تھا اب فاصلہ کم باقی ہے
مطمئن دل تھا کہ بس ایک قدم باقی ہے

سامنے آئے ذرا حافظۂ انسانی　　　لائے تو ڈھونڈ کے اس نوع کی اک قربانی
بندیوں ساری جماعت پہ ہُوا ہو پانی　　　اور آفات کی ہو چار طرف طغیانی
امتحاں گاہ میں ہر فرد اٹل ہو جائے
تیغ کھینچے تو عدو صیدِ اجل ہو جائے

ظلمتیں کانپ کے کہتی ہیں حسینؑ آتے ہیں　　　یا پیمبر ہو پئے تسخیرِ حُنین آتے ہیں
بجلیاں گرتی ہیں بازینت وزین آتے ہیں　　　طُور تک غُل ہے کہ نُورِ حرمین آتے ہیں
چار سو چہرۂ انور کی ضیا پھیلی ہے
سامنے جس کے شعاعوں کی ردا مَیلی ہے

خانۂ زینِ فرس مطلعِ انوار جو تھا　　　تابشِ حُسن سے ساکت ہوئی میداں کی فضا
گردنے پھٹ کے دیا سیلِ ضیا کو رستا　　　نُورِ امامت کا لئے اسپ نمودار ہُوا
تھی ہواؤں کو ہوس مروحہ جُنبانی کی
شان رہوار میں تھی تختِ سُلیمانی کی

مثلِ شہباز زمیں پر اُتر آیا توسن　　　اُٹھ کے ذرات نے سُبد یز کا چُوما دامن
بہرِ ابلاغِ رجز آپ نے کھولا جو دہن　　　شمعِ اسلام ہوئی دشتِ وغا میں روشن
اپنے اسلاف کی تفضیل وشرف کی باتیں
حق پرستی میں شہنشاہِ نجف کی باتیں

بالخصوص اُلفتِ سرکارِ رسولُ الثقلین　　　دلِ سلطانِ رسالت سے وہ قُربِ حسنینؑ
جاں فشانیِ علیؑ بدر و اُحد کے مابین　　　حُسنِ تدبیر سرِ خیبر و صفین و حُنین
اپنے بھائی کی شرافت کا کرامت کا بیاں
اپنی معصومی و حق بینی وطاعت کا بیاں

اِس کا اظہار کہ ہم ہیں رہِ عرفاں کے امیر ہم کو اللہ نے بخشا ہے وہ تابندہ ضمیر
جس کے معیار پہ یکساں ہیں سریر اور حصیر قربت اللہ کا اعزاز ہے دوری تحقیر
تم سمجھتے ہو کہ تم نے ہمیں ذلت دی ہے
واقعہ یہ ہے کہ اللہ نے عزت دی ہے

ایسی عزت جو مقدر ہے مرے نام کے ساتھ تا ابد جائے گی لپٹی ہوئی پیغام کے ساتھ
حوصلے کھیلتے ہیں گردشِ ایام کے ساتھ میں بھی اب زندۂ جاوید ہوں اسلام کے ساتھ
راہِ ایثار میں یہ کام کیا ہے میں نے
بہرِ حق خونِ بہتّر کا دیا ہے میں نے

اب سرِ دوش فقط ایک ہی سر باقی ہے اِس کو بھی خنجرِ جلّاد کی مشتاقی ہے
عِلم میرا رہِ معبود میں اطلاقی ہے ذرّہ ذرّہ مرے پیغام کا اخلاقی ہے
چاہتا ہوں کہ ہر اک فرض ادا کر جاؤں
گردِ پا بھی نہ ملے موت کو یوں مر جاؤں

سخنِ حق پہ جو اعدا کو نہ مائل پایا موت نے قبضۂ شمشیرِ قضا کو چوما
قوّتِ صدق نے باطل کو کیا یوں پسپا موجزن چار طرف ہو گئے خوں کے دریا
ایک تلوار کے قبضے میں جو تھیں دھاریں دو
ایک اِک وار میں چلنے لگیں تلواریں دو

دیر تک جنگ کی وہ گرمیِ بازار رہی منزلِ مرگ میں کتنوں کی سواری پہنچی
تنِ تنہا پہ نہ غالب ہوا جب کوئی شقی کھلبلی بہرِ اماں لشکرِ اظلم میں پڑی
کس میں تھی جان کہ حضرت کے مقابل ہوتا
کون ضربِ شہِ دیں کا متحمل ہوتا

شرم سے شمر کے ماتھے پہ پسینہ آیا بدحواسی میں اِدھر، گاہ اُدھر چلّایا
اس کو جھڑکا، اُسے ڈانٹا، تو اُسے گرمایا صفِ اوّل سے سواروں کو عقب میں لایا
پشت سے آگے بڑھایا قدر اندازوں کو
آگ میں جھونک دیا اپنے کماں بازوں کو

شمر کے حکم سے ہونے لگی بارانِ تیر ہدفِ ظلم ہوئے پھر تو جنابِ شبیرؑ
ہو کے مجبور بڑھے آپ بھی لے کر شمشیر جس طرف رُخ کیا، بجھ بجھ گئی فوجوں کی بھیر
تیر پیوست تھے گو جسم میں ساہی کی طرح
جوش بڑھتا ہی گیا شیرِ الٰہی کی طرح

یا علیؑ لب پہ تھا اور ہاتھ میں تیغِ بُرّاں تھی پڑی گردنِ رہوار پہ، آزاد عناں
کر سمجھتا تھا فرس دل کے اشاروں کا بیاں تیغ اور اسپ نے مل کر وہ اُٹھایا طوفاں
جس نے دم بند کئے سب ستم ایجادوں کے
ٹھوکریں کھاتے تھے سر دشت میں جلادوں کے

تین حملے شہِ والا نے کیے لاثانی جن سے آئی سرِ افواجِ ستم طغیانی
جن میں اونچا ہوا کفار کے سر سے پانی جن کی ہے صفحۂ تاریخ میں زرافشانی
کس میں ہمت تھی یہ دور رونذ کے پیاسے کے سوا
سرخرو کون ہے احمدؐ کے نواسے کے سوا

سایۂ تیغ یداللہ تھا یا قہرِ خدا برق گرتی تھی جدھر اُٹھتی تھی گھنگھور گھٹا
فرسِ تیز قدم صورتِ تصویرِ فنا آئینہ موت کا دکھلا گیا جس سمت گیا
جس طرف بڑھ گئے لاکھوں کو گرا کر پلٹے
خونِ کفار سے طوفان اُٹھا کر پلٹے

لڑتے لڑتے گئے اک بار جو دریا کی طرف    دم بخود ہو گئے خود خوف سے طبل و نے و دف
سجدہ ریز خمِ شمشیر ہوئی صف پر صف    پائے شبدیز نے پامال کئے کتنے ہدف
کامراں نہر سے یوں سرورِ ذی جاہ پھرے
نہرواں جیت کے جیسے اسد اللہ پھرے

خوف سے چار طرف پھیل گیا تھا لشکر    پسِ انبوہ کھڑے کانپتے تھے شمر و عمر
ذوالفقار اپنے دکھاتی تھی جو ہیم جوہر    فوجِ کفار کا ہو جاتا تھا دفتر ابتر
پاؤں جب رک نہ سکے اپنے ستمگاروں سے
جا کے ٹکرائی جبیں کوفے کی دیواروں سے

ہر طرف خوں کے دریڑے تھے سروں کے انبار    تھا، نہ اندازۂ اموات نہ کشتوں کا شمار
جوئے خوں جوش میں تھی سرخ تھے سارے اشجار    ارغوانی تھا جو میدان سے اٹھتا تھا غبار
تیغ رنگیں سے جدھر خون رواں ہوتا تھا
ریگ پر چادرِ گلگوں کا گماں ہوتا تھا

عصر تک آپ کے ہاتھوں میں وہی زور رہا    ضربِ شمشیرِ دو پیکر کا وہی شور رہا
دیدۂ دیوِ ستم، خیرہ رہا، کور رہا    فوج کا ہونٹوں پہ دم، تا بہ لبِ گور رہا
جب بہت یادِ خدا قلب کو تڑپانے لگی
پیشوائی کو جناں سے بھی ہوا آنے لگی

نظر آتے تھے نہ تا حدِ نظر ظلم شعار    سر کیا جنگِ وفا، کی کو ترو کا رہوار
خونِ رخ صاف کیا، میاں میں رکھی تلوار    فدیۂ خاص کی صورت کیا خود کو طیار
سر جھکا، مرگِ محبت کی پذیرائی میں
چار چاند اور لگے حسن کی یکتائی میں

دیکھ کر تیغِ یداللہ سے آبادِ نیام
پھر سے آندھی کی طرح ٹوٹ پڑا لشکرِ شام
گھر گئے فوج کے نرغے میں شہنشاہِ انام
ہاتھ اٹھا کر کیا کفار کے نیزوں نے سلام

سائے میں لے لیا فولاد کی دیواروں نے
جسمِ معصوم پہ سجدے کیے تلواروں نے

ایک جاں لینے کو تھے کتنے ستمگر طیار
کہیں برچھے، کہیں تیغے، کہیں خنجر طیار
سنگدل گو پھینٹوں میں رکھے تھے پتھر طیار
امتحاں کے لئے مولا تھے سراسر طیار

دل تھا بے چین، فقط سجدۂ طاعت کے لئے
وقت درکار تھا کچھ حق کی عبادت کے لئے

زرعہ کی تیغ تھی یا ابنِ انس کا نیزا
موت کا دستِ خطا کار نے پیغام دیا
ضرب کے بعد جو رہوار پہ سنبھلا نہ گیا
ہاتھ رعشے نے، نقاہت نے قدم کو چوما

مدعا تھا کہ یہیں اک نئی جنت بن جائے
یہ زمیں کعبۂ عرفان و ہدایت بن جائے

جھک گئے سجدۂ خالق میں شہِ عرش نشیں
تھرتھرانے لگے افلاک، لرز اٹھی زمیں
نکلے محبوبِ خدا چھوڑ کے فردوس بریں
پہنچے جب دشت میں حلقوم پہ تھا خنجرِ کیں

اپنے خورشید کو میدان میں ڈھلتے دیکھا
ابرِ خوں سے نئے سورج کو نکلتے دیکھا

مرحبا! مرتبۂ منزلِ ایثارِ حسینؑ
حشر تک پھیل گیا حلقۂ پرکارِ حسینؑ
کربلا سلسلۂ پیکرِ کردارِ حسینؑ
دینِ اسلام ہے اب جلوۂ دیدارِ حسینؑ

اِن سے بیگانگی، ایمان سے محرومی ہے
یہ نہ تسلیم کرے جو وہی بس شومی ہے

فدیۂ راہِ ہدایت ، تری عظمت کو سلام　　تیرے ایمان و عقیدت، تری طاقت کو سلام
عابدؑ و زینبؑ و کلثومؑ کی ہمت کو سلام　　مختصر یہ ہے کہ اُس گھر کی قیادت کو سلام

جس میں قائم ہوا اک سلسلہ قربانی کا
ماحصل جس کو کہیں عظمتِ انسانی کا

اپنی اُمت کو بھی کچھ عظمتِ انسانی دے　　زنگ کھائی ہوئی تلوار کو تابانی دے
اِس ستارے کو بھی توفیقِ درخشانی دے　　ناتواں قوم کو پھر قوتِ ایمانی دے

دے کے سرٗ دین کی تقدیر بنانے والے
عَلَمِ عظمتِ اَخلاق اُٹھانے والے

اے چراغِ نبویؐ، صولتِ فکرِ بشری　　قابلِ غور ہے آفاق کی یہ فتنہ گری
کہ ہے صرصر کے تھپیڑوں میں چراغِ خضریؑ　　شعلۂ دل نہ بُجھا دے کہیں آنکھوں کی تری

ریگِ آوارہ کی جھولی میں ستارے بھر دے
میرے بہتے ہوئے اشکوں کو ستارے کر دے

بے عمل قوم میں حسرت کی فراوانی ہے　　نہ شجاعت، نہ جرات، نہ جہانبانی ہے
حوصلے پر ترے تاریخ کو حیرانی ہے　　ہم کو بھی دیکھ کہ کیا کربِ گراں جانی ہے

درس دے ہم کو کہ دنیا کو ہلا دیں ہم لوگ
آگ بہتے ہوئے پانی میں لگا دیں ہم لوگ

توڑ دیں بُت کدۂ نخوت و پندار و غرور　　جوڑ دیں شیشۂ بشکستۂ احساس و شعور
چھوڑ دیں عادتِ فتنہ گری و بغض و فتور　　ڈال دیں گنبدِ دَوراں پہ کمندیں تا دُور

عَلَمِ عظمتِ کردار اُٹھا کر نکلیں
تیرے پیغام کو تحریک بنا کر نکلیں

گونج اُٹھے ولولۂ شوق سے ایوانِ حیات — جاگ اُٹھیں نعرۂ تکبیر سے ارکانِ حیات
شعلۂ دل سے نکھر جائے شبستانِ حیات — ثبت ہو جائے رُخِ موت پہ عنوانِ حیات
وقت کو پائے سعادت پہ جھکا کر چھوڑیں
دہر کو راہِ حقیقت پہ لگا کر چھوڑیں

صفدرِ لشکرِ افکار بس اب روک قلم — شوکتِ علم و اَدب ہے ترا اندازِ رقم
طبعِ رنگیں نے دکھلائے تری کیا کیا عالَم — تیری اعجاز بیانی کے پرستار ہیں ہم
فکر کے سائے میں چلتی ہوئی تلوار رہے
ہاں یہی، سازِ قلم کی یہی جھنکار رہے

پیش کر خدمتِ آقا میں باخلاصِ تمام — یہ مئے فکر و تخیّل کا چھلکتا ہوا جام
التجا کر کہ بفیضِ نظرِ خاصِ امام — فکر کو میری ملے قوّتِ پروازِ دوام
خاتمِ شعر کا ہر لفظ نگیں بن جائے
فرشِ قرطاس مرا عرشِ بریں بن جائے

مرثیہ نمبر ۵

# مقامِ شبیرؑ

میں ہوں خدیوِ سخن میرِ کاروانِ سخن

دربیانِ صولت و شہادتِ سبطِ پیغمبرؐ

بند ۸۳

تاریخِ تصنیف ـــــــ ۱۹۷۱ء

# سلام

علیؑ کے وصف جو بالالتزام کہتے ہیں
فرشتے اُن کو خدا کا سلام کہتے ہیں

کمالِ چاردہ معصوم کا نہ پوچھ کہ چاند
ہو چودھویں کا تو ماہِ تمام کہتے ہیں

جو روشنی ہو تو نام اُس کا کربلا کے فیوض
جو تیرگی ہو تو آثارِ شام کہتے ہیں

وہ دل جو کوزۂ گِل، خاکِ کربلا سے بنا
اُسی کو ہم مئے عرفاں کا جام کہتے ہیں

مرے کلام کو پیرِ مغاں کے در سے ملی
وہ کیفیت جسے لُطفِ کلام کہتے ہیں

یہ ساحلوں کے لبِ خشک، تشنگانِ فرات!
تمہاری تشنہ لبی کو سلام کہتے ہیں

جو سر جھکا دے وہ ماموم ہے امام نہیں
جو سر کٹا دے اُسی کو امام کہتے ہیں

حسینیت کی ہے بنیاد سرفرازیِ عزم
سرافگنی کو یزیدی نظام کہتے ہیں

بہن حسینؑ کی بھائی سمجھ کے روئیں اُسے
وہ جَون جس کو مورخ غلام کہتے ہیں

ملی ہے جب سے یہ معراجِ منبری صفدرؔ
ہم اپنی فکر کو عالی مقام کہتے ہیں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

میں ہوں خدیوِ سخن میرِ کاروانِ سخن　　　ہر اک نفس ہے مرا بادِ بوستانِ سخن
حریمِ اہلِ خرد میرا آستانِ سخن　　　مرے دیار کے ذرّے ہیں کہکشانِ سخن

جو میری طبعِ رسا بانکپن پہ ڈھلتی ہے
تو آسمانِ سخن پر دھنک نکلتی ہے

پیمبری سے مری فکر کو ملا ہے نسب　　　نزولِ وحی کا پرتو ہے میری جنبشِ لب
پیامِ امن و مساوات ہے مرا مشرب　　　مرے حضور مؤدب ہیں عاملانِ ادب

غرورِ دانش و تقویٰ کو توڑتا ہوں میں
کہ پتھروں سے بھی پانی نچوڑتا ہوں میں

نہ پوچھ میرے تخیّل کی حد کہاں تک ہے　　　جہاں خرد کی رسائی نہیں وہاں تک ہے
مری خودی کی نظر گاہ لامکاں تک ہے　　　درازدستِ جنوں شاخِ کہکشاں تک ہے

کہ سطحِ نطق جہاں تک قریب لا کے اُسے
ستارے توڑ رہا ہوں جھکا جھکا کے اُسے

سخن کے ہم ہیں مدبّر سخن ہمارا ہے　　　ہمیں نے گیسوئے الہام کو سنوارا ہے
یہ مرثیہ نہیں طوفاں کا استعارا ہے　　　یہ بیت بحرِ تجلّی کا ایک دھارا ہے

مرا سفینہ کہ ہے تیز ماہ و اختر سے
لبِ فرات تک آئے گا بہہ کے کوثر سے

سلام اے مری کشتی کے ناخدا ساقی! مئے محبت پیرِ مغاں لنڈھا ساقی!
ہے تو ہی منزلِ عرفاں کا رہنما ساقی! مرے دماغ کو اپنا سبو بنا ساقی!
یہ ولولہ ہے تصدق ترے فسانے کا
کہ پی رہا ہوں مگر شوق ہے پلانے کا

اُنڈیل اتنی کہ سب کو چھکا چھکا کے پلاؤں جو تشنہ کام ہیں اُن کو بُلا بُلا کے پلاؤں
تری عطا کے فسانے سُنا سُنا کے پلاؤں کبھی حرم میں کبھی بتکدے میں جا کے پلاؤں
بڑھا دے کیف مرے جذبۂ عوامی کا
کہ مجھ پہ قرض ہے کہ دنیا کی تشنہ کامی کا

کھلا ہے دَر ترا، کیوں تشنگی بھٹکتی رہے مری نگاہ سے اک سرخوشی ٹپکتی رہے
صراحی میری مئے نور سے چمکتی رہے مرے پیالوں سے تیری عطا چھلکتی رہے
دلوں کی پیاس بجھائے مرا بیاں ساقی
ترے کرم سے یہ دریا رہے رواں ساقی

زلالِ میکدۂ اعتبار کیا مانگوں شرابِ عقل کا ذہنی فشار کیا مانگوں
ترا گدا ہوں مئے اقتدار کیا مانگوں نہ رکھے ہوش میں جس کا خمار کیا مانگوں
یہ کیوں کہوں کہ مجھے کیسۂ امیری دے
فقیرِ عشق ہوں اک کاسۂ غدیری دے

بجائے خوں ہے امانت تری بہ ہر رگ و پے چھپی نہیں ہے ترے رند سے حقیقتِ شے
نگاہِ عدل کی میزان میں برابر ہے ہزار دانۂ تسبیح، ایک قطرۂ مے
مرے یقین کا ہے فیصلہ شراب پلا
حساب ٹھیک اگر ہے تو بے حساب پلا

ترے کرم سے دریچے ہوئے ہیں ذہن کے باز — ترے کرم سے تخیّل ہیں آسماں پرواز
زبانِ اہلِ سخن، تیرا بولتا اعجاز — حریفِ بلبلِ سدرہ ہے بلبلِ شیراز
ملی جو تیری نیابت انیسؔ و غالبؔ کو
نیا سُرور ملا بادۂ مطالب کو

مرا یہ جوشِ سخن، مستیٔ شرابِ طہور — مری کشادہ دلی اس کی برکتوں کا ظہور
ترے کرم سے ملا مجھ کو اک لطیف شعور — اِک انبساطِ خودی، ایک تندرست غرور
مئے خرد میں، مئے عشق گھول دی تو نے
یہ جام دے کے مری آنکھ کھول دی تو نے

مئے سُرور سے چھلکے رنگیں ایاغ اپنا — سوادِ منزلِ سدرہ میں ہے دماغ اپنا
مرے جلو میں ہے سورج لئے چراغ اپنا — دکھا رہا ہے مجھے خُلد سبز باغ اپنا
مگر نگاہ مری ماسوا کو کیا دیکھے
خدا ہو دل میں تو عرشِ خدا کو کیا دیکھے

جو نشّے میں سرِ منبر یہ مدح خواں پہنچا — تو غُل ہوا مہ و انجم کا رازداں پہنچا
زمیں کی خاک تھا بالائے آسماں پہنچا — بفیضِ صاحبؐ معراج میں کہاں پہنچا
جہاں سے عرش کے تارے دکھائی دیتے ہیں
تجلّیوں کے اشارے دکھائی دیتے ہیں

میں دیکھتا ہوں کہ فطرت بدل رہی ہے نقاب — ہے تیرگی بھی حجاب اور روشنی بھی حجاب
میں دیکھتا ہوں کہ دریا بھی بن رہا ہے سراب — میں دیکھتا ہوں کہ جگنو سے دُور ہے مہتاب
مری نظر میں ہے ربطِ آفتاب و شبنم کا
میں دیکھتا ہوں ہبوط و صعود آدمؑ کا

میں دیکھتا ہوں سمندر کھنگالتا ہے کوئی  کمند اپنی ستاروں پہ ڈالتا ہے کوئی
قدم حدود سے باہر نکالتا ہے کوئی  خود اپنے پاؤں کی زنجیر ڈھالتا ہے کوئی
خودی جو اپنے لئے آئینے بناتی ہے
تو وحدت اُس کے لڑکپن پہ مُسکراتی ہے

میں دیکھتا ہوں تقاضائے ادعائے ظہور  میں دیکھتا ہوں تماشائے انکسار و غرور
میں دیکھتا ہوں کہ طوفاں اُگل رہا ہے تنور  میں دیکھتا ہوں کہ شعلہ فشاں ہے سینۂ طور
میں دیکھتا ہوں کہ روشن چراغِ یزداں ہیں
اور اُن کے سوز سے آتش کدے فروزاں ہیں

میں دیکھتا ہوں کہ سُلگا ہے سینۂ فاراں  اور اُس کی کوکھ سے اک آفتاب ہے تاباں
میں دیکھتا ہوں کہ وہ آفتاب ہے پنہاں  بھٹک رہی ہے اندھیرے میں قسمتِ انساں
ہے ماہتاب کے سینے میں اُس کی ضَو لیکن
کروڑوں آنکھوں میں بینا ہیں چند سَو لیکن

بہتر ان میں جو حاضر دکھائی دیتے ہیں  تو کربلا کے مناظر دکھائی دیتے ہیں
رہِ وفا کے مسافر دکھائی دیتے ہیں  زُہیر و ابنِ مظاہر دکھائی دیتے ہیں
کھلا ہے دیدۂ احساس دیکھتا ہوں میں
شکوہِ حضرتِ عباسؑ دیکھتا ہوں میں

میں دیکھتا ہوں کہ ہے پشت بارِ فرض سے خم  کہ اُس پہ مشکِ سکینہؑ ہے ہاتھ میں ہے علَم
جو نہر پر متحرک ہوا ہے پرچمِ  تو دیکھتے ہیں بھرے کی شان اہلِ حرم
سکینہؑ خوش ہے کہ میرے چچا اب آتے ہیں
مرے لئے جو بھری ہے وہ مشک لاتے ہیں

میں دیکھتا ہوں کہ جھکتا ہے دینِ حق کا نشاں
کہ گر رہی ہے چھدی مشک، گر رہا ہے جواں
جری کے دستِ بریدہ زمیں پہ ہیں جو تپاں
اُٹھا رہی ہیں اُنھیں چوم کر حسینؑ کی ماں
حسینؑ آئے ہیں چہرے پہ خاک ڈالے ہوئے
ہے نوجوان پسر باپ کو سنبھالے ہوئے

میں دیکھتا ہوں کہ شہزادۂ علی اکبرؑ
زمینِ گرم پہ لیٹے ہیں کھا کے زخمِ تبر
مقامِ شکر میں ہے سرنگوں ضعیف پدر
اور اس کے بعد ہے منظر اک اور پیشِ نظر
بنا رہا ہے کوئی طفلِ شیرخوار کی قبر
عرب کی غیرتِ قومی کی، اعتبار کی قبر

میں دیکھتا ہوں کہ مقتل میں بعدِ دفنِ پسر
کھڑا ہے مالکِ ملکِ رضا جھکائے سر
ہے اک قدم سوئے خیمہ، تو اک قدم ہے اُدھر
نظر سے جو دور سے آتی ہے تربتِ اصغرؑ
ربابؑ خیمے سے سینہ تپاں نکلتی ہیں
اب آنکھیں موند لو سیدانیاں نکلتی ہیں

بس اب مجاہدِ صبر و رضا جلال میں ہے
امامِ مسلکِ کرب و بلا جلال میں ہے
مسیحِ اُمتِ خیر الوریٰ جلال میں ہے
امینِ مرضیِ ربِ عُلیٰ جلال میں ہے
دلیلِ نُصرتِ حق بے نیام ہوتی ہے
خدا کی آخری حجت تمام ہوتی ہے

مُقربانِ خدا ایک سمت استادہ
صفِ انبیاء کی ثباتِ قدم کی دلدادہ
جنوں کے غول، برائے کمک ہیں آمادہ
ہوائیں منتظرِ حکم، پیش اُفتادہ
مگر کسی کی اعانت کا اب سوال نہیں
اُبھر رہا ہے وہ سورج جسے زوال نہیں

نظر کے سامنے ہے بے مثال قربانی      لہو نے ڈال دی ذرّوں میں روحِ طغیانی
بشر نے چھو لی سعادت کی حدِّ امکانی      جھکی نہ سامنے باطل کے حق کی پیشانی
حسینؑ صبر و تحمل کی داد لیتے ہیں
علیؑ کی روح سے اِذنِ جہاد لیتے ہیں

یہ عرض ہے کہ حضور امتحان ختم ہوا      بہار اُجڑ گئی گل بوستان ختم ہوا
نظر کے سامنے سب خاندان ختم ہوا      زباں دکھا کے مرا بے زبان ختم ہوا
نہ لشکرے، نہ سپاہے، نہ کثرت الناسے
نہ قاسمے، نہ علی اکبرے، نہ عباسے

تڑپتے دیکھ چکا اپنے نازنینوں کو      دکھا چکا یہ حدِ صبر سطح بینوں کو
جو اذن ہو تو میں توڑوں ان آبگینوں کو      برائے جنگ چڑھا لوں اب آستینوں کو
چکھا دوں تیغِ شرر بار کا مزا ان کو
یہاں بھی دے دوں کچھ اعمال کی سزا ان کو

بہت گھمنڈ انھیں کثرتِ سپاہ پہ ہے      تو اعتماد مجھے اپنی دستگاہ پہ ہے
بھروسا ان کو اگر ظلمِ بے پناہ پہ ہے      یقین مجھ کو بھی خلاقِ مہر و ماہ پہ ہے
ابھی زمین کے طبقے ہلائے دیتا ہوں
غرورِ تاج و سیاست مٹائے دیتا ہوں

جہاد کو نظر انداز اگر کروں بابا!      تو جن و انس و ملائک میں ہوگا یہ چرچا
کہ مصطفٰےؐ کا جگر بوترابؑ کا بیٹا      فنونِ جنگ و جدل میں نکل گیا بودا
ہزار حیف کہ ہمت سے کام لے نہ سکا
پڑا جو رن تو شجاعت کی داد دے نہ سکا

مرے یقین کو ہے نازِ اس حقیقت پر — سَنَد ملی ہے مجھے جرأت و سخاوت پر
گواہ قولِ نبیؐ ہے مری جلالت پر — تو کیوں نہ مُہر لگا دوں میں اس صداقت پر
عطائے اِذن سے دل شاد کیجئے بابا
دُعا سے بھی مری امداد کیجئے بابا

نجف سے آتی ہے آواز، مرحبا شبیرؑ — ثبات و عزم کی تیرے کہاں مثال و نظیر
دکھا چکا ہے بہت صبر، تول اب شمشیر — جہادِ خندق و خیبر کی کھینچ دے تصویر
ہمیشہ یاد رہے یہ مثال دُنیا کو
دکھا دے ہاشمیوں کا جلال دُنیا کو

بہت زمانہ ہوا زور آزمائے ہوئے — شرارے ناریوں کو تیغ کے چٹائے ہوئے
منافقوں کو مزا جنگ کا چکھائے ہوئے — جہادِ کفر کے میدان سے بھگائے ہوئے
فروغِ دیں سے ضیا بار کاخ و کو کر دے
پدر کو اپنی شجاعت سے سرخرو کر دے

مِلا دے خاک میں ارماں ستم شعاروں کے — اُلٹ دے تیغ سے طبقے سیاہ کاروں کے
گروہ کاٹ کے رکھ دے گناہگاروں کے — پھرا دے مُنہ سپہِ شام کے سواروں کے
لہو کی سیل، عدو کے خیام تک پہنچے
وہ زلزلہ ہو جو مقتل سے شام تک پہنچے

زبانِ سیف سے قطعِ کلام ہو جائے — زباں درازوں سے حُجّت تمام ہو جائے
بجا ہے تیغ قضا بے نیام ہو جائے — حق آشنا دلِ ہر خاص و عام ہو جائے
رواں زمانے میں ایماں کا چلن کر دے
جہاتِ ارض کو انصاف و عدل سے بھر دے

یہ سن کے پھر تشکّر جھکا حسینؑ کا سر    ادائے فرض کی نیّت بندھی، کسی جو کمر
لڑی جو فوجِ مخالف سے پھر جنگ نظر    یہیں سے تیغ و فرس کے بدل گئے تیور
فزوں تھا دل کو جو احساس ذمّہ داری کا
تو اہتمام ہوا دشمنوں کی خواری کا

فرس پہ جلوہ نما تھا جو کائنات کا نور    چمک سے خانۂ زیں بن گیا تھا کوہِ طور
بسانِ شیرِ الٰہی بڑھے جو حق کے حضورؑ    تو رنگِ چہرۂ فوجِ ستم ہوا کافور
وفورِ خوف سے سینوں میں دل دہلنے لگے
نمودِ تیغ سے پہلے شباب ڈھلنے لگے

رجز کے پھول کھلانے لگی زبانِ امامؑ    جو ترجمانِ الٰہی تھا وہ خجستہ پیام
شمیمِ عطرِ بلاغت سے پُر تھا حُسنِ کلام    یہ مدّعا تھا کہ پہچانو آدمی کا مقام
وہ آدمی کہ جو ہے فردِ حُسنِ خلقت میں
وہ آدمی جو پلا دامنِ رسالتؐ میں

میں وہ جری ہوں جو ہے شیرِ بیشۂ حیدرؑ    میں وہ سخی ہوں کہ اک آن میں لٹا دیا گھر
میں وہ ولی ہوں جو ہے کائنات کے سر پہ    میں وہ غنی ہوں کہ دربان جس کے ہیں قنبر
نگاہِ خلق نے یہ بار بار دیکھا ہے
کہ مجھ کو دوشِ نبیؐ پر سوار دیکھا ہے

عطا کیا ہے جو خالق نے مجھ کو جاہ و حشم    عیاں ہے سورۂ والعصر سے خدا کی قسم
نہ بھولو یہ کہ میں ہوں ابنِ سرورِ عالم    مرے ہی دم سے ہے دینِ محمدیؐ کا بھرم
جہاں میں سب یہ فروع و اصول مجھ سے ہیں
رسولِ پاک سے میں ہوں رسولؐ مجھ سے ہیں

مری رگوں میں ہے جولاں رسولِ رب کا لہو  مرے پدر ہیں محمدؐ کے قوتِ بازو
ستا چکی بہت آلِ نبیؐ کو فوجِ عدو  اب آئیں ہوش میں سب عاشقانِ جام و سبو
چلی جو تیغ تو سارا خمار اُترے گا
یونہی سفینۂ اسلام پار اُترے گا

نہ سمجھے مجھ کو اکیلا سپاہِ ظلم شعار  کہ میری ذات میں پنہاں جلالتیں ہیں ہزار
ہے انگلیوں میں مری زورِ حیدرِ کرار  مرے ثبات میں ہے عزمِ احمدِ مختار
نفاق و ظلم کی بستی اُجاڑ دوں تو سہی
یہ کفر کا درِ خیبر اُکھاڑ دوں تو سہی

جو مردمی کا ہو دعویٰ نظر ملائے کوئی  ابھی نکال دوں بل آستیں چڑھائے کوئی
اِدھر بڑھے تو کوئی سامنے تو آئے کوئی  سزا وہ دوں کہ نہ تا حشر سر اٹھائے کوئی
میں ذوالفقار کا وارث ہوں کوئی اور نہیں
بجز سقر کہیں کشتوں کا جس کے ٹھور نہیں

بڑھے یہ سن کے سپاہی رجز تمام ہوا  تمام دشتِ وغا میں ہجومِ عام ہوا
حسامیں کھنچ گئیں، بودوں کا ازدحام ہوا  اُٹھیں جو ڈھالیں تو میداں سوادِ شام ہوا
وہاں جو تیغوں کی جھنکار بار بار ہوئی
یہاں بھی میان میں بے چین ذوالفقار ہوئی

بڑھا اِدھر سے جو مرکب اُدھر فرس چمکے  یہ چال دیکھ کے نقشے ہرن ہیں ضیغم کے
زمیں سے اُٹھتے ہیں جب اس کے پاؤں جم جم کے  ندا یہ آتی ہے افلاک سے کہ تھم تھم کے
زمیں کا حال جو ہے وہ ہمارا حال نہ ہو
ٹھہر کہ کھیت ستاروں کا پائمال نہ ہو

مدام ظلِ ہما ، راہوارِ نامی پر نثار کاہکشاں اس کی خوش خرامی پر
خجل ہے وقت کی رفتار اپنی خامی پر نجوم کہتے ہیں دُلدُل کی تیز گامی پر
پہنچتا عرش پہ ہوتے جو بال و پر تیرے
ہمیں نہ چھوڑ کہ ہم بھی ہیں ہمسفر تیرے

بڑھے وہ سرورِ دیں زورِ کفر گھٹنے لگا مثالِ شیرِ گرسنہ فرس جھپٹنے لگا
غبار اُٹھ کے زمیں کا ورق اُلٹنے لگا زمانہ خوف سے پیچھے قدم پلٹنے لگا
قریب تھا کہ پھر اسلامیت کا طور آئے
نظام عدل کا لوٹے علی کا دور آئے

ہوئی غلاف سے باہر حسینؑ کی تلوار فرشتگانِ قضا و قدر ہوئے طیار
ہر ایک صف میں ہوا گرم موت کا بازار سروں کے چشم زدن میں لگا دیے انبار
کسی کا سینہ، کسی شخص کا جگر کاٹا
جو خود سری پہ تھا آمادہ اُس کا سر کاٹا

چلی جو تیغ تو بازو اجل کا کٹنے لگا قضا کا سانپ سپاہِ عدو کو ڈسنے لگا
جنودِ کفر جہنم میں جا کے بسنے لگا جھڑی سروں کی لگی کھل کے مینہ برسنے لگا
خلا میں وقت کی کشتی بہاؤ پر آئی
خدا کے قہر کی ندی چڑھاؤ پر آئی

بدل گیا ہے جو موسم نئی بہار ہے اب فضائے کرب و بلا صحنِ لالہ زار ہے اب
زمیں سے تا بہ فلک ایک خلفشار ہے اب فضا سے تا بہ فضا، عالمِ غبار ہے اب
جو چل رہی ہے زمانے کی سانس رُک رُک کے
فرشتے دیکھ رہے ہیں زمیں کو جھک جھک کے

چمک کے تیغ بڑھی لشکرِ وغا پہ گئی — بھڑک کے نار سے منہ پر گئی قفا پہ گئی
جھجک کے موت کا دامن اُٹھی خلا پہ گئی — کڑک کے سَن سے چلی سنسنی فضا پہ گئی
تمام فوج میں مثلِ نگاہ پھرتی تھی
جو برق رَو تھے یہ بجلی اُنھیں پہ گرتی تھی

گری وہ جس پہ سرِ پُر ہوس کو کاٹ دیا — درآئی سینے میں تارِ نفس کو کاٹ دیا
عدو کی رُوحِ نجس کے قفس کو کاٹ دیا — بڑھی کمر سے تو پشتِ فرس کو کاٹ دیا
گڑی زمیں کے جگر میں تو بحر و بر کانپے
اُٹھی جو تن کے تو روح الامیں کے پر کانپے

گئی جدھر سے نئے ڈھنگ سے نکل آئی — کھلی فضا میں دلِ تنگ سے نکل آئی
ہجومِ ساز و دف و چنگ سے نکل آئی — صفائی کرتی صفِ جنگ سے نکل آئی
پری کی چال کا غُل رَن سے تا بقاف ہُوا
وہ کی مصاف کہ دشتِ نبرد صاف ہُوا

تڑپ کے تیغ جو اک بار جا کے دُور گری — جھُلس کے جانِ ستمگار جا کے دُور گری
حسامِ ظالمِ فرار جا کے دُور گری — میاں جو فرق تو دستار جا کے دور گری
عَلَم جو رَن میں ہوئی موت کا جواز ہوا
فضا میں دستِ طویلِ قضا دراز ہوا

وہ خوفِ جاں ہے کہ رو دار منہ چھپاتے ہیں — فرس لرزتے ہیں اسوار تھرتھراتے ہیں
ہوا اُکھڑتی ہے، عیّار منہ کی کھاتے ہیں — صفوں کو چھوڑ کے سردار بھاگے جاتے ہیں
ہے شام صبح سے، اور صبح شام سے آگے
زمین بڑھ گئی اپنے نظام سے آگے

حدِ زماں جو تزلزل نے دوڑ کر چھو لی  تو اعتدال کی رفتارِ وقت کو بھو لی
زمین جھولے میں بھونچال کے جڑوں جھو لی  بگولے دشت میں گھبرا کے چڑھ گئے سُولی
ہوا تھی کوہ کے دامن میں منہ چھپائے ہوئے
نجوم ڈر سے فضاؤں میں تھے سمائے ہوئے

یہ زلزلہ تھا کہ سب دشت و در لرزتے تھے  فراریوں کے قدم سر بسر لرزتے تھے
نظر لرزتی تھی اہلِ نظر لرزتے تھے  ملائکہ تھے بہت دُور پر لرزتے تھے
سکوں کے ساتھ نہ سورج بھی ایک گام چلا
بس انتہا ہے کہ تھرا کے سوئے شام چلا

یہ ذوالفقارِ علیؑ ہے جہاں تلک پہنچے  ہٹا کے دامِ نجوم آسماں تلک پہنچے
بجھا کے اُس کے دیئے کہکشاں تلک پہنچے  مکاں کی حد سے بڑھے لامکاں تلک پہنچے
پرِ بُراق کی صورت خلا کے اندر جائے
تعینّات کے ہر دائرے سے باہر جائے

دیارِ جن و ملک تک رسائی اُس کی ہے  نجوم و ماہ سے بھی آشنائی اُس کی ہے
فلک سے تا بہ ثریا دہائی اُس کی ہے  یہ جس کے ہاتھ میں آئے خدائی اُس کی ہے
بتائے کون کہ شعلے کدھر بھڑکتے ہیں
کہ اس کی آنچ سے جبرئیل بھی جھجکتے ہیں

بیاں کیا ہو تلاطم جو رزمگاہ میں ہے  یہ ملتفت ہو تو کیا فرق کوہ و کاہ میں ہے
ابھی نگاہ سے اوجھل ابھی نگاہ میں ہے  چمک سے اس کی چکا چوند چشمِ ماہ میں ہے
کڑک سے چونک اُٹھی بیخودیِ عشق تلک
کہ کربلا سے ہے اک زلزلہ دمشق تلک

فلک میں اس سے ہے ہلچل سما میں ہلچل ہے
گرے ہیں خیمے صفِ اشقیا میں ہلچل ہے
ہوا میں آگ لگی ہے فضا میں ہلچل ہے
بھٹک رہے ہیں ستارے خلا میں ہلچل ہے
یہ کشتِ فرض پہ آبِ نمو کی بارش ہے
چھدا ہے ابر کا سینہ لہو کی بارش ہے

نہ اس سے زیر ہو کیوں لشکرِ کمینہ صفات
کہ یہ ہے صبح کی پہلی کرن، وہ کالی رات
ہے اس کے دستِ زبردست پر خدا کا ہات
یہ دو زبانوں سے کہتی ہے ایک سیدھی بات
کہ ہے اِدھر درِ کوفہ اُدھر جہنم ہے
کدھر کو بھیج دوں کہہ دو کہ وقت اب کم ہے

جہاں سے جاتے ہیں کفار ہاتھ مَل مَل کے
زبانِ شعلۂ تیغِ دو سر سے جَل جَل کے
سرکتے جاتے ہیں بادل سپاہ کے دَل کے
یہ کہہ رہا ہے مگر آفتاب ڈھل ڈھل کے
کہ حق کی کارروائی کا وقت آپہنچا
حضور! وعدہ وفائی کا وقت آپہنچا

ندا یہ سن کے ہوا مائلِ نیاز جلال
رُکی جو تیغِ دو پیکر ہوئے حضور نڈھال
جو ڈگمگانے لگے تھام لی فرس کی ایال
بس اب زبانِ ادب کیا بیان کرے احوال
بلند مرتبہ شاہے ز صدر زیں اُفتاد
اگر غلط نہ کنم، عرش بر زمیں اُفتاد

یہ وقت وہ ہے کہ اے حاضرینِ بزمِ عزا
جھکے ہیں سجدۂ آخر میں سید الشہدا
چھری قفا پہ ہے، دیجے رسول کو پرسا
سلام آپ پہ اے پیشوائے ہر دوسرا
یہ مرحلہ کہ مشیت کا ایک جبر بھی ہے
مقامِ فخر بھی ہے اور مقامِ صبر بھی ہے

سلام آپ پہ اے مظہرِ صفاتِ کریم  سلام آپ پہ اے رحمتِ خدائے علیم
کیا ہے آپ کے لختِ جگر نے کارِ عظیم  جو نسلِ آدمِ اوّل پہ تھا زعہدِ قدیم
ہوا وہ قرض ادا قصہ مختصر حضرت!
بلند ہو گیا انسانیت کا سر حضرت!

حضور آپ کی اُمت نے جو مہم سر کی  وہی کمائی ہے اِس ملتِ بداختر کی
نواسیوں نے بھی دی بھینٹ اپنی چادر کی  وہ پُشت، اُٹھ نہ سکی جس سے لاش اکبرؑ کی
اُٹھایا اُمتِ عاصی کا بارِ قرض اس نے
چکائے آپ کی شفقت کے سارے قرض اس نے

ہیں اِس جہاد پہ حیراں فرشتگانِ کبار  کہ ہے جلال میں بھی شانِ رحمتِ غفار
بگڑ نہ جائے ستاروں کی منضبط رفتار  خدا کے واسطے رکوائیے بس اب تلوار
ثریٰ سے تا بہ ثریا دہائی آپ کی ہے
خدا ہے آپ کا ساری خدائی آپ کی ہے

خموش ہو گیا صحرا مقامِ ہُو ہے اب  کہ روئے وقت پہ تہذیب کا لہو ہے اب
اُلٹ رہا تھا صفیں جو وہ قبلہ رُو ہے اب  بس ایک مرحلۂ خنجر و گلو ہے اب
عرق تھکن کا جبینِ ستم پہ آتا ہے
وہ اپنا آخری حربہ بھی آزماتا ہے

ملاحظہ ہو فتوحات کا فسوں حضرت!  کہ رفتہ رفتہ ہوس بن گئی جنوں حضرت!
جو ربطِ دین و سیاست ہوا فزوں حضرت!  بہایا آپ کے لختِ جگر کا خوں حضرت!
کہی اذاں تو شریعت کو سرخرو کر کے
پڑھی نماز اسی خون سے وضو کر کے

عَلَم حضور کا ٹھنڈا ہوا بوقتِ زوال  بلند ملّتِ حق کا ستارۂ اقبال
خوشا سیاستِ ملّی کا منتہائے کمال  کہ اُس کی بھینٹ چڑھا آج فاطمہؑ کا لال
ردائیں پھینک کے دونوں کی پابیاں نکلیں
حرم سے آپ کی دونوں نواسیاں نکلیں

ملاحظہ ہو یہ تہذیبِ قومؑ کا منظر  کہ جل رہے ہیں خیام اور حیا جھکائے ہے سر
یہ حال دیکھ کے یاد آگئیں مجھے یکسر  وہ دھمکیاں کہ جلا دیں گے فاطمہؑ کا گھر
دُہائی ہے شہرِ دوسرا دُہائی ہے
وہ مبتدا تھا خبر جس کی آج آئی ہے

ملاحظہ ہوں شہیدانِ حق کے یہ لاشے  ملاحظہ ہوں یہ کس کے جگر کے ہیں ٹکڑے
چکائے قوم نے بدر و حنین کے بدلے  بغور دیکھئے یہ زخم پشتِ زینبؑ کے
یہی ہیں نخلِ ہدایت کے تازہ پھل مولا
یہی ہے کارِ رسالتؐ کا ماحصل مولا

شریعت آپ کی ہے مسخ حُبِّ جاہ میں آج  چلیں حضور خلافت کی بارگاہ میں آج
یہ کیسا جشن ہے قصرِ جہاں پناہ میں آج  کہ خیرگی سی ہے تاریخ کی نگاہ میں آج
یہ بہوئیں بیٹیاں کس کی حضورِ اکرم ہیں
کھڑی جو مثلِ کنیزانِ تُرک و دَیلم ہیں

یہ سانحہ ہوا بیشک مگر ہمارے لئے  تباہ ہو گیا حضرت کا گھر ہمارے لئے
شہیدِ حق کا ہے نیزے پہ سر ہمارے لئے  ہے ریش خون میں بچّے کے تر ہمارے لئے
مگر حسینؑ سے ہم نے وفا نہ کی مولا
نیازِ عشق کی سُنّت ادا نہ کی مولا

ہم آج آپ کو دیں کس زبان سے پُرسا | کہ پیروی کا بھی حق ہم سے ہو سکا نہ ادا
ہم اُمتی ہیں بہت آپ سے خجل مولا | بہت حقیر سہی آنسوؤں کا یہ تحفہ

مگر قبول ہو یہ تعزیت نواسے کی
قبول رسمِ عزا کربلا کے پیاسے کی

بس اب کہ ختم پہ ہے مرثیہ یہ اہلِ عزا | پھرا کے رُخ سوئے درگاہِ سیدالشہدا
کہو زبانِ تاسف سے باصد آہ و بکا | سلام آپ پہ اے وارثِ خلیلِ خدا

سلام آپ پہ اے افتخارِ نسلِ ذبیحؑ
سلام آپ پہ اے ناشرِ پیامِ مسیحؑ

سلام آپ کے بھائی کی اس جلالت پر | یقین جس سے خودی کو خدا کی قدرت پر
سلام آپ کے انصار کی شجاعت پہ | سلام آپ کے بچوں کے صبر و ہمت پہ

سلام آپ کے کُنبے کی بے نوائی پہ
سلام آپ کی بہنوں کی بے ردائی پہ

سلام آپ کی تشنہ لبی کو اے مولا | کہ جس نے موڑ دیا زندگی کو اے مولا
ستارے بخش دیئے تیرگی کو اے مولا | مقامِ عشق ملا رہبری کو اے مولا

لہو سے اہلِ ستم کے دماغ کو دھویا
جبینِ دیں سے سیاست کے داغ کو دھویا

تاثرات کا اعجاز تھی یہ قربانی | یہودیوں کے بھی دل جس سے ہو گئے پانی
مگر نہ زندہ ہوئی غیرتِ مسلمانی | ہم اس کی کرتے ہیں ہر سال فاتحہ خوانی

ہم آپ کو نہیں روتے ہیں اس کو روتے ہیں
ضمیرِ سنگ میں اشکوں کے بیج بوتے ہیں

گلہ تمام کر اے عاشقِ دوامِ حسینؑ ترے شعور سے بالا ہے انتظامِ حسینؑ
چلے گا حشر تک اب اُسوۂ امامِ حسینؑ ہر اک زبان پہ جاری رہے گا نامِ حسینؑ

زمانہ جتنا بھی انساں کو جگائے گا
حسینیت سے قریب اور اُس کو پائے گا

حسینؑ راہبرِ شوق و رہنمائے وفا حسینؑ شمعِ صداقت کی لازوال ضیا
حسینؑ حزبِ حقیقت کا قائدِ یکتا حسینؑ پیکرِ عزم و عمل بصدق و صفا

حسینؑ گرمیِ احساسِ کاروانِ حیات
حسینؑ ضامنِ انسان و پاسبانِ حیات

حسینؑ خضرِ رہِ ارتقائے انسانی حسینؑ یوسفِ کنعانِ مصرِ قربانی
حسینؑ آئینہ دارِ جمالِ ربّانی حسینؑ تو ہے بقا، کائنات ہے فانی

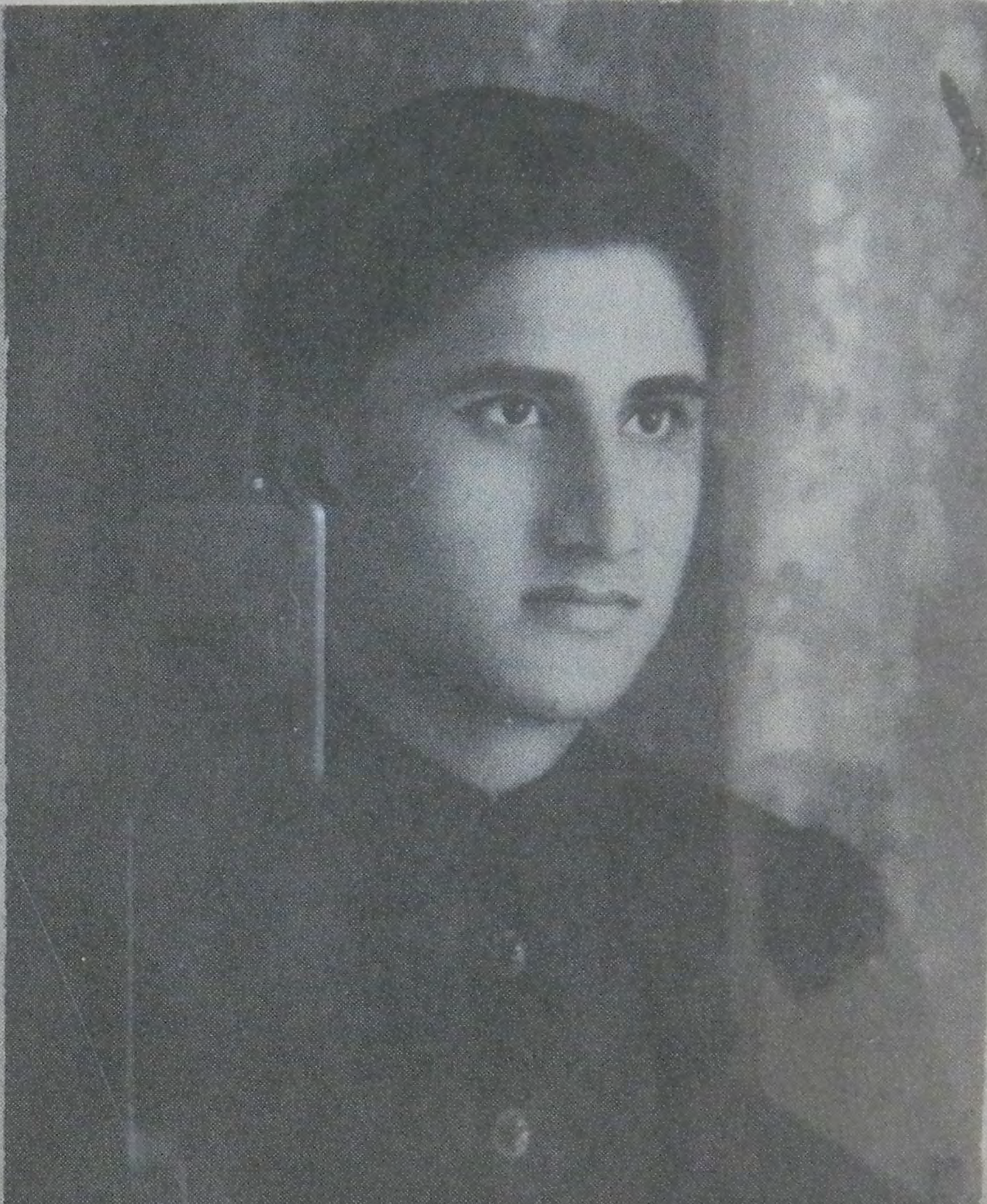
رگِ حیاتِ عمل کی جہندگی ہے حسینؑ
پئے خدا و نبیؐ سب کی زندگی ہے حسینؑ

دُعا کو ہاتھ اُٹھا شاعرِ خجستہ پیام خوشا نصیب ملا تجھ کو مدح گو کا مقام
ترے سخن میں ہیں امواجِ تازگیِ دوام خدا دکھائے اِن آنکھوں سے بارگاہِ امام

علاوہ اِس کے بصیرت کو یہ شرف بھی ملے
برائے سُرمہ غبارِ رہِ نجف بھی ملے

سیّد صفدر حسین

۱۹۳۶ء



اُسی لمحے سے تھا اِک خونچکاں سایہ دل و جاں پہ
کہ جب چڑھنے لگی تھی دھوپ دیوارِ گلستاں پہ

حصّہ

# تبصرہ وتنقید

عبدالعزیز فطرت

# آئینِ وفا

آئینِ وفا معجزۂ فن ہی نہیں ہے
آئینِ وفا آئینۂ حسنِ یقیں ہے
(۱) صفدر کا کمالِ سخن اور سوزِ محبت
آئینِ وفا — دونوں کی عظمت کا امیں ہے

ایک آئینۂ انوار ہے — آئینِ وفا
(۲) ایک گنجینۂ اسرار ہے — آئینِ وفا
خونچکاں خامہ کی تحریر یقیں کی تصویر
ذکرِ عباسؑ علمدار ہے — آئینِ وفا

# آئینِ وفا

| | |
|---|---|
| عبدالعزیز فطرت | ماہنامہ شاعر بمبئی |
| منظر عظیمی | مولانا نجم الحسن کراروی |
| ڈاکٹر محمد احسن فاروقی | سید مسعود رضا مرحوم |
| روزنامہ ڈان (انگریزی) کراچی | پروفیسر آغا سہیل |
| سید مسعود حسن رضوی ادیب | ڈاکٹر احراز نقوی |
| سید عابد علی عابد مرحوم | کسریٰ منہاس |
| روزنامہ جنگ راولپنڈی | شان الحق حقی |
| مصطفیٰ حسن رضوی | ہفت روزہ رضاکار |
| مولانا سید ظفر حسن امروہوی | ڈاکٹر مسیح الزماں مرحوم |
| مرزا مصطفیٰ علی ہمدانی | مولانا ماہر القادری |
| سید آل رضا | ماہنامہ اصلاح |
| زائر سیتاپوری | سید ابن حسن نقوی |
| محمد اکبر الدین صدیقی | حکیم سید سخی احمد |
| ماہنامہ معارف اعظم گڑھ | پروفیسر ہاشم جلالی |

مولانا مرتضیٰ حسین فاضل

# رُباعیات

(۱)

سرمایۂ ناز و افتخارِ عُرفا
آئینہ نمائے جوہرِ صدق و صفا
عبّاسؑ وفا ہیں اور وفا کی توصیف
ہے زاویۂ نگاہِ "آئینِ وفا"

(۲)

شبّیرؑ ہیں افتخارِ بزمِ عُرفا
آئینہ نمائے جوہرِ صدق و صفا
شبّیرؑ سے انتسابِ عبّاسؑ جری
عبّاسؑ سے انتسابِ "آئینِ وفا"

ڈاکٹر محمد احسن فاروقی

# رنگِ مجلس

ڈاکٹر یاور عباس کے یہاں ۲۸ رجون ۱۹۶۴ء کو ڈاکٹر صفدر حسین نے مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی کی پرانی روایات کو جدید دور میں ایک نئی نوعیت دی. میرا خیال تھا کہ مرثیے مجلس ہی کے لئے لکھے گئے، اُن کو مجلس سے جدا کر کے پڑھنا اُن کی کیفیت کو بہت کچھ اسی طرح کم کر دیتا ہے جیسے کہ ڈرامے کی کیفیت اسٹیج سے الگ ہو کر کم ہو جاتی ہے. چنانچہ میرے بچپن میں لکھنؤ میں میر انیس کے پوتے میر خورشید حسن عروج عرف دولہا صاحب کی مجلسیں جن میں وہ اپنے نو تصنیف مرثیے حسنِ ادا کے ساتھ پڑھتے تھے بڑی مقبول ہوا کرتی تھیں. کافی عرصے بعد راجہ صاحب محمود آباد اپنے یہاں کی مجلس میں اپنا نو تصنیف مرثیہ پڑھنے لگے. اُن کی خوانندگی کے متعلق مسعود حسن رضوی صدرِ شعبۂ اُردو و فارسی لکھنؤ یونی ورسٹی کی یہ رائے تھی کہ اس وقت مرثیہ خوانی کے فن کا اگر کوئی کامل ہے تو راجہ صاحب محمود آباد" وہ دِن اب برسوں دُور نکل چکے تھے اور کراچی کے ماحول میں مجالسِ عزا حضرت رشید تُرابی کے وعظوں اور تقریروں پر مبنی رہ گئی تھیں کہ یکا یک ڈاکٹر صفدر حسین نے اِس سکوت کو توڑا- اُن کی مجلس کراچی میں پرانی روایات کا نیا آغاز تو نہ تھی کیونکہ کئی سال پہلے یہ آغاز ہو چکا تھا اور سید آلِ رضا اِس سلسلے میں نمایاں کامیابی حاصل کر چکے تھے. اور خود ڈاکٹر صفدر حسین بھی اب سے دو سال قبل نئی آن بان کے ساتھ مرثیہ خوانی میں قدم رکھ چکے تھے. چنانچہ اُنھوں نے پہلی مجلس ۲۹ رجولائی ۱۹۶۲ء کو حسینیۂ ایرانیان میں اور پھر ایک سال بعد دوسری مجلس

۴؍اگست ۱۹۶۳ء کو رضویہ کالونی میں پڑھی تھی۔ لیکن اس بار وہ حُسنِ تحت اللفظ خوانی کے ساتھ ساتھ مرثیہ نگار کی حیثیت سے بھی پیش ہورہے تھے اس لئے یہ مجلس اپنی نوعیت میں اُن کی گذشتہ مجالس سے مختلف تھی۔ بعض وجُوہ سے اس مجلس میں میری بھی رسائی ہوگئی۔

میں نے دیکھا کہ منبر کی جگہ ایک اُونچا تخت تھا جس پر کُرسی رکھ دی گئی تھی اَور اُس کے سامنے لاؤڈسپیکر لگا ہوا تھا۔ ڈاکٹر صفدر پُرانے مرثیہ خوانوں کی طرح مگر مختلف انداز میں تشریف لائے۔ اُس چوگوشیہ ٹوپی کی جگہ جس کو میرانیس آئینے کے سامنے گھنٹوں دُرست کیا کرتے تھے اُن کے سَر پر اُونچی باڑھ کی مخملی ٹوپی تھی جو اُن کے وطن کا پتہ دیتی تھی اور کج انداز میں سر پر جمی ہوئی تھی۔ انگرکھے کے بجائے وہ جدید ترین کٹ کی سفید شیروانی پہنے تھے۔ مرثیہ خوانوں کے عام طریقے پر پہلے اُنہوں نے کُرسی پر ہاتھ رکھ کر دُعا پڑھی اور پھر شان کے ساتھ بیٹھ گئے۔ سیاہ کپڑے کے بستے کے بجائے اُن کے ہاتھ میں چمڑے کا جدید زپ والا بک کیس تھا جس میں سے اُنہوں نے مرثیہ نکالا۔ اُن کے ہاتھ میں مرثیہ کا مسودہ بالکل اتنا ہی لمبا چوڑا نظر آرہا تھا جیسا کہ مرثیہ خوانوں کا ہوتا تھا۔ اُنہوں نے اعلان کیا کہ اس مرثیہ کے شروع کے بند چھوڑ دیئے گئے ہیں کیوں کہ ان میں متنازعہ فیہ مسائل ہیں۔ یہ اعلان ہی اس بات کا احساس دلاتا تھا کہ مجلس کی قدیم روایت میں مرثیہ خوان کچھ تبدیلی لا رہا ہے۔

غرض صفدر صاحب نے بند پیش کیا۔ پہلے دو مصرعوں سے مجلس گرمائی اور تیسرے مصرعے پر پھڑک اُٹھی۔ مصرع تھا۔

پیکرِ خاک میں حیدر کی دُعا تھے عبّاسؑ

اِس کو ادا کرنے کے لئے اُنہوں نے دونوں ہاتھ دُعا کے لئے اُٹھائے اور ہمہ تن دُعا بن گئے۔ ہر طرف سے واہ واہ کی آوازیں بلند ہوئیں۔ مصرعے کا معنوی زور ایک

طرف اور جس اشارے سے اُسے ادا کیا گیا تھا وہ دوسری طرف ایک دوسرے سے مل کر اس طرح ہم آہنگ تھا کہ مرثیہ خوانی اپنے کمال پر نظر آرہی تھی۔ اِس بند کی بیت میں مدحِ جنابِ عباسؑ اس نوعیت سے کی گئی تھی کہ ایک نیا عالم نظر آنے لگا ؎

اہلِ حق اِن کو زعیم الشہدار کہتے ہیں
اِن کے اخلاص کو معیارِ وفا کہتے ہیں

اِس بند کے بعد ہی یہ محسوس ہو گیا کہ مرثیہ بھی نہایت عُمدہ ہے اور مرثیہ خوانی بھی اعلیٰ درجہ کی ہے چُنانچہ مجلس مرثیہ خوان کے اشاروں پر چلنے لگی۔

مدحِ حضرتِ عباسؑ کے بند کے بند آنے لگے۔ ہر ہر مصرع کی تعریف ہوئی مکرّر اور سہ کرّر پڑھوایا گیا مخصوص انداز سے ادا کرنے کے بعد صفدر صاحب سیدھے سیدھے طریقے پر بھی مصرعے دوہراتے اور لوگ اَدا سے زیادہ شاعرانہ تاثر سے محظوظ ہوتے تمام بندوں کی بیتیں خاص طور سے مقبول ہوئیں۔ جن جن ٹیپوں پر مجلس اُچھل اُچھل پڑی اُن میں سے چند یہ ہیں ؎

جذبۂ شیرِ خدا قوّتِ ایمانِ حسینؑ
ایک جا زورِ علیؑ، حُسنِ حسنؑ، شانِ حسینؑ

---

یہ وہ پانی کہ شجاعت کا ہے قلزم جس سے
ہوا دو لاکھ کے لشکر میں تلاطم جس سے

---

فیضِ شبیرؑ سے ذرّے میں دمک آنے لگی
غنچۂ جسکا گُلِ زہراؑ کی مہک آنے لگی

پھر وہ اس کمال کے بند پر آئے اور اِس کو کمال کے ساتھ ادا کیا ؎

ہوئے پیدا تو کھلی گود میں شبیرؑ کی آنکھ
عمر بھر دیکھی اُسی صاحبِ توقیر کی آنکھ
ہر بنِ مُو سے نمایاں ہوئی تنویر کی آنکھ
آنکھ وہ آنکھ کہ کہیئے جسے تاثیر کی آنکھ

عارضِ سبطِ پیمبرؑ کی ضیا کو دیکھا
آنکھ کچھ اور کھلی جب تو خدا کو دیکھا

اِس بند میں آنکھ کی ردیف اور آخری مصرع میں آنکھ کے لفظ کو جس طرح صفدر صاحب نے آنکھوں سے ادا کیا وہ دیکھنے ہی سے تعلق رکھتا تھا۔

مدح کے بعد دربارِ ولید کا مختصر حال آیا اور اُس میں یہ ٹیپ خاص طور پر ادا ہوئی۔

کی جو حاکم نے ذرا تیز نظر سوئے حسینؑ
آگیا تیغ بکف قوّتِ بازوئے حسینؑ

صفدر صاحب اپنی شیروانی کی آستین اُس طرح تو نہ چڑھا سکے جیسے انگرکھا پہننے والے مرثیہ خوان چڑھا لیا کرتے تھے مگر اُنھوں نے اپنے تیور اور ہاتھ کے اشارے سے اِس شعر کا پورا تاثر قائم کر دیا۔

اِس کے بعد مرثیے کے وہ بند آئے جن میں حُرکی فوج کے آجانے اور اُس کو امام علیہ السّلام کے سیراب کرانے کا واقعہ نظم ہوا ہے۔ یہاں محسوس ہوا کہ صفدر صاحب اُن واقعات سے ہٹ کر جو عام طور پر مرثیوں میں نظم ہوتے ہیں، ایک ایسے واقعہ کو جو کم ہی نظم ہوا ہے سامنے لا رہے ہیں۔ مرثیہ کے اس حصّے کے جو بند سب سے زیادہ نمایاں ہوئے وہ حسبِ ذیل ہیں۔

چھاگلیں لے کے بڑھا آپ علمدارِ جری
فرس و قاطر و اُشتر ہوئے سیراب سبھی

سوکھے ہونٹوں پہ نمایاں تھی تشکر کی تری
دِل عقیدت سے بھرا آنکھ ندامت سے جھکی

شرمِ احساں سے ہوئی فوجِ ستمگر پانی
اِس کو کہتے ہیں کرم ہو گئے پتھر پانی

شاہ تھے حلم سے مجبورِ رضا کیا دیتے
حُر کے انجام سے واقف تھے سزا کیا دیتے
اپنے پروانے کو شعلوں کی ہوا کیا دیتے
حُر تھا حُر اس کو دُعاؤں کے سوا کیا دیتے

سب کو سمجھا کے ولی ابنِ ولی نے روکا
اپنے ضیغم کو حسینؑ ابنِ علیؑ نے روکا

پھر امام علیہ السّلام کا کربلا میں ورُود دکھایا گیا ہے اور اس سلسلے میں ایک غیبی آواز آتی بتائی گئی ہے۔ اِس کی بابت متعدد بند ہیں جو روائتی مرثیہ نگاری کے دائرے سے نکل کر جدید فکری شاعری کے دائرے میں آجاتے ہیں۔ اِس حصّے کو سُن کر لکھنؤ کے ایک صاحب نے مجھ سے کہا "یہ مرثیہ نہیں ہے۔ اِس میں مرثیت نہیں ہے۔" مگر میں سمجھتا ہوں کہ صفدر صاحب نے یہاں صنفِ مرثیہ کی اُس کمی کو پُورا کر دیا جس کی طرف میں نے مرثیوں پر اپنے مضامین میں بارہا اشارہ کیا ہے۔ یہ بند اس جدّت کی مثال ہے ؎

اَے کہ سینہ ہے تِرا نورِ خدا کی منزل
ہو مُبارک تجھے یہ کرب و بلا کی منزل
آ گئی سامنے تسلیم و رضا کی منزل
یہ وہ منزل ہے کہیں جس کو وفا کی منزل

اہلِ عرفاں کو ملے گا یہیں عرفاں کا سُراغ
عشق پائے گا یہیں کوچۂ جاناں کا سُراغ

یہاں لگے ہاتھوں صفدر صاحب کے مرثیہ کی ایک مخصوص صفت کی بابت بھی کچھ کہتا چلوں تو بہتر ہوگا۔ یُوں تو صفدر صاحب نے زیادہ تر مرثیہ کی روایات ہی کے مطابق سب کچھ لکھا ہے مگر اُن کے سامعین اور روایتی مرثیہ خوانوں کے سامعین میں ایک فرق یہ آگیا ہے کہ اوّل الذکر طبقہ یورپ کی ایپک شاعری سے بھی واقف ہے اور اُس کے سامعین رزمیہ میں وہ فلسفیانہ اور اشارتی معنی خیزی بھی ڈھونڈتے ہیں جو یورپ کی رزمیہ شاعری کی امتیازی صفت ہے اور جس کی بنا پر ملٹن نے اپنی رزمیہ کا مقصد انسان کو خدا کے طریقے سکھانا بتایا تھا ہمارے مرثیہ نگار اس طرف کبھی نہیں گئے۔ اور اِسی لئے میں مرثیہ کو ایپک کا مترادف کہنے سے انکار کرتا رہا ہوں لیکن صفدر صاحب کے مرثیہ کے آخر میں خصوصیت کے ساتھ ایپک کی یہ صفت بھی آگئی ہے جو اِس قسم کے بندوں سے نمایاں ہوتی ہے جیسے:

بسکہ عاشور کے دِن سخت تھی عباسؑ کی پیاس
پھر بھی دریا میں جو اُترے تو رہے جمع حواس
یوُں بھری مَشک کہ حیراں ہوئے خضرؑ و الیاسؑ
خنکیِ آب کو آنے نہ دیا ہاتھ کے پاس
آبرو فرض کو توقیر وفا کو بخشی
تپشِ نَو دلِ اربابِ ولا کو بخشی

نکلے دریا سے تو خُون اپنا بہاتے نکلے
ریگِ ساحل کو لبِ خُشک دکھاتے نکلے

عشق اور فرض کی تقدیر جگاتے نکلے
صبر و ایثار کی تاریخ بناتے نکلے

پیاس اِس طرح سے ٹھکرا دے بھلا پانی کو
موڑ دیتی ہے وفا فطرتِ انسانی کو

قافلہ وقت کا گو زحمتِ ہر گام میں ہے
ماندگیٔ شہدا رحالتِ آرام میں ہے
درد اِس تشنہ لبی کا دلِ ایام میں ہے
خونِ دل آج بھی پانی کے عوض جام میں ہے

بچے لیتے ہیں جو گرمی میں کبھی پیاس کا نام
لب پہ آجاتا ہے بے ساختہ عباسؑ کا نام

یہی نہیں بلکہ اس کے بعد کے سب ہی بند ورسِ فلسفہ کے اُس عالم میں چلے جاتے ہیں جس کو لکھنؤ والے مرثیت سے الگ کوئی چیز کہیں گے۔ مگر ہم یہ جانتے ہیں کہ یہ مرثیہ کو وہ گہرائی دینے کی مثال ہے جس سے وہ اب تک تہی دست تھا۔

اس مرثیہ میں بزم اور رزم کے بھی نئے میدان نظر آئے۔ حضرتِ اُمِ کلثومؑ اور جنابِ عباسؑ کا مکالمہ بزم کی اور حضرتِ عباسؑ کی آٹھویں شب میں پانی لانے میں کامیابی رزم کی کامیاب مثالیں ہیں۔

مرثیہ خوانی میں رزمیہ حصہ پڑھنا ہمیشہ سے ایسا مشکل کام سمجھا جاتا ہے کہ ایڑی چوٹی کا پسینہ ایک ہو جاتا ہے۔ صفدر صاحب نے رزمیہ بندوں کو جس جوش و خروش کے ساتھ ادا کیا اُس کا اندازہ مجلس میں موجود ہو کر دیکھنے ہی سے ہو سکتا تھا۔ اِس حصے کے پڑھنے میں اُن کے چہرے اور بشرے سے وہ خاص جلال نمایاں ہو رہا تھا جو مجاہدین پر جہاد کے وقت طاری ہو جاتا ہے۔ اُن کی آواز میں ایک خاص زور آگیا

تھا جس نے اُن کے سامنے رکھے ہوئے مائیکروفون کو غیر ضروری ثابت کر دیا تھا۔ اُن کے ہاتھوں کی حرکت اُن کے اشعار کے معنوں کی پوری ترجمانی کر رہی تھی مجلس واہ واہ اور مکرّر سہ کرّر کی آوازوں سے گونج رہی تھی۔

صفدر صاحب نے حقیقتاً مرثیہ خوانی کے فن کو جو زمانے کے چکّر سے ختم ہوتا جا رہا تھا نئی زندگی بخش دی ہے اور مرثیہ نگاری میں بھی نیا راستہ پیدا کر دیا ہے۔ اُن کے مرثیہ میں مربُوط واقعہ نگاری کے ساتھ ساتھ نئے احساس، نئے اندازِ بیان، جدید ترکیب تراشی اور حُسنِ قافیہ و ردیف کا بھی وہ کمال ملتا ہے جو شاعری کا اعجاز معلوم ہوتا ہے۔ اُن کا مرثیہ سُن کر میں تعجب کے عالم میں تھا کہ ایسے کمال کی چیز کیسے وجود میں آگئی کہ یکایک غیبی جواب آیا ؎

ہاں بادہ کشو پوچھ لو مے خانہ نشیں سے
کوثر کی یہ موج آگئی ہے خُلدِ بریں سے

---

روزنامہ ڈان (انگریزی) کراچی
۸ رجولائی ۱۹۶۴ء

# مرثیہ نگاری میں نئے عناصر

اتوار کے دِن ہزاروں مُشتاقانِ ادب نے ڈاکٹر سید یاور عباسؔ کے دولت کدے پر ڈاکٹر سید صفدر حسین کا نو تصنیف مرثیہ سُنا۔ ناقدین نے اسے اُردو ادب کی اِس صنفِ شاعری میں گراں قدر اضافہ سے تعبیر کرتے ہوئے اِس کا خیر مقدم کیا ہے۔ یہ انیسؔ و دبیرؔ کی عظیم روایات کے تار و پُود میں اضافہ کرتے ہوئے انسانی عظمت کے تصور کو اس احسن طریقے سے پیش کرتا ہے کہ جو موجُودہ بالغ شعور کے عین مطابق ہے۔

---

# ایک خط

ادبستان۔ دین دیال روڈ، لکھنؤ

۱۷؍جولائی ۱۹۶۴ء

عزیز مکرم۔ زاد شرفکم

آپ کی بھیجی ہوئی کتابیں ملیں۔ دلی دعائیں لیجئے۔ پیکٹ پر بھیجنے والے کا نام دیکھ کر خیال ہوا کہ ان دو کتابوں میں سے کوئی کتاب ہوگی "حماسۂ کربلا" اور "زندگی اور ادب شاہانِ اودھ کے عہد میں"۔ لیکن جب پیکٹ کھولا تو یہ نعمتِ مترقبہ تو نہ نکلی بلکہ ایسی نعمت ہاتھ آئی جو ہر حیثیت سے غیر مترقبہ تھی۔ اس لئے کہ مجھے آپ کے شاعر ہونے کی خبر نہ تھی، پھر یہ توقع کیوں کر ہوتی کہ آپ کی نظموں کے دو دو مجموعے چھپے چھپائے نظر کے سامنے آجائیں گے۔ ان مجموعوں کو دیکھ کر جو خوشی ہوئی اُس میں اس بات نے اور اضافہ کر دیا کہ وہ بے نظیر پاکیزہ صنفِ سخن جو مرثیہ کہلاتی ہے اُس کے احیا کی کوشش میں بھی آپ شریک ہیں اور آپ کا پہلا ہی مرثیہ پیشین گوئی کر رہا ہے اگر مرثیہ گوئی کا سلسلہ جاری رہا تو آپ کی شاعرانہ صلاحیتیں اس صنفِ شعر کو اس کی گذشتہ عظمت کے قریب پہنچا دیں گی۔

خیر اندیش

سید مسعود حسن رضوی

سیّد عابد علی عابد

# اندازِ کلام

اگر مجھ سے پُوچھا جائے کہ بالواسطہ یا بلاواسطہ عربی کی کونسی صنفِ سخن فارسی کے ذریعے اُردو تک پہنچ کر ایک ایسا مقام حاصل کر چکی ہے کہ جو دُنیا بھر کے ادب میں مُنفرد ہے تو میرا جواب یہ ہوگا کہ وہ مرثیہ ہے۔ عربی میں مغزِ سخن قصیدے کو سمجھا جاتا ہے جیسا کہ اِس کے مادّے سے ظاہر ہوتا ہے۔ اِس کی چار شقیں ہیں یعنی (۱) المدیح (۲) الوصف (۳) الہجاء اور (۴) الرثاء۔ المدیح کی اصطلاح خود اپنے معانی پر دلالت کر رہی ہے۔ الوصف سے مُراد شعر کی وہ صنف ہے جس میں بیان اور اُس کے لوازم کو اہمیت دی جاتی ہے۔ الہجاء کا مفہوم بھی خود اِس لفظ سے ظاہر ہے جس کو سُن کر ہجویات کا وہ تمام سِلسلہ سامنے آجاتا ہے جو بعض صورتوں میں ہمارے لئے باعثِ ننگ اور بعض حالتوں میں باعثِ تفاخر ہے۔ الرثاء یعنی مرثیہ کئی نوعیتوں کا ہوتا ہے مثلاً ذاتی اور شخصی یعنی اکابرین سے کسی شخص کی وفات پر شاعر کا ماتم یا پھر نوعی اور اجتماعی جس میں ملک و ملت یا کِسی خاص خِطّے پر کسی آفت کے نازل ہونے کی صورت میں شاعر اپنے غم کا اظہار کرے۔ فارسی ادب میں انوری کا قصیدہ اِس کی مثال ہے جس کا مطلع ہے:

برسمرقند اگر بگزری اے بادِ سحر نامۂ اہلِ خراساں بہ برِ خاقاں بَر

اس قصیدے میں اُس تباہی اور غارت گری کی تصویر کھینچی گئی ہے جو ترکانِ غزنہ نے ایران میں برپا کی تھی۔ قطع نظر اِن اقسام کے، مرثیے کی ایک قسم ایسی بھی ہے جو عربی

اور فارسی میں مختلف منزلیں طے کرتی ہوئی اُردو تک یوں پہنچی کہ خاندانِ اہلِ بیتؑ سے عموماً اور واقعاتِ کربلا سے خصوصاً مربُوط ہوگئی۔ اِس صنفِ سخن کے اپنے آداب، سلیقے، قرینے اور اصطلاحات ہیں مثلاً مطلع، چہرہ، مدح، رجز، رزم، اور شہادت وغیرہ لیکن اس مختصر سے مقدمے میں اِن اصطلاحات کی تشریح مناسب نہیں۔

مرثیہ دراصل سُننے سے تعلق رکھتا ہے اور ایک تمثیل کی طرح ایک خاص فضا چاہتا ہے جس میں ایک تقدّس کا سا عنصر اور نشست و برخاست کا ایک خاص سلیقہ ہو۔ پہلے رُباعیات پڑھ کر ایک فضا قائم کرنے میں معاونت کی کوشش کی جاتی ہے، پھر سلام اور آخر میں تحت اللفظ میں کامل مرثیہ پیش کیا جاتا ہے۔ غور کرنے سے معلُوم ہوگا کہ جو فضا مرثیے سے مربُوط ہوتی ہے وہ تمثیل کی طرح مختلف عناصر کا تال میل اور تعاون چاہتی ہے یعنی سامعین مرثیے پر ہمدردانہ نقطۂ نظر رکھتے ہوں اور پڑھنے والا مرثیہ گوئی کے لوازم کے ساتھ ساتھ اُن تمام دلالتوں سے بھی آگاہ ہو جو مرثیہ خوانی کو ایک فن بنا دیتی ہیں۔ اُردو مرثیے کی تنقید میں اگر اِن ڈرامائی عناصر کی اہمیت کو نظرانداز کر دیا جائے تو انتقاد ناقص اور گمراہ کن ہو جائے گا۔

یہ بات مُسلّم ہے کہ ہر زمانے کی مُعاشرت، تہذیب، تمدّن، ثقافت اور تاریخی روایت اپنے عہد کی شعری روایت، شعری اصناف کی ہیئت اور اسلوب کو بطورِ خاص متاثر کرتی ہے۔ انھیں اسباب سے انیسؔ اور دبیرؔ کے زمانے تک غایتِ مرثیہ یہ تھی کہ مجلس میں رزم و بزم کے عناصر کے ساتھ ساتھ گریہ و بکا کی فضا پیدا ہو۔ جس حد تک کوئی مرثیہ مُبکی ہوتا تھا اُسی حد تک وہ کامیاب سمجھا جاتا تھا۔ دُوسری خصوصیت اُس عہد کی یہ تھی کہ مرثیے کی اُٹھان سے لے کر اختتام تک الفاظ کا دروبست صنعتوں کا استعمال اور زبان و بیان کی خوبیاں اُس معاشرت کے چوکٹے میں جڑی ہوئی نظر آئیں۔ اِن اجزا کے ساتھ ساتھ ضمناً خیر و شر کی آویزش (کہ ازلی ہے) اور دُوسری عرفانی اور اخلاقی

اقدار بھی اُجاگر ہوتی رہتی تھیں لیکن یہ چیزیں مرثیے کی غایت میں شامل نہ تھیں بلکہ برسبیلِ تصادف یا بطریقِ مقصدِ ثانوی وقوع پذیر ہوتی تھیں۔

مرثیے کی تجدید دو باتوں کا تقاضا کرتی ہے۔ ایک تو یہ کہ دورِ حاضر میں اُردو کے مزاج نے جو تغیر قبول کیا ہے مرثیے کو بھی اُسی کے سانچے میں ڈھالا جائے اور یہ فرض نہ کر لیا جائے کہ تمام قارئین اور سامعین، بیان، معانی، بدیع، قافیہ اور عروض کے دلدادہ اور اُن کی ماہیئت سے کاملاً آگاہ ہوں گے۔ دوسری بات یہ کہ مرثیے کی غایت کو ایک حد تک یوں موڑا جائے کہ مُبکی ہونا تو برقرار رہے لیکن امتدادِ زمانہ نے ہماری اخلاقی اقدار کو جس بھٹی میں ڈالا ہے اُس کے تقاضے بھی ملحوظِ خاطر رکھے جائیں یعنی مرثیے کے الفاظ اُس آنچ سے اِس طرح تپ کر نکلیں جس طرح کُندن نکلتا ہے۔

میرے خیال میں یہی دو باتیں حل کرنے مرثیے کا اصل اصول بن جاتی ہیں۔ مُراد یہ ہے کہ مرثیے کا اَساسی ڈھانچہ (BASIC FRAME WORK) تو قائم رہے۔ لیکن ہر عنصر معاشرت کے تغیر اور زبان کے تبدّل کا سُراغ دے۔

میں نے صفدر صاحب کا جو مرثیہ پڑھا وہ حضرتِ عبّاسؓ کے حالات سے مربُوط تھا۔ اِس مرثیے میں تین چیزیں ایسی ہیں جو اسے تمام پُرانے مرثیوں سے متمیز کرتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ معانی و مضمون کا مرکز ہمیشہ حضرتِ عباسؓ کی ذاتِ گرامی رہتی ہے۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حضرتِ عبّاسؓ ایک ڈھلے ڈھلائے، ترشے ترشائے سانچے میں اُترے ہوئے ٹائپ (TYPE) نہیں رہتے بلکہ ایک متحرک (تمثیلی طور پر متحرک) کردار بن جاتے ہیں۔ ایسا کردار جو بدلتے ہوئے واقعات کے مطابق اپنی ذات کے تغیرات کا اظہار کرتا ہے۔ اِس طرح کردار (ORGANIC) یعنی واقعات کے مطابق بدلنے والا اور متحرک ہو جاتا ہے اور اس میں کسی طرح کا جمود باقی نہیں رہتا چنانچہ

آپ مرثیہ پڑھتے وقت دیکھیں گے کہ جہاں جہاں حضرتِ عباسؑ کسی واقعے میں دخیل ہوئے ہیں اُنھوں نے واقعات کے تمام لوازم کو ملحوظ رکھ کر اپنے عمل کا مظاہرہ کیا ہے۔ کردار نگاری کی یہ صفتِ خاص کمال کی حد تک اُس اَساسی ڈھانچے کے اندر رہی ہے جو عقیدت حضرتِ عباسؑ سے منسوب کرتی ہے یعنی شجاعت، بسالت، امام کی فرماں برداری، طبیعت کا سوز و گداز اور عمل کی گرمی و نرمی!

دُوسری بات جو اِس مرثیے میں خاص طور پر نمایاں نظر آتی ہے وہ اِس کا تمثیلی رنگ ہے۔ اِس کی اُٹھان تمثیلی ہے، واقعات کا عمل اور ردِ عمل، کرداروں کا تصادم اور اُن کی آویزش، غرض تمام تمثیلی سَررشتے مصنفِ موصوف نے بڑی خوبصورتی سے سنبھالے ہیں۔ اور پھر اُنہیں اپنے طے شدہ مقصد کے مُطابق آگے بڑھاتے چلے گئے ہیں۔ یہاں تک کہ حضرتِ عباسؑ کی شہادت کا مرحلہ آن لگتا ہے۔ لیکن یہ واقعہ اُس وقت تک عمل میں نہیں آتا جب تک کہ وہ صحیح معنی میں سقائیٔ اہلِ بیتؑ کا فریضہ اَدا نہیں کر لیتے۔ اِس فریضے کے اَدا کرانے میں فاضل مصنف نے جِس نزاکتِ فکر اور لطافتِ بیان کا ثبوت دیا ہے اُس کے استناد کے لئے میں صرف ایک شعر نقل کرنا کافی سمجھتا ہوں۔ مقام یہ ہے کہ حضرتِ عباسؑ شبِ ہشتم میں فرات سے پانی بھر لاتے ہیں اور خیمۂ امامؑ تک پہنچا دیتے ہیں۔ مرثیے میں اِس موقع کی ڈرامائی کیفیت دیدنی ہے۔ اگر مجھے یہ شبہ نہ ہوتا کہ میں مدح سرائی کرنے بیٹھ گیا ہوں تو میں یہ کہنے میں گریز نہ کرتا کہ جو شعر میں نقل کروں گا وہ اس کیفیت کے تحت کہا جاتا ہے جسے کبھی کشف، کبھی شہود، اور کبھی شعری الہام کا لقب دیا جاتا رہا ہے۔ شعر یہ ہے ؎

جُملہ اطفالِ شہنشاہِ مدینہ نے پیا
پی چکے اصغرِؑ ناداں تو سکینہؑ نے پیا

اِس شعر میں صرف انتظامی صلاحیت ہی تمثیلی انداز میں ظاہر نہیں ہوتی بلکہ خانوادہ

اہلِ بیتؑ کے چھوٹے چھوٹے معصوم بچّے زندگی کے جس سلیقے میں پرورش پاتے ہیں اُس کا اسلوب بھی نہایت خوبصورت طریقے میں ظاہر ہوتا ہے۔

تیسری بات جو اِس مرثیے میں صفدرؔ صاحب کی انفرادیت کو آج کل کے نام نہاد مجدّدین سے جُدا کرتی ہے وہ اُن کا لفظوں پر حیرت انگیز عبور ہے۔ عموماً آج کل کے شعراء (معافی چاہتا ہوں۔ مرثیہ گو شعراء مراد ہیں) مرادفات اور مترادفات میں فرق نہیں کر پاتے کجا یہ کہ اُن لفظوں کی دلالتوں میں فرق کریں جن کے معانی کا فرق صرف اُس عالم کو معلوم ہو سکتا ہے جس نے زبان کو صرف اپنے گھر ہی میں نہ سیکھا ہو بلکہ اربابِ علم کی طرح ہر پہلو سے تحصیلا بھی ہو۔ ایک ایسا منظر جس میں روشنی اور سائے مِل جُل کر ایک طلسماتی کیفیت پیدا کر رہے ہیں اُس کا بیان صفدرؔ کی زبان سے سُنیئے:

سرِ ساحل جو ٹہلتے تھے سلح شور جواں
اُن کو تکتی تھی حقارت سے ہر اک موجِ رواں
روشنی چاند کی دھیمی وہ میانِ میدان
سحرِ نور کا جیسے ہو دُھندلکے میں سماں

یک بیک دُور سے بڑھتے ہوئے سائے دیکھے
کچھ جَری دوش پہ مشکیزے اُٹھائے دیکھے

یہ شاعری نہیں افسوں گری ہے۔ یہ طلسمات نہیں کرامات ہے۔ منظر نگاری اور وصف کا اتنا اچھا امتزاج آج کل کم دیکھنے میں آتا ہے۔

خدا صفدرؔ صاحب کو توفیق دے کہ وہ مرثیے کی تجدید کے لئے برابر کام کرتے رہیں اور زمانے کی اخلاقی اَقدار جو لمحہ بہ لمحہ متغیّر ہوتی چلی جا رہی ہیں اُنہیں ملحوظ رکھ کر اِسی طرح مرثیے کہتے رہیں لیکن شرط یہ ہے کہ نہ تو مرثیے کا اصل مقصد فوت ہو اور نہ خانوادۂ اہلِ بیتؑ کی کوئی ایسی اجنبی شکل اُبھرے جو انہیں انسانیت کی ایسی

عام سطح پر لے آئے کہ جس سے عقیدت کو ٹھیس لگے اور جو مرثیے کو بحیثیت صنفِ سخن نقصان پہنچائے۔ کیونکہ تغیرِ اقدار کو ملحوظ رکھتے وقت بنیادی اقدار کا مسلّم رہنا بھی ناگزیر ہے، ورنہ ہم بتدریج ایسے مقام پر پہنچ جائیں گے جہاں مافوق الفطرت انسانوں کو اپنی ہی سطح پر جانچنے لگیں گے۔

---

روزنامۂ جنگ۔ راولپنڈی

۱۲/ مئی ۱۹۶۵ء

ڈاکٹر سید صفدر حسین ایم اے۔ پی ایچ ڈی۔ اُردو اَدب میں شگفتہ مزاج شاعر اَور نکتہ رَس نقاد کی حیثیت سے معروف ہیں۔ انہوں نے اِحیائے مرثیہ کے سلسلے میں اپنی تحریک حال ہی میں شروع کی ہے۔ صفدر صاحب مرثیے کی کلاسیکی ترتیب، اُس کے بیانیہ وصف اور اُس کی تمثیل کارانہ اہمیت کے قائل ہیں۔ لیکن اِن محدود میں رہ کر وہ جدید اقدار کی عظمت، حقیقت پسندی کی روشنی، تاریخی شعور اور انسانی عظمت کے نئے تصورات کی ترویج چاہتے ہیں۔ اُنہوں نے ابلاغ کے نئے اسالیب کو قبول کیا ہے اور کلاسیکی مرثیے کی ہیئتی ترتیب کو منتشر کیے بغیر اُس کو نئے خیالات، نئے افکار اور نئے اسالیب سے مزین کیا ہے۔

## دُوسرا خط

ادبستان۔ دین دیال روڈ لکھنؤ

۲۶ مارچ ۱۹۶۶ء

عزیز مکرم زاد شرفکم

"آئینِ وفا" اور آپ کی مطبوعہ کتابوں کی فہرست ملی۔ ادھر کچھ دن سے میری طبیعت اچھی نہیں رہتی۔ اس وجہ سے اب تک آپ کو خط نہیں لکھ سکا۔ "آئینِ وفا" میں آپ کے نظریات پڑھے، دوسروں کی رائیں پڑھیں، آپ کی مرثیہ خوانی کی تعریفیں پڑھیں، سب سے بڑھ کر آپ کا بلند پایہ مرثیہ پڑھا۔ دل بہت خوش ہوا اور زیادہ خوش ہوتا چلا گیا۔ خداوندِ عالم آپ کو مرثیے کی عظیم صنفِ سخن کو ترقی دینے اور مرثیہ خوانی کے عظیم فن کو زندہ کرنے کی زیادہ سے زیادہ توفیق کرامت فرمائے۔

خیر اندیش

سید مسعود حسن رضوی

مصطفیٰ حسن رضوی
مُدیر "سرفراز" لکھنؤ

جناب ڈاکٹر سید صفدر حسین صاحب کا ایک گراں قدر اور معیاری مرثیہ حضرت ابوالفضل العباسؑ کی سیرت و حیات پر مشتمل تبصرہ کے لئے ہمیں موصول ہوا ہے۔ اس مرثیہ کا عنوان ہے "آئینِ وفا" اور ۱۰۹ بندوں پر مشتمل ہے۔ ابتدا میں چند مُستند ادیبوں کے تبصرے ہیں اور آخر میں چند رُباعیات اور سلام ہیں۔

اِس بلند پایہ شاعر کا کلام پہلی مرتبہ ہمارے سامنے آیا ہے اور ہمیں یہ دیکھ کر بڑی مُسرت ہوئی کہ پاکستان میں اقبال و جوش کا ہم پلہ بھی ایک شخص موجود ہے، کلام کی پختگی، مضامین کی بندش، خیالات کی آمد، طرزِ ادا، اور اچھوتی ترکیبوں نے اس مرثیہ کے معیار کو عقدِ ثُریا پر پہنچا دیا ہے۔ یہ اُردو ادب کے اعلیٰ شاہکاروں میں ایک خوشگوار اضافہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں مرثیوں کی عام روش سے ہٹ کر شاعر نے اپنے لئے ایک نئی شاہراہ نکالی ہے۔ شروع سے آخر تک مرثیہ کی مرکزی شخصیت حضرت عباسؑ کی ذاتِ گرامی بنی رہتی ہے۔ ہر ہر بند نہیں بلکہ ہر ہر مصرع نُور کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہے، اور اس کا ہر لفظ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک خوش نما انگوٹھی پر ایک بیش بہا نگینہ جڑا ہوا ہے طباعت و کتابت حد درجہ دیدہ زیب ہے ہمیں کتابت کی ایک غلطی کے علاوہ پُوری کتاب میں کوئی غلطی نظر نہیں آئی بس ایک جگہ خلق کی جگہ عشق لکھ دیا گیا ہے معنوی حیثیت کی طرح اس کی صوری حیثیت بھی بہت بلند ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی مبتی

قیمت طلائی ظرف میں عطرِ گلاب رکھا گیا ہے۔

دل تو چاہتا تھا کہ ہم محرّم نمبر میں سارا مرثیہ ہی نقل کر دیں لیکن جگہ کی قلت اس کی اجازت نہیں دیتی اس لئے اس کے کچھ بند پیش کئے جا رہے ہیں۔ پورے مرثیہ کا لطف حاصل کرنے کے لئے ناظرینِ سرفراز "آئینِ وفا" کو کسی ذریعہ سے حاصل کرنے کی کوشش کریں۔

خدا صفدر صاحب کو جزائے خیر دے۔

مطبوعہ: سرفراز لکھنؤ

محرّم نمبر ۱۳۸۶ھ / ۱۹۶۶ء

## مولانا سید ظفر حسن امروہوی

○

اِس وقت میرے پیشِ نظر ادیبِ باکمال اور شاعرِ بے مثال ڈاکٹر سید صفدر حسین صاحب ایم' اے۔ ایل ایل بی۔ پی' ایچ' ڈی۔ پرنسپل گورنمنٹ کالج جوہر آباد کا ایک مطبوعہ مرثیہ "آئینِ وفا" جنابِ عباسؑ کی شان میں ہے جس کے ۱۰۹ بند ہیں۔ طباعت وکتابت نہایت دِل افروز و دیدہ زیب ہے۔ مجلّد گرد پوش نہایت خوش نما ہے۔

میں نے اِس مرثیہ کو دو تین بار پڑھا۔ ہر بار وجدانی قوت جاگ اٹھی۔ ڈاکٹر صاحب کی شاعری تو شباب کی ترنگیں بھر رہی ہے اور میں غریب پیری کی لکد کوب میں پڑا سسک رہا ہوں۔ دماغی صلاحیتیں ختم، جوشِ طبیعت و تخیل مفلوج، قلم کی رفتار سست' اس حالت میں اس بلند پایہ کلام اور گرانمایہ نظم پر کیا تبصرہ کروں' وہ دِل و دماغ کہاں سے لاؤں' وہ طبیعت کا زور کہاں پاؤں جس کے بل بوتے پر بے شمار مصنفوں کے سرمایۂ فکر پر لمبے چوڑے تبصرے لکھ ڈالے۔

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں

حقیقت یہ ہے کہ اس گراں پایہ کلام کی تعریف کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی فکرِ سخن اور فنی ترقی نے مجھے حیرت میں ڈال دیا ہے۔ اِنّ مِنَ البیان لسحرا۔ ایسے ہی بیان کا آئینہ دار ہے۔ صفدر صاحب نے شاہراہِ عام سے ہٹ کر اپنے لئے ایک نیا راستہ نکالا ہے' اور خوب نکالا ہے۔ وہ ایک مجددانہ انداز میں پورے اقتدار

کے ساتھ سرگرم رفتار ہیں تخیّل و محاکات نظم کی جان اور رخسارِ شاعری کا گلگونہ ہیں ایک ناقد کی نگاہ کسی نظم میں پہلے یہ تلاش کرتی ہے کہ شاعر کو ان دونوں کے دلآویز بنانے اور نقوشِ فطرت سے قریب تر کرنے میں کہاں تک کامیابی حاصل ہوئی ہے، میری نظر نے بھی اس مرثیہ میں جستجو کی تو پتا چل گیا کہ ڈاکٹر صاحب نے دونوں میدان مار لئے ہیں۔ "نور" کے اوراق میں اتنی گنجائش نہیں کہ نمونے پیش کر سکوں: نگاہوں کے ذریعہ دل نے جو مزہ لوٹا، افسوس ہے کہ وہ زبانِ قلم پر نہ آسکا۔ اس مرثیہ کا دروبست اور واقعاتی ترتیب کچھ ایسے اہتمام سے ہے کہ جنابِ عباسؑ کی وفاداری کا ایک مسلسل مرقع بنتا چلا گیا ہے۔ اور قدرتِ کلام نے اِس خوبی سے ہر موقع کو اپنے رشتۂ سخن میں پرو دیا ہے کہ چمکتے موتیوں کی ایک دلکش لڑی بن گیا ہے۔ اگر وفا کا کوئی مادّی پیکر ہوتا تو یہ نورانی لباس اس پر ایسا فٹ ہوتا کہ کہیں جھول نظر نہ آتا۔ یہ شاعر کی قادرالکلامی کا روشن ثبوت ہے۔ صنائع و بدائع کو نظر انداز کر کے ڈاکٹر صاحب نے اشعار کی رگ رگ میں جوش بھر دیا ہے پھر طُرّہ یہ کہ خاندانِ اہلِ بیتؑ کی مخصوص تہذیب کا کوئی پہلو نظر انداز نہیں ہونے دیا۔ ہر منزل پر جنابِ عباسؑ کی وفا اپنی پوری تابش کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ آمد کا یہ حال ہے کہ جیسے سمندر میں سیلاب آرہا ہو کیا ممکن کسی مصرع میں آورد کا نام آجائے۔ اُن کا ذوقِ شاعری پوری قوّت سے ہر پہلو کو گرماتا چلا گیا ہے۔" اللہ کرے زورِ سخن اور زیادہ": اسلوبِ بیان میں جدّت طرزِ نگارش میں نُدرت، سلاست و صفائی پر قُدرت، اس مرثیہ کے نمایاں خدوخال اور اس گلستانِ نظم کے لہکتے مہکتے پھول ہیں سب سے بڑی بات یہ ہے کہ منقبت کی بنیاد حقائق پر ہے مفروضات پر نہیں۔ وقت ملتا اور صفحاتِ "نور" میں گنجائش ہوتی تو اس چمن کی بہار دکھاتا، صرف دو تین پھولوں کے پیش کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔ باقی بشاعر کے حق میں دُعا:

جذبۂ شیرِ خدا ۔ قوّتِ ایمانِ حسینؑ
ایک جا زورِ علیؑ حسنِ حسنؑ شانِ حسینؑ

---

فیضِ شبیہؑ سے ذرہ میں ذہک آنے لگی
غنچہ چٹکا گلِ زہراؑ کی مہک آنے لگی

نکلے دریا سے تو خون اپنا بہاتے نکلے
ریگِ ساحل کو لبِ خشک دکھاتے نکلے
عشق اور فرض کی تقدیر جگاتے نکلے
صبر و ایثار کی تاریخ بناتے نکلے

پیاس اس طرح سے ٹھکرا دے بھلا پانی کو
موڑ دیتی ہے وفا فطرتِ انسانی کو

مطبوعہ ماہنامہ نور کراچی
شمارہ اپریل ۱۹۶۶ء

---

مرزا مصطفےٰ علی ہمدانی

○

میں نے آپ کا مرثیہ "آئینِ وفا" کئی بار پڑھا اور ہر بار پہلے سے زیادہ غذائے روحانی حاصل کی۔ اسے ستائش نہ سمجھیے بلکہ یہ اظہارِ حقیقت ہے۔ قدرت نے آپ کے قلم میں روانی اور بیان میں زور عطا کیا ہے۔ جدید اندازِ فکر کے باوجود مرثیے کا مقصدِ وحید کہیں بھی فوت نہیں ہونے دیا۔ برادرِ گرامی حضرتِ عابد کے الفاظ میں "یہ شاعری نہیں کرامات ہے۔" دو لفظ مجھے بھی کہنے کی اجازت دیجئے۔ یہ سراسر تائیدِ ایزدی اور شہیدانِ وفا کی امانت کا کرشمہ ہے۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ!

۱۱ر مئی ۱۹۶۶ء

سید آلِ رضا

○

مکرمی جناب صفدر صاحب تسلیم

عطیۂ "آئینِ وفا" کا بہت بہت شکریہ۔ مرثیہ بہت خوب ہے۔ خدا آپ کو اِس سے زیادہ نیک توفیق عطا فرمائے اور بہتر سے بہتر مرثیے کہنے کا شرف بخشے۔

اُمید کہ مزاجِ گرامی بخیر ہوگا۔

داعی بالخیر

آلِ رضا

۱۱ر مارچ ۱۹۶۶ء

زائر سیتاپوری

○

مکرمی تسلیم۔ غالباً آپ مجھ کو بھول گئے۔ یادش بخیر میری آپ کی ملاقات جناب نسیم امروہوی کی قیام گاہ پر لکھنؤ میں کئی مرتبہ ہوئی۔ یہ اُس وقت کی بات ہے جب آپ "مرثیہ بعدِ انیس" پر مقالہ لکھ رہے تھے۔ اِس طرف برادرِ عزیز ناؔدم صاحب سلمہٗ نے آپ کا مرثیہ دکھایا۔ سبحان اللہ کیا زورِ قلم، کیا تنوع ہے! حضرت عباسؑ علمبردار کا کردار اپنی خصوصیات کی بنا پر واقعۂ کربلا میں ایک مخصوص مقام رکھتا ہے۔ شاعر کا یہ کام ہے کہ وہ ماضی کے دُھندلے نقوش اُجاگر کرے، اس نظریے سے آپ نے پوری کامیابی حاصل کی ہے۔

۱۶ مارچ ۱۹۶۶ء

محمد اکبر الدین صدیقی

○

"آئینِ وفا" دراصل سیرت وحیاتِ حضرتِ ابوالفضل العباسؑ کے بیان میں ایک مرثیہ ہے۔ کتاب کی ابتدا تقریظوں سے ہوتی ہے۔ پروفیسر عابد علی عابد، مجتبیٰ حسین، مولانا ماہرالقادری اور ڈاکٹر محمد احسن فاروقی نے مرثیہ نگاری اور ڈاکٹر صفدر صاحب کی مرثیہ خوانی پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اور یہ واضح کیا ہے کہ دولہا صاحب عروج کے بعد ڈاکٹر صفدر صاحب ہی نے مرثیہ خوانی کا ایک خاص انداز پیش کیا ہے۔

حضرتِ عباسؑ کے کارناموں پر تقریباً ہر مرثیہ نگار نے اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے، ان کے کارنامے نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کئے ہیں، ان کی وفاداری اور طریقِ جنگ کے اظہار میں شعراء اپنی بہترین صلاحیتوں کو بروئے کار لائے ہیں۔ ڈاکٹر صفدر صاحب نے بھی اسی انداز میں اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے اور تمام شعری محاسن کو مرثیہ میں سمونے کی کوشش کی ہے جس سے "آئینِ وفا" حضرتِ عباسؑ کی شان میں ایک بلند پایہ مرثیہ کی شکل میں ہمارے سامنے ہے۔ اس کا صرف ایک بند یہاں پیش کیا جاتا ہے ؎

بس کہ عاشور کے دن سخت تھی عباسؑ کی پیاس　　پھر بھی دریا میں جو اُترے تو بے جمع حواس
یوں بھری مشک کہ حیراں ہوئے خضرؑ و الیاسؑ　　خشکیٔ آب کو آنے نہ دیا ہاتھ کے پاس
آبرو فرض کو توقیر وفا کو بخشی
تپشِ نو دلِ اربابِ ولا کو بخشی

نزاکتِ خیال کی ایسی مثالیں مرثیہ میں مختلف مقامات پر ملیں گی، اس سے شاعر کی قوتِ مدرکہ اور رفعتِ تخیل کا اندازہ ہوتا ہے۔ مذہبی نقطۂ نظر کے علاوہ ادبی نقطۂ نظر سے بھی "آئینِ وفا" آنکھوں سے لگانے کے قابل ہے۔

مطبوعہ ماہنامہ "سب رس"
حیدر آباد (دکن)
جولائی ۱۹۶۶ء

ماہنامہ "معارف" اعظم گڑھ

○

جناب صفدر حسین ایک قادر الکلام شاعر ہیں، مرثیوں کا اُن کو خاص ذوق ہے، چنانچہ اُن کے مرثیوں کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں، یہ مجموعہ (آئینِ وفا) بھی تاریخ کربلا کے ایک اہم کردار حضرت عباسؑ بن علیؑ کا مرثیہ ہے، جس میں اُن کے مختلف اوصاف کمالات خصوصاً ایثار، جاں بازی اور حضرت امام حسینؑ سے اُن کے اخلاص و وفا کا نہایت کامیاب مرقع پیش کیا ہے۔

مطبوعہ ماہنامہ "معارف"
اعظم گڑھ
اکتوبر ۱۹۶۶ء

ماہنامہ "شاعر" بمبئی

○

ڈاکٹر سیّد صفدر حسین جدید و قدیم رُجحاناتِ شعر و اَدب سے بخوبی واقف اور ایک پُختہ مشق شاعر و ادیب ہیں۔ نظم کی طرح اُنھیں نثر پر بھی قدرت حاصل ہے، وہ مدّت مدید سے لکھ رہے ہیں۔ "آئینِ وفا" سے پہلے اُن کے دو شعری مجموعے "رقصِ طاؤس" اور "چراغِ دیر و حرم" شائع ہو کر ادبی حلقوں کو متاثر کر چکے ہیں۔

"آئینِ وفا" کی اشاعت سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ وہ جدید دَور کے کامیاب ترین مرثیہ نگار ہیں، نہ صرف یہی بلکہ مرثیہ خوانی میں بھی اپنا جواب نہیں رکھتے۔ اس کتاب کے نثری حصّے میں سیّد مجتبیٰ حسین، ماہر القادری اور ڈاکٹر محمد احسن فاروقی نے الگ الگ تین مجالس کا آنکھوں دیکھا تفصیلی حال بیان کیا ہے۔

یہ حضرات لکھتے ہیں:۔

"صفدر صاحب نے حقیقتاً مرثیہ خوانی کے فن کو جو زمانے کے چکّر سے ختم ہوتا جا رہا تھا، نئی زندگی بخش دی ہے اور مرثیہ نگاری میں بھی نیا راستہ پیدا کر دیا ہے۔" (ڈاکٹر محمد احسن فاروقی)

"مرثیہ خوانی میں اُن کو مَیں بہت بڑا مُمثّل سمجھتا ہوں اور اپنی اس رائے کی صحت و اصابت پر مجھے اصرار ہے۔ جو ڈاکٹر صاحب موصوف کو ایک بار مرثیہ پڑھتے سُن لے گا، وہ بار بار سننے کی تمنّا کرے گا۔"

(ماہر القادری)

"ایسا پڑھنے والا سامعین نے کم ہی دیکھا ہوگا۔ صفدر صاحب نے مرثیہ خوانی کا ایک نیا معیار قائم کر دیا جس میں جدید و قدیم دونوں رنگ کا امتزاج ہے۔ یہ صفدر صاحب کا منفرد رنگ ہے جس میں کوئی اُن کا ہمسر نہیں ہے۔"

(سیّد مجتبیٰ حسین)

"آئینِ وفا" حضرتِ ابوالفضل العباسؑ کے بیانِ سیرت و حیات میں ایک طویل مرثیہ ہے۔ یہ اپنے آغاز سے اختتام تک زورِ بیان، نزاکتِ فکر اور اسلوب کی لطافت کا بہترین مظہر ہے۔ مرثیہ کا تمثیلی رنگ انتہائی گہرا اور تاثر بہت تیز ہے۔ دوسرے مرثیہ نگار شعراء نے بھی حضرتِ عباسؑ کی وفاداری اور اُن کی منفرد شخصیت کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ واقعاتِ کربلا میں عباسؑ علمدار کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ اُن کا کردار اپنی مثال آپ ہے۔ اس کردار کی ڈاکٹر صفدر حسین نے اپنے مرثیہ میں بڑی دلدوز مگر خوبصورت تصویر کشی کی ہے۔ یہ حضرتِ عباسؑ کے دخیلِ کارزارِ کربلا ہونے سے اُن کی شہادت تک کی ایک مربوط و متحرک تمثیل ہے۔ بطورِ نمونہ صرف تین بند پیش کئے جاتے ہیں:

شاہ تھے حلم سے مجبور رضا کیا دیتے!
حُر کے انجام سے واقف تھے سزا کیا دیتے
اپنے پروانے کو شعلوں کی ہوا کیا دیتے
حُر تھا حُر، اُس کو دعاؤں کے سوا کیا دیتے

سب کو سمجھا کے ولی ابنِ ولی نے روکا
اپنے ضیغم کو حسینؑ ابنِ علیؑ نے روکا

بسکہ عاشور کے دن سخت تھی عباسؑ کی پیاس
پھر بھی دریا میں جو اُترے تو رہے جمع حواس

یوں بھری مشک کہ حیراں ہوئے خضرؑ والیاسؑ
خنکیِ آب کو آنے نہ دیا ہاتھ کے پاس
آبرو فرض کو، توقیر وفا کو بخشی
تپشِ نور دلِ اربابِ ولا کو بخشی

نکلے دریا سے تو خون اپنا بہاتے نکلے
ریگِ ساحل کو لبِ خشک دکھاتے نکلے
عشق اور فرض کی تقدیر جگاتے نکلے
صبر و ایثار کی تاریخ بناتے نکلے
پیاس اِس طرح سے ٹھکرا دے بھلا پانی کو
موڑ دیتی ہے وفا فطرتِ انسانی کو

مرثیہ میں اِسی طرح کے بہت سے بند ہیں جن میں الفاظ کا در و بست اور قوتِ اظہار اپنی انتہا پر ہے، پورے مرثیہ میں قدیم مراثی کی طرح کہیں بھی مبالغہ آرائی سے کام نہیں لیا گیا ہے۔ جدید دَور کے مراثی کی نہج کیا ہونی چاہیے؟ "آئینِ وفا" اس کی ایک کامیاب مثال ہے۔ مرثیہ نگاری کی زوال پذیری کے بعد ڈاکٹر سید صفدر حسین کی یہ کاوش و جدتِ فکر اس اہم صنفِ سخن کو شاید پھر سے زندہ کر دے۔ اُنھوں نے اس کتاب میں مرثیہ نگاری پر نثر میں جو اظہارِ خیال کیا ہے وہ قابلِ غور و فکر ہے۔ اُنھوں نے اس فن کی تجدید کے سلسلے میں اپنے دَور کے سیاسی، سماجی، تمدنی اور تہذیبی تقاضوں کے علاوہ جدید فنی و شعری ضروریات پر زور دیا ہے۔ اُنھوں نے لکھا ہے کہ عظمتِ حسینؑ کو محدود مذہبی نقطۂ نظر سے پیش کرنا یا روایات و منقولات کے دائرے میں چکر کاٹتے رہنا آج مناسب نہیں۔ حسینی پیغام کا مطالعہ موجودہ نظریۂ انسانیت کی روشنی میں کرنا چاہیے۔ حسینؑ نے خدمتِ خلق، ایثار، اُخوت، مساوات، سرفروشی، ثبات و استقلال

اور حُرّیت و آزادی کا جو غیر فانی پیغام دیا ہے، جدید شاعر اُس پیغام میں اسلامی صداقتوں کا رنگ بھر کر ہر نسل، ہر قوم اور ہر مذہب و عقیدے کے انسانوں کے سامنے رکھ کر انھیں حُسینیت کی طرف دعوت دے سکتا ہے۔ اس سلسلے میں اُنھوں نے اپنے اُن پیش روؤں میں جنھوں نے عزائی شاعری کو جدید انداز عطا کیا، سیمابؔ، جوشؔ اور جمیلؔ مظہری کا ذکر تفصیل سے کیا ہے۔

کتاب کی ابتدا میں "قدرِ سُخن" کے عنوان سے سیّد عابد علی عابدؔ کا مرثیہ نگاری اور صفدر صاحب کے فن پر عالمانہ اظہارِ خیال ہے۔

بہترین کتابت، اعلیٰ کاغذ اور آفسٹ کی روشن طباعت نے کتاب کو اور بھی جاذبِ نظر بنا دیا ہے۔

مطبوعہ ماہنامہ "شاعر" بمبئی

نومبر ۱۹۶۶ء

مولانا نجم الحسن کراروی

○

مرثیہ نگاری کی قدیم و جدید قدروں کا حسین امتزاج زیرِ تبصرہ مرثیہ "آئینِ وفا" میں جس طرح پیش کیا گیا ہے اُسے ڈاکٹر صفدر صاحب کی معجزانہ تخلیقات کا قرینہ دار کہنا چاہیئے۔ یہ مرثیہ قمرِ بنی ہاشم، علم دارِ حسینی حضرتِ عباس ابنِ علی علیہم السلام کی شہادت کے متعلق ہے، جس میں ڈاکٹر صاحب کا قلم، فصاحت و بلاغت کے انمول موتی بکھیرتا ہوا، کردار نگاری کا پورا پورا حق ادا کرتا چلا گیا ہے۔ اوّل سے آخر تک ایک ہی تاثر قائم رہتا ہے تمثیلی رنگ نے مرثیے کو اور بھی جلا بخشی ہے۔ زبان و بیان کی شگفتگی، قدرتِ فکر اور اطاعتِ خیال کی ہم آہنگی کا ثبوت ہے، جس میں ہمّتِ حیدری کا پُرشکوہ و پُرجلال منظر، مجسّم بن کر آنکھوں کے سامنے چلتا پھرتا نظر آتا ہے۔ مدحیہ شعروں کے پیچ و خم، زنجیر کی کڑیوں کی طرح ایک دوسرے سے مربُوط ہیں۔ منظر نگاری پورے عروج پر ہے۔ رزمیہ کیفیات، دلکش حسین اور دلفریب ہیں۔ شہادت کے واقعات ممدوح کی سیرت و شجاعت کے روشن چراغ ہیں۔ مختصر یہ کہ پورا مرثیہ صنفِ سخن کے اعتبار سے اپنے مخصوص سلیقوں اور قرینوں کی مکمّل تصویر ہے، جس میں جذب و کشش کے ساتھ ساتھ ہمہ گیری بھی ہے اور پذیرائی بھی غنیمت ہے کہ ڈاکٹر صاحب موصوف روایتی مرثیہ نگاری کے دائروں کو جدید تقاضوں کے پیشِ نظر وسیع تر کرنے والوں میں پیش پیش ہیں..... ڈاکٹر صاحب موصوف کی شخصیت مرثیہ نگاری کی تاریخ میں اپنی انفرادیت کے لحاظ سے اپنا ایک خاص مقام حاصل کر چکی ہے، اِس لئے وہ پوری

قوم کے شکریے کے مستحق ہیں کیونکہ اُن کا اصلاحی جذبہ اور فنی شعور کی گہرائیاں تبلیغِ دین کے لیئے مفید ترین عوامل ثابت رکھتی ہیں...... اُمید ہے کہ قارئین مرثیہ مذکور کے چند بند ملاحظہ کرنے کے بعد میرے تاثراتِ قلبی کی تائید فرمائیں گے۔

(مدح)

دودھ سے ماں کے ملی جرأت و ہمت اِن کو
خونِ حیدرؑ نے دیا جوشِ شجاعت اِن کو
خُلقِ شبّرؑ نے سکھائی ہے مروّت اِن کو
عزمِ شبّیرؑ نے بخشی ہے جلالت اِن کو
جذبۂ شیرِ خدا، قوّتِ ایمانِ حسینؑ
ایک جا زورِ علیؑ، حُسنِ حسنؑ، شانِ حسینؑ

(چہرہ)

جلوۂ نورِ حسینی کی ہے اس میں ضَو
اِن کے آئینے پہ ہے شیرِ خدا کا پَرتَو
پہنچی اِس شمع میں سوزِ دلِ شبّیرؑ کی لَو
آئینِ مصحفِ رُخسار میں پیدا ہوئیں ستو
فیضِ شبّیرؑ سے ذرّے میں دمک آنے لگی
غنچہ چٹکا گُلِ زہراؑ کی مہک آنے لگی

(مکالمہ)

کہا للکار کے او حاکمِ سفاک خموش
والیٔ شام ہے کیا اے سگِ ناپاک خموش
اُس کی بیعت کرے سبطِ شہِ لولاک خموش
منہ سے کیا کہہ گیا تو منہ میں ترے خاک خموش
دیکھتا کیا ہے اِدھر آنکھ دکھانے والے
کس سے دبتے ہیں محمدؐ کے گھرانے والے

(رجز)

تجھ میں ہمت ہو تو آ دیکھ شجاعوں کا جلال
ہم وہ ہیں چیر کے رکھ دیتے ہیں مہتاب کی ڈھال
جب اُٹھاتے ہیں نظر مہر کو آتا ہے زوال
لیں جو انگڑائی تو ٹوٹے یہ ستاروں کا جال

ہم جو گرجیں تو پہاڑوں کے جگر ہلتے ہیں
قصرِ بدعت کی بنا ہلتی ہے در ہلتے ہیں

زیرِ نظر مجموعۂ کلام کی کتابت و طباعت بے حد خوش نما ہے۔ سرورق نہایت دیدہ زیب اور رنگین ہے۔ گرد پوش "آئینِ وفا" کے پس منظر کا حامل، گویا اس مجموعے کی خریداری ہم خرما وہم ثواب کا مصداق ہے۔

مطبوعہ ہفت روزہ "شہابِ ثاقب" پشاور
یکم جنوری ۱۹۶۷ء

سید مسعود رضا مرحوم

پیارے ڈاکٹر صفدر صاحب! تسلیم
"نقشِ قدم" میں "آئینِ وفا" کے یہ نوادر نظر سے گذرے،

عزم وہ جس کے لئے تنگ ہو ظرفِ کونین
وہ شجاعت جو بنی قوتِ بازوئے حسینؑ
وہ جلالت کہ جو تھی آیتِ ربّ الثقلین
ہمہ تن حوصلۂ فاتحِ صفین و حُنین

سربسر باپ کے اوصاف کی تنویر لئے
آئنہ عرش سے اُترا وہی تصویر لئے

پیاس اس طرح سے ٹھکرا دے بھلا پانی کو
موڑ دیتی ہے وفا فطرتِ انسانی کو
پیکرِ خاک میں حیدرؑ کی دُعا تھے عباسؑ

کس قدر لاجواب! اور آپ نے جب یہ مرثیہ اپنے سحر آفریں انداز میں پڑھا ہوگا تو مجلس میں کیا کیف آگیں تاثر پیدا ہوا ہوگا! کاش کہ میں بھی اِس یادگار مجلس میں شریک ہو سکا ہوتا۔

لاہور
۶ فروری ۱۹۶۷ء

پروفیسر آغا سُہیل

○

کراچی میں ایک نئے دبستانِ شاعری کے آثار پیدا ہوئے۔ نسیمؔ امروہوی اور آلِ رضا تو کراچی میں تھے ہی، جوشؔ پہنچے تو مرثیے کی صنف پر از سرِ نو توجہ دی اور مرثیے نے جوشؔ کے افکارِ تازہ اور جوشِ بیان سے فیض اُٹھایا۔ اسی اثنا میں ڈاکٹر صفدر حسین نے بھی مرثیہ کہنا شروع کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے مرثیے پر ایک بار پھر بہار آنے لگی۔۔۔۔۔۔

پاکستان میں مرثیے کو فروغ دینے میں سیّد آلِ رضا، نسیمؔ امروہوی، جوشؔ ملیح آبادی اور صفدر حسین جیسے باکمالوں کے نام نمایاں ہیں۔

آلِ رضا، نسیمؔ امروہوی، جوشؔ اور صفدر حسین اس زمانے کے مرثیہ گو حضرات ہیں۔۔۔۔۔ صفدر صاحب نے تو ابھی مرثیہ کہنا شروع کیا ہے اور اُن کی اُٹھان ہی بتا رہی ہے کہ آئندہ صنفِ مرثیہ کو جن مضبوط ہاتھوں کی ضرورت تھی وہ اُسے میسر آچکے ہیں۔"

"عظمتِ انسان" صفحہ ۲۲۶ تا ۲۲۸

ڈاکٹر احراز نقوی

○

بیسویں صدی کے بڑے شاعروں نے اس صنف سے کوئی تعلق نہیں رکھا۔ دوسرے قبیل کے شاعر اس صنف میں طبع آزمائی کرتے رہے۔ اس نہج پر جوشؔ ملیح آبادی کی واحد شخصیت ہے جس نے مرثیے کی طرف بھی توجہ کی اور مرثیے کو جدید رنگ میں پیش کیا۔ نئے فکری موضوعات اور جدید فنی تقاضوں کو سامنے رکھ کر مرثیہ کہا.....

جوشؔ کے علاوہ ڈاکٹر صفدر حسین بھی اِس منزل کے نئے راہی ہیں۔ ابھی حال میں حضرتِ عباسؑ کی شہادت پر ایک طویل مرثیہ قلمبند کیا ہے۔ مرثیہ گوئی سے گریز کے اس دَور میں ڈاکٹر صفدؔر کا مرثیے سے دلچسپی لینا ایک فالِ نیک ہے اور اُن کی یہ فنی کاوش ہمارے جدید مرثیے کی تاریخ میں بڑی مستحسن قرار دی جائے گی۔"

"عظمتِ انسان" صفحہ ۲۱۰ و ۲۱۱

جدید مرثیہ نگاری میں جوشؔ اور ڈاکٹر صفدؔر کے ساتھ آلِ رضا کا یہ مرثیہ (عظمتِ انسان) جدید مرثیے کی تاریخ میں فالِ نیک کا درجہ رکھتا ہے اور آئندہ کے لئے ایک نئی راہ متعین کرتا ہے۔

"عظمتِ انسان" صفحہ ۲۱۷

گسریٰ منہاس

○

"آئینِ وفا" کے عنوان سے ڈاکٹر سید صفدر حسین نے حضرتِ عباسؑ کا مرثیہ لکھا ہے جسے مکتبۂ دانش افروز۔ کرشن نگر لاہور نے شائع کیا ہے۔ صفحات ۱۴۰ قیمت تین روپے ہے۔ کتاب نہایت دیدہ زیب چھپی ہے۔ بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ ہمارے ملک میں کم کتابیں اتنی دِل آویز اور خوبصورت چھپتی ہیں۔ شروع کے ۴۸ صفحات میں ڈاکٹر صفدر کے تنقیدی نظریات اور بعض نامور نقّادوں کے مضامین ہیں۔ اصل مرثیہ صفحہ ۴۹ سے شروع ہوتا ہے جو ۱۰۹ بند پر مشتمل ہے۔

اِس گئے گذرے دَور میں جب دُنیا بھر میں اخلاقی قدریں شکست و ریخت ہو رہی ہیں، یہ امر نہایت خوشگوار ہے کہ بعض اہلِ فکر سر دھڑ کی بازی لگا کر حمایتِ حق اور خدمتِ دین میں منہمک ہیں۔ ڈاکٹر صفدر حسین کا شمار بھی ایسے ہی گنتی کے چند افراد میں ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں خالص فنّی اعتبار سے بھی یہ مرثیہ فکر انگیز ہے۔ اور اس کے مصنف مستحقِ مُبارک باد ہیں۔

اِس مرثیے سے ڈاکٹر صفدر کی قدرتِ کلام کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ۱۰۹ بند کا مرثیہ پُرانے زمانے کے معیار کے مطابق بھی خاصا طویل کہلایا جائے گا اور اس میں اگر کہیں کہیں ناہمواریاں ہوں، تو حیرت انگیز نہیں لیکن بحیثیتِ مجموعی پختگیِ کلام، صفائیِ زبان اور قدرتِ اظہار کا تاثر پیدا ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے کلاسیکی اَدب کا مطالعہ بغور کیا ہے اور اِس سے پورا پورا فائدہ بھی حاصل کیا ہے۔

مرثیے کی اُٹھان بہت اچھی ہے۔

سالکِ منزلِ تسلیم و رضا تھے عباسؑ      نیّرِ بُرجِ امامت کی ضیا تھے عباسؑ
پیکرِ خاک میں حیدرؑ کی دُعا تھے عباسؑ      بہرِ شبیرؑ مشیّت کی عطا تھے عباسؑ
اہلِ حق اِن کو زعیم الشہدا کہتے ہیں
اِن کے اخلاص کو معیارِ وفا کہتے ہیں

اِن کی تخلیق ہوئی دین کی نُصرت کے لیۓ      فرض نے اِن کو چُنا اپنی وضاحت کے لیۓ
چہرۂ تصویر بنا رنگ شہادت کے لیۓ      اِن کی تلوار بنی ہاتھ مشیّت کے لیۓ
گُلِ زہرؑا نہ سہی سروِ چمن ہیں یہ بھی
مہرِ تابانِ امامت کی کرن ہیں یہ بھی

اندازِ بیان عموماً صاف اور سُلجھا ہوا ہے۔

جب اہلِ بیتِ رسولؐ پر پانی بند ہوا تو حضرتِ عباسؑ، جناب امام حسین علیہ السلام کی خدمت میں عرض کرتے ہیں ؎

قافلہ عُمر کا منزل کی طرف جاتا ہے      یہ غلام آپ کا ساحل کی طرف جاتا ہے

یہ تقریر جو حضرتِ عباسؑ کی طرف سے اجازت طلبی کی حیثیت رکھتی ہے نہایت موثر ہے ؎

اب تو حضرت سُنی جاتی نہیں بچّوں کی فغاں      کیا گلا کاٹ کے مر جاؤں میں یا شاہِ زماں
میرا مُنھ دیکھ کے رہ جاتے ہیں طفلِ ناداں      گاہ آ آ کے دکھاتے ہیں مجھے خشک زباں
دِل پہ گھِر کر الم و غم کا سحاب آتا ہے
پسرِ ساقیٔ کوثر ہوں حجاب آتا ہے

وعدہ کرتا ہوں کہ تلوار نہ لے جاؤں گا      مشکیں خاموشی سے بھر لوں گا چلا آؤں گا
صبرِ حضرت کا نمونہ اُنھیں دکھلاؤں گا      سر جھکا کر تبر و تیر و سناں کھاؤں گا

ایک نیزے کی اجازت ہو ضرورت کے لیے
وہ بھی اپنی نہیں مشکوں کی حفاظت کے لیے

جنگ کا حال جہاں نظم ہوا ہے وہاں اندازِ بیان حقیقی معنی میں رزمیہ ہو گیا ہے اور یہ بات واقعی قابلِ داد ہے۔ حضرتِ عباسؑ کے سیرت نگار کے لئے یہ ازبس ضروری ہے کہ وہ رزمیہ اندازِ بیان پر قدرت رکھتا ہو۔ اور شجاعانہ کردار کو اُبھار سکے۔ صفدر صاحب اِس کام کو بخوبی انجام دے سکے ہیں۔ جنابِ عباسؑ کی جوانی کا نقشہ کھینچتے ہوئے کہتے ہیں ؎

دل سے آواز یہ آتی ہے اُجالا کیجیے
عزم کہتا ہے کہ دُنیا تہہ و بالا کیجیے

ولید نے جب امامِ حسینؑ سے بیعت طلب کی تو اُس موقع پر کہتے ہیں ؎

کی جو حاکم نے ذرا تیز نظر سوئے حسینؑ
آگیا تیغ بکف قوّتِ بازوئے حسینؑ
کہا للکار کے او حاکمِ سفّاک خموش    والیِ شام ہے کیا اے سگِ ناپاک خموش
اُس کی بیعت کرے سبطِ شہِ لولاک خموش    منھ سے کیا کہہ گیا تو منھ میں ترے خاک خموش
دیکھتا کیا ہے اِدھر آنکھ دکھانے والے
کس سے دَبتے ہیں محمدؐ کے گھرانے والے

میدانِ کربلا میں حضرتِ عباسؑ کی رفاقت کا ذکر یوں کرتے ہیں ؎

تا بہ عاشور رہے کارِ امامت میں شریک
جس طرح شبّرِ خدا کارِ رسالت میں شریک

امامِ تشنہ کام، عباسؑ جواں ہمّت کو سمجھا رہے ہیں ؎

دیکھتا ہوں میں مشیّت کے اشارے عباسؑ    تم نہ سو گے اِسی دریا کے کنارے عباسؑ

موجیں دہرائیں گی افسانے تمہارے عباسؑ مرے پیارے مرے اللہ کے پیارے عباسؑ

سیرتِ جعفرِ طیاّر دکھانا ہے تمہیں
ایک تاریخ یہاں آ کے بنانا ہے تمہیں

اِدھر جوان ہمتی کا یہ عالم ہے کہ دریا میں اُتر کر مشک بھر لیتے ہیں لیکن ؎

خُنکیِ آب کو آنے نہ دیا ہاتھ کے پاس

آبرو فرض کو توقیر وفا کو بخشی تپشِ نو دلِ اربابِ وِلا کو بخشی

غرضیکہ شاعر کا تجزیہ حضرتِ عباسؑ کی سیرت کے باب میں یہ ہے کہ اُن کی سیرت عشق کا معجزہ تھی۔ اور اُن کی شجاعت ایمان کا کرشمہ!

مرثیے میں بعض مصرعے لاجواب ہیں۔ ؏

تیغ پر ہاتھ تھا اور دوش پہ بے چین تھی ڈھال

کتنا اچھا نقشہ کھینچا ہے۔ ؏

اور دبے پاؤں بڑھی آٹھویں تاریخ کو شام

وقت کا بغیر محسوس کیئے ہوئے آگے بڑھنا بڑی خوبصورتی سے ظاہر کیا ہے ؎

دل شگفتہ تھے دلیروں کے چمن کی صورت دستِ فولاد میں نیزے تھے کرن کی صورت

اوّل تو یہ ٹیپ بہت چُست ہے، دوسرے یہ کہ بات نئے انداز سے پیش کی گئی ہے۔ فولادی ہاتھوں میں چمک دار نیزے سورج کی کرن معلوم ہوتے تھے!

اِس مرثیے پر قدیم مرثیہ گویوں کی چھاپ گہری نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر صفدر میر انیسؔ سے بہت متاثر ہیں۔ مثلاً ؎

پیاسے بچّوں کے بلکنے کی صدا آنے لگی بُوئے خوں لے کے ترائی سے ہوا آنے لگی

جذبۂ شیرِ خدا قوتِ ایمانِ حسینؑ ایک جاں نذرِ علیؑ حُسنِ حسنؑ شانِ حسینؑ

روشنی چاند کی دھیمی وہ میانِ میداں سحر نور کا جیسے ہو دھندلکے میں سماں

ع جب بڑھی عمر لڑکپن سے جوانی کی طرف
آتے ہی گھیر لیا شمع کو پروانوں نے
ہاتھ میں بیٹے کے جب باپ کی تلوار آئی

کہیں کہیں تواردبھی ہوگیا ہے۔

تُو زباں خشک جو اپنی مجھے دکھلاتا ہے  پسرِ ساقیِ کوثر کو حجاب آتا ہے (انیسؔ)
دِل پہ گھر کر الم و غم کا سحاب آتا ہے  پسرِ ساقیِ کوثر ہوں حجاب آتا ہے (صفدرؔ)
طاقت اگر دکھاؤں رسالت مآب کی  رکھ دوں زمیں پہ چیر کے ڈھال آفتاب کی (انیسؔ)
تجھ میں ہمت ہو تو آ دیکھ شجاعوں کا جلال  ہم وہ ہیں چیر کے رکھ دیتے ہیں مہتاب کی ڈھال (صفدرؔ)

معنوی طور پر "مہتاب کی ڈھال" باندھنا نادرست معلوم ہوتا ہے۔ چاند گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ تشبیہ ناقص ہے ؎

مشکیں خالی تھیں اور اشکوں سے بھری تھیں آنکھیں  سائلِ فیضِ امامِ مدَنی تھیں آنکھیں

"رسولِ مدَنی" کے دیکھا دیکھی یہ ترکیب وضع کی گئی معلوم ہوتی ہے۔ اثنا عشری عقیدے کی رُو سے امامِ مدنی سے حضرت امامِ حسینؑ کی حیثیت محدود ہو جاتی ہے ان کی امامت تو دو عالم کے لئے ہے اسی طرح ؎

سجدۂ حق میں وہ دن رات گزارے سب نے  خاک پر گیسوئے احوال سنوارے سب نے

مدعا یہ ہے کہ اہلِ حق نے وہ رات عبادت میں بسر کی "گیسوئے احوال کا خاک پر سنوارنا" بے معنی ہے۔

غرضیکہ "آئینِ وفا" میں ڈاکٹر صفدر نے بڑے خلوص اور عقیدت سے اپنے جذبات کی ترجمانی کی ہے۔ صنفِ مرثیہ کی تمام روایات کو پیشِ نظر رکھا ہے۔ تمہید، سراپا، رخصت، آمد، رجز، واقعاتِ جنگ، شہادت، دُعا سبھی کا اظہار اپنی اپنی جگہ پر بڑے سلیقے سے کیا ہے۔ صفدر صاحب نے اُس روایت کو بھی آگے بڑھایا ہے جو انیسؔ اور دبیرؔ سے

ملی تھی۔ اُنھوں نے جدید تقاضوں کو ملحوظ رکھا ہے۔ جس کی بنا پر اُمید کی جا سکتی ہے کہ یہ مرثیہ مقبولِ خواص و عوام ہوگا۔ مرثیے کے احیار کے لئے جناب جوشؔ، آلِ رضا، انجم آفندی، نسیم امروہوی کے دوش بدوش آج "آئینِ وفا" کے مصنّف ڈاکٹر سید صفدر حسین بھی کھڑے ہوئے ہیں اور ہمیں مرثیے کا مستقبل روشن تر نظر آنے لگا ہے۔

مطبوعہ: ادب لطیف، لاہور
شمارہ ۱۹۶۶ء

شان الحق حقی

○

ڈاکٹر صفدر حسین ہمارے شاعروں میں تازہ وارد نہیں مگر تازہ دم ہیں۔ ان کے پانچ مجموعے پچھلے چند برسوں میں سامنے آ چکے ہیں جن میں غزلیات بھی ہیں نظمیں بھی اور مرثیے بھی۔ "آئینِ وفا" حضرتِ عباسؑ کا مرثیہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے کلام کی شستگی، بے عیب بندش اور مرمر کا سا سجل پن جو سب جگہ ہے، یہاں بھی ہے۔ اُن کا لہجہ بڑا نستعلیق، الفاظ شیریں اور نظم رواں ہوتی ہے۔

سالکِ منزلِ تسلیم و رضا تھے عباسؑ

اس پہلے مصرع سے لے کر انتہا تک:

اپنے اِس صفدرِ ناچیز کا سجدہ ہو قبول

زبان کہیں ٹھوکر نہیں کھاتی۔ نظم موج در موج بہتی چلی جاتی ہے۔ سب ایک ڈھال کے ترشے ترشائے مصرعے اور ایک سانچے کے ڈھلے ہوئے بند ہیں:

جذبۂ شیرِ خدا قوتِ ایمانِ حسینؑ

ایک جا زورِ علیؑ حُسنِ حسنؑ شانِ حسینؑ

مرثیے میں غالباً روائتی اسلوبِ بیان سے مفر نہیں۔ پچھلے مرثیوں کی بازگشت جو نئے مرثیوں کے الفاظ، تراکیب اور تخیلات میں اکثر ملتی ہے یہاں بھی ہے۔ "نیّرِ بُرجِ امامت کی ضیا، قوّتِ بازوئے حسینؑ، فاتحِ صفّین و حُنین، ثانیِ شیرِ خدا، سبطِ شہِ لولاک، وارثِ علمِ نبیؐ، دوشِ محمدؐ کا مکیں، نورِ حق، شمعِ ہدیٰ، زینتِ دوجہاں"

وعلیٰ ہٰذا القیاس، نظم کی تعمیر میں بہت سے گھِسے گھسائے اور ترشے ترشائے نگینے صرف ہوئے ہیں۔ ندرت و تازگی اگر ہے تو واقعے کی چند جزویات میں واقعی بڑی خوب صورتی سے بیان ہوئی ہیں۔ تھوڑا سا پانی حضرت عباسؑ کے ہاتھ آیا، خیمے میں تقسیم ہوا۔

جملہ اطفالِ شہنشاہِ مدینہ نے پیا
پی چکے اصغرِ ناداں تو سکینہ نے پیا

صفدر صاحب کے اندازِ بیان میں ذم و سقم کی گنجائش نہیں۔ ایک دو مثالیں صرف بطورِ مستثنیات پیش کی جاتی ہیں:

یونہی بڑھتی گئی عباس کی ذمہ داری

یا

ناخدا کشتیِ اُمت کا لبِ جو اُترا
تھام کر اپنے علمدار کا بازو اُترا

یہاں "بازو اُترا" کھٹکتا ہے۔ مرثیے میں رُلا دینا کوئی بڑی بات نہیں۔ ایک تو سانحات ہی ایسے دلدوز ہیں اور سُننے والوں میں بھی گدازِ طبیعت پہلے سے موجود ہوتا ہے۔ مگر صفدر صاحب نے رُلانے کی کوشش نہیں کی ہے۔ اس مرثیے کو حضرتِ عباسؑ کی شان میں ایک قصیدہ کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔ ایک سہرا بند جو یوں شروع ہوتا ہے:

وہی عباسؑ فسانہ ہے جلالت جس کی
آج بھی سینۂ باطل میں ہے ہیبت جس کی

نظم کا دوسرا بند بھی ہو سکتا تھا۔ بیشتر مرثیہ، مدح کے مضامین پر مشتمل ہے۔ ساتویں تاریخ کو حضرتِ عباسؑ کے پانی لے کر آنے کا ذکر کسی قدر تفصیل سے ہوا ہے، مگر

دسویں تاریخ کو شہادت کا واقعہ سرسری طور سے گزر گیا ہے۔

کتاب کے ساتھ سید عابد علی عابد کا مقدمہ بعنوان "قدرِ سخن" مصنف کی چند تنقیدی تحریروں کے اقتباسات اور مصنف کی مرثیہ خوانی پر مجتبیٰ حسین، ماہر القادری اور ڈاکٹر احسن فاروقی کے تاثرات بھی شامل ہیں کہ وہ پڑھنے میں بھی طاق ہیں۔

مرثیے کے آخر میں ایک مختصر سلام بھی ہے جس کا اصل موضوع سے کوئی تعلق نہیں اور اسے کتاب کا کوئی اچھا تتمہ نہیں کہا جا سکتا۔

لگا کے ٹھیس حریفوں کے آبگینوں کو

بڑا عروج دیا ہم نے ان زمینوں کو

یہ مطلع میر انیس کے حُسنِ اخلاق پر ایک طنز معلوم ہوتا ہے، جنھوں نے کہا تھا کہ:

انیس ٹھیس نہ لگ جائے آب گینوں کو

کتاب کی تزئین و طباعت بھی قابلِ تعریف ہے۔

مطبوعہ "اُردو نامہ" کراچی

ستمبر ۱۹۶۶ء

ہفت روزہ "رضا کار" لاہور

○

"آئینِ وفا" حضرت ابوالفضل العباس علمدارِ لشکرِ حسینی کی حیات و سیرت پر ایک طویل نظم ہے، جو مُسدس کی شکل میں پیش کی گئی ہے۔ شروع میں "قدرِ سخن" کے عنوان سے سید عابد علی عابد کا مقدمہ اور "زاویۂ نگاہ" اور "اسلوبِ ادا" کے عنوان کے تحت مُصنف کے بعض نظریات اور تاثرات شامل ہیں۔ پہلی مجلس، دوسری مجلس اور تیسری مجلس کے عنوان کے تحت سید مجتبیٰ حسین، ماہر القادری اور ڈاکٹر محمد احسن فاروقی نے ڈاکٹر صفدر کے مرثیہ پڑھنے کے انداز کا تعارف نہایت خوش اسلوبی سے کرایا ہے، اور بے حد تعریف کی ہے۔

ڈاکٹر فاروقی کی رائے ہے:-

"صفدر صاحب نے حقیقتاً مرثیہ خوانی کے فن کو جو زمانے کے چکر سے ختم ہوتا جا رہا تھا، نئی زندگی بخش دی ہے اور مرثیہ نگاری میں نیا راستہ پیدا کر دیا ہے۔ ان کے مرثیہ میں مربوط واقعہ نگاری کے ساتھ ساتھ نئے احساس، نئے اندازِ بیان، جدید ترکیب تراشی اور حُسنِ قافیہ ردیف کا بھی کمال ملتا ہے جو شاعری کا اعجاز معلوم ہوتا ہے۔

نمونے کے طور پر ایک بند ملاحظہ ہو

نِکلے دریا سے تو خون اپنا بہاتے نِکلے
ریگِ ساحل کو لبِ خشک دکھاتے نِکلے

عشق اور فرض کی تقدیر جگاتے نکلے
صبر و ایثار کی تاریخ بناتے نکلے

پیاس اس طرح سے ٹھکرادے بھلا پانی کو
موڑ دیتی ہے وفا فطرتِ انسانی کو

یہ ٹیپ حُسنِ قافیہ کی بہترین مثال ہے ؎

جملہ اطفالِ شہنشاہِ مدینہ نے پیا
پی چکے اصغرِ ناداں تو سکینہؑ نے پیا

یہ حسین و جمیل کتاب حُسنِ ظاہری سے مالا مال ہونے کے علاوہ حُسنِ معنی کا بھی ایک بیش بہا خزانہ ہے۔ ڈاکٹر صفدر کے کلام میں شدّتِ احساس کے تیز بلکہ طوفانی دھارے نظر آتے ہیں۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں سوچ سمجھ کر کہتے ہیں اور مرثیے کی قدیم روایت کے ساتھ ساتھ اپنے فن کا مظاہرہ بھی اپنے مخصوص انداز میں نہایت کامیابی سے کر رہے ہیں۔ اُمید ہے کہ قدیمانہ اقدار کو ہمیشہ ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے دادِ سخن دیں گے۔

۱/۸ اپریل ۱۹۶۶ء

ڈاکٹر مسیح الزماں

الہ آباد یونیورسٹی

○

ادب اور شعر کے نئے رجحانات تفصیلی اور واضح بیان کے بجائے اشارات سے باتیں کہنے کی طرف مائل ہیں۔ اُردو مرثیے کو بھی نیا رنگ و آہنگ دینے میں یہی رُخ اہم ہے جس کی آپ نمایندگی کر رہے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ مرثیے کو ذاکری سے الگ کر کے اسے پوری طرح سمجھا نہیں جا سکتا اور سامعین و ناظرین کو ذہن میں رکھے بغیر اس کے قدم آگے نہیں بڑھ سکتے۔ بدقسمتی سے مجھے تو آپ کی مرثیہ خوانی کے سُننے کا اتفاق نہیں ہوا لیکن کتاب (آئینِ وفا) میں ان کی جو تفصیل لکھی ہے وہ بڑی حد تک اس کی کمی پوری کرتی ہے۔ آپ نے مرثیہ خوانی اور مرثیہ گوئی کو یکجا کر کے اس کے مستقبل کے رُخ متعین کیے ہیں اور یہی اس سلسلے کی بنیادی بات ہے۔

ویسے تو لکھنؤ میں بچے کھچے مرثیہ گو، مہذب، شدید اور ابھی کچھ پہلے تک خبیر، قسیم وغیرہ بھی مرثیہ خوانی سے کنارہ کش نہیں ہوئے لیکن وہ صرف روایت کے پابند ہیں، فلاں تاریخ فلاں جگہ چونکہ اُن کے بزرگ مرثیہ پڑھتے تھے اس لئے وہ بھی پڑھیں گے۔ یہ بے روح روایت پرستی، اس بے روح مرثیہ گوئی کی ذمّے دار ہے، جو اس وقت یہاں رائج ہے۔ اس صنف کو نئی سمتیں اب پاکستان ہی میں مل رہی ہیں اور آپ لوگ فن کی عظمت اور فن کار و سامعین کے باہمی رشتوں کو سمجھ کر اسے توانائی بخش رہے ہیں۔ کسی موقع پر آپ کے مراثی پر کچھ خامہ فرسائی کروں گا۔

۳ ر نومبر ۱۹۶۸ء

## ماہرالقادری

○

سیّد صفدر حسین صاحب کو راقم الحروف اُس وقت سے جانتا ہے جب وہ "ڈاکٹر" نہیں ہوئے تھے، اور غالباً ایم۔ اے کے طالب علم تھے۔ میرٹھ میں اُن سے بار ہا ملنا ہوا۔ یہ اب سے ۲۳، ۲۴ سال پہلے کی بات ہے۔ رُبع صدی تقریباً ختم ہو رہی ہے! مشہور شاعروں سے ملنے اور شعر و ادب کی نشستوں اور صحبتوں میں شریک ہونے کا صفدر صاحب کو بہت شوق تھا۔ شعر و سخن کے موضوع پر وہ دلچسپ گفتگو بھی کیا کرتے تھے، مگر اُن کا کوئی شعر اُن کی زبان سے نہیں سُنا تھا۔ یہ انکشاف تو کراچی میں اب سے چھ سات برس پہلے ہوا کہ وہ بدوِ شعور ہی سے شعر کہہ رہے ہیں۔ مگر متّحدہ ہندوستان میں شاعر کی حیثیت سے نمایاں ہونے کی اُنہوں نے کوشش نہیں کی! پاکستان میں وہ منظرِ عام پر آئے اور اس شان سے آئے کہ اُونچے درجہ کے اہلِ نقد و نظر کو چونکا دیا! "شہرت و تعارف" کے لئے کس سلیقہ کی ضرورت ہے اس گُر سے صفدر صاحب واقف ہیں۔

سیّد صفدر حسین علی گڑھ کے 'ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل بی' اور پنجاب کے پی۔ ایچ۔ ڈی ہیں۔ کراچی میں کئی سال محکمۂ تعلیمات کے ڈپٹی ڈائرکٹر رہے، اور اب گورنمنٹ کالج جوہر آباد کے پرنسپل ہیں۔ اُن کی نظم و نثر کی متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ "رقصِ طاؤس" جو اُن کی رُومانی نظموں کا مجموعہ ہے، 'اُس پار فاران' میں خاصی تفصیل کے ساتھ تبصرہ آچکا ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف کے تنقیدی مضامین معلومات آفریں ہوتے ہیں۔

ان کی تخلیقات کی تعداد گیارہ کتابوں تک پہنچ چکی ہے۔

ڈاکٹر صفدر حسین صاحب شعر گوئی اور نثر نگاری کے علاوہ "مرثیہ خوانی" کا خاص فن ہے۔ کراچی کی مجالسِ عزا میں اُنھوں نے اس شان سے مرثیے پڑھے کہ شہر میں دھوم مچ گئی۔ زیرِ تنقید کتاب (آئینِ وفا) میں ڈاکٹر محمد احسن فاروقی، جناب مجتبیٰ حسین اور راقم الحروف کے وہ تاثرات شامل کیے گئے ہیں، جن میں صفدر صاحب کی مرثیہ خوانی کو خراجِ عقیدت پیش کیا گیا ہے۔

"آئینِ وفا" —— ڈاکٹر صفدر حسین کا کہا ہوا مرثیہ ہے، جس میں حضرتِ عباسؑ علمدار کی سیرت و حیات اور رزم آرائی کو پوری قوت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ سید عابد علی عابد نے اس پر فاضلانہ مقدمہ لکھا ہے، اس کے بعد خود شاعر نے اپنے بعض نظریات کے اقتباسات پیش کئے ہیں، جو مرثیہ گوئی کی صنف پر دلکش اور جاندار تبصرہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

"آئینِ وفا" میں صفدر صاحب نے بڑے سلیقہ اور عقیدت و محبت کے ساتھ اپنے جذبات اور تاثرات پیش کئے ہیں اور صنفِ مرثیہ کی رعائتوں کا خیال رکھا ہے اور اپنی حد تک کوشش کی ہے کہ "مرثیہ" کی خصوصیات اوّل سے آخر تک جھلکتی رہیں۔ حضرتِ عباسؑ کی منقبت میں یہ بند کتنا پُرشکوہ ہے:-

عزم وہ جس کے لئے تنگ ہو ظرفِ کونین
وہ شجاعت جو بنی قوتِ بازوئے حسینؑ
وہ جلالت کہ جو تھی آیتِ ربِّ الثقلین
ہمہ تن حوصلۂ فاتحِ صفّین و حُنین
سر بسر باپ کے اوصاف کی تنویر لیئے
آئینہ عرش سے اُترا وہی تصویر لیئے

ایک اور دلکش بند:۔

مدحِ عباسؑ کا منصب مری قسمت کو ملا
ایک ایک بیت پہ لیتا ہے محمدؐ[1] سے صلا
ہاں! مری طبع چمن خیز وہ گلزار کھلا
جس کے پھولوں کو لگی ہو نہ گلستاں کی ہوا
ذہن بیدار ہوں، یوں بوئے گلِ تر پھیلے
دُور تک نکہتِ گیسوئے معنبر پھیلے

اور

راہ طے کر کے ہوئے داخلِ مکہ شبیرؑ
چار سُو پھیل گئی جلوۂ حق کی تنویر
ارضِ کعبہ کی بڑھی گردِ قدم سے توقیر[2]
سیرتِ پاک نے دکھلادی نبیؐ کی تصویر
حُسنِ اخلاق کا کلمہ پڑھا بیگانوں نے
آتے ہی گھیر لیا شمع کو پروانوں نے

چند منتخب بند اور ابیات:۔

چھاگلیں لے کے بڑھا آپ علمدار جری
فرس و قاطر و اُشتر ہوئے سیراب سبھی
سُوکھے ہونٹوں پہ نمایاں تھی تشکر کی تری
دلِ عقیدت سے بھرا، آنکھ ندامت سے جھکی

---

[1] حضور کے اسم گرامی کے بجائے "پیمبر" نظم کرنا چاہیئے تھا۔
[2] حالانکہ حضرت حسینؑ خود ارضِ کعبہ کی تعظیم و توقیر کرتے تھے۔

شرمِ احساں سے ہوئی فوجِ ستمگر پانی
اس کو کہتے ہیں کرم، ہو گئے پیاسو پانی

---

گھر کے ابرِ کرمِ ساقیٔ کوثر آئے
مشک کاندھے پہ اُٹھائے علی اکبرؑ آئے

---

لے گئی دل کی کشش منزلِ جاناں کی طرف
مڑ گئی رحمتِ معبود بیاباں کی طرف

---

دیکھ کر بے ادبیِ سپہِ کوفہ و شام
کبھی ہوتا تھا جو برہم وہ علیؑ کا ضرغام
پیار سے دوشِ مبارک کو تھپکتے تھے امام
ہنس کے کہتے تھے کہ غصہ ہے شجاعت پہ حرام
مرحمت شاہ کی جب آئینہ دکھلاتی تھی
ہر شکن ابروئے عباسؑ کی مٹ جاتی تھی

پیش قدمی کوئی کرتا یہ نہ تھی تاب و مجال
ابتری فوج میں ظاہر ہوئی جیسے بھونچال
شاطرانِ سپہِ شام تھے بھولے ہوئے چال
بدحواسی میں سمجھنے لگے تلوار کو ڈھال
دوش پر جائے کماں خنجرِ براں رکھا
تیغ ترکش میں رکھی، میان میں پیکاں رکھا

راس و چپ اُن کے محافظ تھے سمندوں پہ سوار
شاہدِ حوصلۂ عزم تھی جن کی رفتار
نہ پسِ پُشت سپر، اور نہ کمر میں تلوار
چشمِ افلاک نے دیکھے تھے نہ ایسے جرّار
دل شگفتہ تھے دلیروں کے چمن کی صورت
دستِ فولاد میں نیزے تھے کرن کی صُورت

---

یک بیک دُور سے بڑھتے ہوئے سائے دیکھے
کچھ جری دوش پہ مشکیزے اُٹھائے دیکھے

---

تابعِ حکمِ علمدار تھے وہ تیس۳۰ سوار
جن کی ثابت قدمی لفظِ شجاعت کا وقار
جن کے زخموں سے کیا گلشنِ ملت نے نکھار
خون سے جن کے لکھی وقت نے تاریخِ بہار
(افسوس ہے اِتنے شاندار شعروں کے بعد اس بند کی آخری بیت :-
جن کا افسانہ روایاتِ نکو کی سُرخی
چہرۂ فرض پہ ہے جن کے لہو کی سُرخی
میں کس قدر "آورد" پائی جاتی ہے)
دم بخود فوج ہوئی شہرِ خموشاں کی طرح
خاک اُڑنے لگی ڈیروں میں بیاباں کی طرح

---

پیاس اس طرح سے ٹھکرا دے بھلا پانی کو
موڑ دیتی ہے وفا فطرتِ انسانی کو

## دُوسرا رُخ

چہرہ تصویر بنا رنگِ شہادت کے لئے　　اِن کی تلوار بنی ہاتھ مشیّت کے لئے

مصرعۂ ثانی میں "آمد" کی بجائے "آورد" نمایاں ہے۔

یہ وہ پانی کہ شجاعت کا ہے قُلزم جس سے　　ہوا دُو لاکھ کے لشکر میں تلاطم جس سے

مصرعِ اُولیٰ اظہارِ خیال اور اسلوبِ ادا کے اعتبار سے "ناپختہ" ہے۔

(نوٹ:۔ مولانا نے اس بیت کو ماسبق چار مربُوط مصرعوں سے علیحدہ کر کے نقل کر دیا ہے۔ جس کی وجہ سے خود بخود ابہام پیدا ہو گیا ہے۔ پورا بند یہ ہے ؎

اِن کو اَسلاف کی اِک زندہ نشانی کہیئے
ثانیِ شیرِ خدا جعفرِ ثانی کہیئے
ہیبتِ رُخ کو شجاعت کی نشانی کہیئے
تابِ رُخسار کو تلوار کا پانی کہیئے
یہ وہ پانی کہ شجاعت کا ہے قُلزم جس سے
ہوا دُو لاکھ کے لشکر میں تلاطم جس سے) (مرتب)

جلوۂ نورِ حسینیؑ کی ہے عباسؑ میں ضَو　　اِن کے آئینے پہ ہے شیرِ خدا کا پَرتَو

"اِن کے آئینے" سے آخر کیا مُراد ہے! شاید "آئینۂ دِل" تو پھر "دل" کا آنا ضروری تھا۔

ہوئے پیدا تو کھُلی گود میں شبّیرؑ کی آنکھ　　عُمر بھر دیکھی اُسی صاحبِ توقیر کی آنکھ

محاورہ یوں ہے کہ "فلاں شخص بزرگوں کی آنکھیں دیکھے ہوئے ہے اس میں "آنکھوں"

کا جمع لانا ضروری ہے۔ واحد کے ساتھ جس طرح اس مصرعہ :۔

عُمر بھر دیکھی اُسی صاحبِ توقیر کی آنکھ

میں ہے، درست نہیں! خود شاعر بھی اس مصرعہ کی صحت اور دروبست کے بارے میں مذبذب ہے اس لئے ذیلی حاشیہ میں اس کا بدل یہ مصرعہ :

نظر آئی تو اُسی صاحبِ توقیر کی آنکھ

بھی لکھ دیا ہے۔ مگر اس مصرعہ میں شاعرانہ لُطف کی خاصی کمی محسوس ہوتی ہے! "تو" نے بات کو اور زیادہ بگاڑ دیا، کیا حضرتِ عباسؑ کو امام حسینؑ کی آنکھ کے علاوہ پورے گھرانے میں اور کسی کی آنکھ ہی دکھائی نہیں دیتی تھی۔

ہر بُنِ مُو سے نمایاں ہوئی تنویر کی آنکھ　　　آنکھ وہ آنکھ کہ کہیئے جسے تاثیر کی آنکھ

"تنویر کی آنکھ" کیا ہوتی ہے! "تاثیر کی آنکھ" اس سے زیادہ مضحکہ خیز ہے! شاعر کا پہلا مصرعہ خاصہ اچھا ہے (ہوئے پیدا تو کھُلی گود میں شبیرؑ کی آنکھ)

اس مصرع کو برقرار رکھنے کے لئے انہوں نے بعد کے تین مصرعے جوڑے ہیں!

ہوئی عباسؑ کو تفویض غلامیِ حسینؑ　　　لوحِ قسمت پہ کھُدا نامِ گرامیِ حسینؑ

مصرعۂ ثانی میں بڑا تکلف پایا جاتا ہے "کھدا" نے شعر کی لطافت کو مجروح کر دیا۔

دل سے آواز یہ آتی تھی اُجالا کیجے　　　عزم کہتا تھا کہ دُنیا تہ و بالا کیجے

اِس سے پہلے مصرعوں میں "اندھیرے" کا ذکر آتا تو بند کی آخری بیت میں "اُجالا کیجے" موزوں لگتا۔

ہیبتِ شیر سے گُونگی ہوئی حاکم کی زبان　　　گرچہ سر دفترِ اشرارِ مدینہ مروان

مصرعۂ ثانی میں "تھا" یا "سمجھا جاتا تھا" لانا ضروری تھا۔ ایسے موقعوں پر الفاظ کا محذوف ہونا شاعر کی ناپختہ کاری کی دلیل ہے۔

(نوٹ۔ مولانا نے مسدس کے بند کے پہلے دو مصرعوں کو غلطی سے ایک

مکمل شعر سمجھ لیا ہے اور بعد کے دو مصرعوں سے اس کو مربوط کر کے نہیں پڑھا ورنہ انہیں یہ کمی نظر نہ آتی۔ اب یہاں ربطِ کلام کے اظہار کے لئے ابتدائی تین مصرعے درج کئے جاتے ہیں جن سے یہ بات ظاہر ہو سکے گی کہ یہ شاعر کی ناپختہ کاری تھی، یا خود تبصرہ نگار کی کم فہمی!

ہیبتِ شیر سے گونگی ہوئی حاکم کی زبان
گرچہ سر دفترِ اشرارِ مدینہ مروان
ذہن پہ اُس کے مسلّط تھا مثالِ شیطان ) (مُرتبہ)

حادثہ یہ دلِ عباسؑ کے حق میں ہوا تیر زوجۂ حضرتِ مُسلمؑ تھیں حقیقی ہمشیر

مصرعۂ اولیٰ کس قدر کمزور بلکہ بچکانہ ہے۔

(نوٹ۔ یہاں بھی مولانا نے واقعہ کے سیاق و سباق کو نظر انداز کر دیا ہے۔ موقع یہ ہے کہ حضرتِ امام حسینؑ کوفہ کی طرف سفر کر رہے ہیں کہ راستہ میں انہیں حضرتِ مُسلمؑ کی شہادت کی خبر ملتی ہے۔ اس کا اثر یہ ہوا:۔

حادثہ یہ دلِ عباسؑ کے حق میں ہوا تیر
زوجۂ حضرتِ مُسلمؑ تھیں حقیقی ہمشیر
دی تسلّی یہ بہن کو نہ ہو یوں دلگیر
اے خوشا مُسلمِؑ جاں باز اور اُن کی تقدیر

وہ ہوئے فدیۂ سلطانِ زمن صبر کرو
یہ تو اِک شکر کا موقع ہے بہن صبر کرو)

مانگ اور کوکھ ہے کیا امرِ الٰہی میں بہن امتحاں فرض کا ہوتا ہے تباہی میں بہن

اِس بیت میں "شعریت" کا دُور دُور پتہ نہیں! "مانگ اور کوکھ ہے کیا" اِس ٹکڑے نے شعر میں ناگوار قسم کا ابہام بھی پیدا کر دیا۔

ہو نہ مایوس ابھی قہرِ خدا راہ میں ہے　　　رحم گو طینتِ مولائے حق آگاہ میں ہے

صرف لفظوں کو جوڑ کر شعر استوار کر دیا ہے، حالانکہ شاعری لطفِ بیان کا نام ہے۔

(نوٹ۔ مولانا نے پھر غلطی کی اور بند کے ابتدائی دو مصرعوں کو شعر سمجھ لیا حالانکہ اِن کا مفہوم مابعد کے مصرعوں سے مل کر مکمل ہوتا۔ یہاں پھر مکمل بند نقل کرنے کی ضرورت ہے۔

ہو نہ مایوس ابھی قہرِ خدا راہ میں ہے
رحم گو طینتِ مولائے حق آگاہ میں ہے
ولولہ نصرتِ حق کا بھی دلِ شاہ میں ہے
جوہرِ عدل بھی شمشیرِ یداللہ میں ہے
آپ چاہیں تو ابھی ظلم کا منہ فق ہو جائے
اِک اشارے میں سیاہی کا جگر شق ہو جائے) (مرتبہ)

کئی دن سے نہ ملا تھا اُنہیں اک قطرۂ آب　　　ہر تگ و دَو نے دکھایا تھا تماشائے سراب

مشکیں خالی تھیں اور اشکوں سے بھری تھیں آنکھیں　　　سائلِ فیضِ امامِ مدنی تھیں آنکھیں

دونوں شعروں کے ثانی مصرعوں میں "آورد" کے علاوہ اور کیا رکھا ہے۔

آرزو یہ ہے کہ حضرت نہ مصیبت میں پڑیں　　　کون چاہے گا کہ سرکار ہلاکت میں پڑیں

مسدّس کی آخری بیت اور اتنی کمزور!

میں ہوں حاضر متوجّہ ہو جدھر پائے صواب　　　آپ کا عزم ہمایوں ہے سراپائے صواب

یہ شاعری نہیں شاعری کے ساتھ مذاق ہے۔

دوسری ماہِ محرّم سے دہم تک پیہم　　　امتحان گاہ میں تھے نازشِ آدمؑ کے قدم

"نازشِ آدمؑ" وجدان کو کس قدر کھٹکتا ہے۔

ایک لمحے کے لئے اذنِ وغا مل جائے　　　چینِ ابرو کی قسم گوئے زمیں ہل جائے

"گوئے زمین" کی ترکیب نے شعر کی قوت اور مضمون کے شکوہ کو بہت کچھ کم کر دیا۔

روک لو ہاتھ یہ اُمت کہیں برباد نہ ہو — میرا منشائے شہادت کہیں برباد نہ ہو

گزرد ربیت "منشا کا برباد ہونا" یہ کیا اندازِ بیان اور روزمرہ و زبان ہے۔

پھر سے بے ساختہ پن آگیا تیوریوں میں — ولولے قید ہوئے علم کی زنجیروں میں

"تیوریوں" میں "بے ساختہ پن آنا" عجیب اسلوب اظہار ہے۔ اس پر مستزاد "ولولوں کا علم کی زنجیروں میں قید ہونا"!

دِل پہ گھِر کر الم و غم کا سحاب آتا ہے — پسرِ ساقیِ کوثر ہوں حجاب آتا ہے

مگر

میر انیس جو فرما چکے ہیں:-

تو زباں خشک جو اپنی مجھے دکھلاتا ہے — پسرِ ساقیِ کوثر کو حجاب آتا ہے

انکی مشہور بیت کے مصرعۂ ثانی سے توارد کیسے اور کیوں؟ پھر غم و الم کے بادلوں کے گھِرنے سے "پسرِ ساقیِ کوثر کے حجاب آنے" کو کیا نسبت ہے۔ ہاں میر انیسؔ کے یہاں پسرِ ساقیؔ کوثر کا حجاب آنا ٹھیک نظم ہوا ہے کہ وہ پسرِ ساقیِؔ کوثر ہے، کربلا میں پیاسے گھوڑے کی پیاس بھی نہیں بجھا سکتا۔

جنگِ صفین سے بھاگے ہوئے غم کھائے ہوئے — دستِ کرار سے زخموں کا مزہ پائے ہوئے

"غم کھائے ہوئے" نے اس بیت کو سطحی اور بے لطف بنا دیا ہے۔ "دستِ کرار" کی جگہ "تیغِ کرار" ہوتا تو شعر میں زیادہ قوت پیدا ہو جاتی۔

بندشِ آب میں جوڑے ہوئے سر کو باہم — لاف زن تھے کہ ہٹے ہیں کہیں مردوں کے قدم

"بندشِ آب" کی ترکیب اوّل تو اس طرح نامانوس محسوس ہوتی ہے۔ پھر یہ ٹکڑا "جوڑے ہوئے سر کو باہم" پورے مصرعہ کے لفظی دروبست کے ساتھ عجیب سا لگتا ہے۔

ہم جو گرجیں تو پہاڑوں کے جگر ہلتے ہیں — قصرِ بدعت کی بنا ہلتی ہے در ہلتے ہیں

مصرعۂ اولیٰ کوئی شک نہیں مضبوط اور پُرجوش ہے۔ مگر دوسرے مصرع میں لفظ "بدعت" بھرتی کا لفظ ہے! "قصرِ شاہی" کہنا تھا۔ پھر "بنیاد کے ہلنے" کے بعد یہ کہنا کہ "در ہلتے ہیں" کس قدر کمزور اندازِ بیان ہے! یعنی ترقی کی بجائے تنزّل؛

مشکیں بھر بھر کے برآمد ہوئے پیاسے ذی جاہ　　فکر تھی آب پہنچ جائے سوئے خیمۂ شاہ

"پانی" کی بجائے "آب" مصرعۂ ثانی میں کس قدر کھٹکتا ہے۔

جوش نے دورۂ خوں کے جو نفس تیز کیا　　ہاتھ نیزے پہ گیا، گھوڑے کو مہمیز کیا

"دورۂ خوں" لانے کی کیا ضرورت تھی کہ یہاں "فنِ طب" موضوعِ سخن نہیں، پھر اس مصرعہ میں "تعقید" کا عیب بھی پیدا ہو گیا ہے۔ اس بیت کا مصرعۂ ثانی خوب نہیں بلکہ بہت خوب ہے۔

جملۂ اطفالِ شہنشاہِ مدینہ نے پیا　　پی چکے اصغرِ ناداں تو سکینہ نے پیا

"جملہ اطفال" ترجمہ سا لگتا ہے" اصغرِ ناداں" کہنے کا یہ کیا محل تھا" اصغرِ کمسن" موزوں لفظ تھا۔

(نوٹ۔ شعر فہمیٔ عالمِ بالا معلوم شد)　(مُرتّبہ)

سجدۂ حق میں وہ دن رات گذارے سب نے　　خاک پر گیسوئے احوال سنوارے سب نے

دوسرا مصرع تکلّف و آورد کا مجموعہ ہے!

فکر زوجہ کی نہ بچوں کی جدائی کا خیال　　وجہِ تشویش تھا ہر حال میں بھائی کا خیال

"وندانِ تو جملہ در دہانند"—— کی مثل ایسے ہی شعروں پر صادق آتی ہے۔

ٹکڑے ہو جائے گا گلزارِ جنابِ شبّرؑ　　چھد کے رہ جائے گا میدان میں اکبرؑ کا جگر

"گلزار کا ٹکڑے ہونا" یہ کہاں کی زبان ہے! ہاں! جب کسی باغ کا بٹوارہ ہو اور اُسے بہت سے حصّوں میں تقسیم کیا جائے تو "باغ کا ٹکڑے ٹکڑے ہونا" اُس وقت بولا جائے گا۔

قافلہ وقت کا گو زحمتِ ہر گام میں ہے ماندگیٔ شُہدا حالتِ آرام میں ہے

صفدر صاحب نے متعدد مقامات پر "آورد" "تکلف" کو شاید "صنعت" سمجھ کر استعمال کیا ہے! اس بیت کا بھی یہی رنگ ہے۔

(نوٹ۔ مولانا کا کم سواد ہونا اسی سے ظاہر ہے کہ ایک بند کے ان ابتدائی دو مصرعوں کو وہ "بیت" سے تعبیر فرماتے ہیں۔ قارئین بالتمکین کے ملاحظہ کے لئے یہ پورا بند پیش کیا جا رہا ہے:

قافلہ وقت کا گو زحمتِ ہر گام میں ہے
ماندگیٔ شُہدا حالتِ آرام میں ہے
درد اس تشنہ لبی کا دلِ ایام میں ہے
خونِ دل آج بھی پانی کے عوض جام میں ہے
بچے لیتے ہیں جو گرمی میں کبھی پیاس کا نام
لب پہ آ جاتا ہے ساختہ عباسؑ کا نام) (مُرتب)

ہے ازل سے یہی قانونِ طبیعت آقا کہ شجاعت ہے اک ایمان کی شدت آقا

دوسرا مصرعہ نومشقوں کے کہنے کا ہے۔

جذبۂ بندۂ موروثیِ مولا ہو قبول اپنے اس صفدرِ ناچیز کا سجدہ ہو قبول

"جذبہ" کی جگہ "ہدیہ" لانا تھا!

(افسوس ہے کہ مولانا کو لفظ "ہدیہ" کا صحیح تلفظ بھی معلوم نہیں۔ اس تلفظ کے ساتھ وہ "جذبہ" کی جگہ پُر نہیں کر سکتا۔) (مُرتب)

تیسرا مصرعہ یوں ہے!

لکھ کے نام آپ کا سجدہ میں قلم ہے حضرت

مگر

اپنے اِس صفدرِ ناچیز کا سجدہ ہو قبول

اِس میں ظلم کے سجدے کی طرف ذہن نہیں جاتا، بلکہ لفظوں سے ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر اپنے ممدوح کو پیشانی سے سجدہ کر رہا ہے۔ حالانکہ سجدہ صرف ذاتِ باری کو سزاوار ہے۔

ڈاکٹر صفدر حسین کے مرثیہ کی ایک بیت ہے:-

یہ رسالے یہ قطاریں یہ پیادے کیا ہیں
زندہ رہنا ہے تو کہہ دو کہ ارادے کیا ہیں

کاش! اُن کے مرثیہ میں شروع سے لے کر آخر تک یہی رنگ و آہنگ قائم رہتا۔ صورت یہ ہے کہ ایک ہی بند میں تین چار مصرعے خاصے بلند ہیں مگر ایک دو مصرعے بہت پست بھی آ گئے ہیں! کہیں لفظوں کے در و بست میں جھول ملتا ہے، کسی جگہ آورد اور تکلف! اُن کی شاعری میں چاہے وہ غزل ہو یا مرثیہ، نظم ہو یا سلام و رُباعی — ابھی وہ پُختگی پیدا نہیں ہوئی جو بڑے شاعروں کا طرّۂ امتیاز ہے۔ صفدر صاحب ایکا ایکی میدانِ شاعری میں آئے، اور آتے ہی اُن کی شاعری پر مضامین بھی رسالوں میں چھپنے لگے، اُنہوں نے شہرت کے طوفانی آغاز ہی میں کئی کتابیں بھی مرتب کر ڈالیں! لوگوں نے تعریف و تحسین بھی کی، اس ماحول میں اگر "بلوغِ کمال" اور "تکمیلِ فن" کا احساس پیدا ہو جائے تو کچھ مستبعد نہیں ہے۔ مگر اس طرح شاعری کی ترقی رُک جاتی ہے، اور وقت سے پہلے "بلوغِ کمال" کی خوش فہمی میں شاعر مبتلا ہو جاتا ہے۔

شہرت و تحسین سے کوئی شک نہیں شاعر و ادیب کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے مگر یہ چیز "ترقی" کی راہ میں رکاوٹ بھی بن جاتی ہے!

شعر و ادب کے معاملے میں ہم، افسوس ہے کہ رواداری اور مروّت کو "ناانصافی" سمجھتے ہیں، شعر یا نثر میں ذرا سی بھی کہیں اونچ نیچ اور کسر محسوس ہوتی ہے تو ہم اس کا اظہار کر دیتے ہیں، اسی صاف گوئی نے ہمیں نہ جانے کس کس کی نگاہ میں مبغوض اور ناپسندیدہ بنا دیا ہے۔ع

آئینہ اپنی لطافت کی سزا پاتا ہے

ماہنامۂ اصلاح

○

جناب ڈاکٹر صفدر حسین "اصلاح" کے خصوصی ہمدردوں میں سے ہیں۔ آپ کے علم و فضل کا تو ہمیں پہلے ہی سے اندازہ تھا لیکن ہمیں یہ معلوم نہ تھا کہ آپ ایک پختہ فکر قادر الکلام شاعر بھی ہیں۔ آپ کا نو تصنیف مرثیہ "آئینِ وفا" کا مطالعہ کر کے ہمیں بڑی قدر ہوئی۔ اس مرثیہ کے دیباچے سے معلوم ہوا کہ آپ کے اور بھی کئی مرثیے پاکستان کے مومنین سے خراجِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ زیرِ نظر مرثیہ حضرتِ عباسؑ کے متعلق ہے جس میں آپ نے ولادت سے لے کر شہادت تک کے حالات بڑے ماہرانہ انداز میں نظم فرمائے ہیں۔ آپ نہ صرف اچھا کہتے ہیں بلکہ پڑھتے بھی خوب ہیں۔ یہ مرثیہ بھی مومنینِ کراچی نے آپ کی زبان سے سُنا اور جس مجلس میں آپ پڑھے بڑی یادگار مجلس ہوئی۔ کراچی کے اخبارات اور مشہور ناقدینِ فن نے جی کھول کر اس مرثیہ کی مدح و ستائش کی ہے۔ ہمیں توقع ہے کہ اس مرثیہ کی شایانِ شان قدر کی جائے گی کہ یہ نہ صرف عزادارانِ امامِ مظلوم کے لیے گرانقدر نعمت ہے بلکہ پرستارانِ ادب کے لئے بہترین سرمایہ بھی۔

ماہ جولائی ۱۹۶۶ء

سید ابنِ حسن نقوی
امامیہ مشن لکھنؤ

○

یہ (آئینِ وفا) وہ معرکہ آرا مرثیہ ہے جس کے کچھ بند سرفراز' محرم نمبر ۱۳۸۶ھ (۱۹۶۶ء) میں شائع ہو چکے ہیں مکمّل مرثیہ کے مطالعہ کے مومنینِ ہندوستان مُتمنّی تھے اور ہم کو اِس کی اشاعت کی طرف توجہ دِلا رہے تھے' چنانچہ اِمسال ہم اس کو شائع کر رہے ہیں۔

یقین ہے کہ افرادِ دینی اس کی بھی کثیر سے کثیر تعداد طلب فرما کر تقسیم فرمائیں گے اور عند اللہ و عند الرسولؐ ماجور ہوں گے۔

دیباچہ "آئینِ وفا"
لکھنو۔محرم ۱۳۸۷ھ

حکیم سید سخی احمد ممتاز الافاضل

○

سرفراز "محرم نمبر میں آپ کا مرثیہ "آئینِ وفا" کے عنوان سے نظر سے گزرا۔ بار بار پڑھا، اور دل چاہتا ہے اِس شاہکار کو پڑھتا ہی رہوں۔ آپ نے بڑے اچھے تیوروں سے مرثیہ کو نظم فرمایا ہے۔ ع

اللہ کرے زورِ بیاں اَور زیادہ

حضرتِ عباسؑ کے متعلق خوب کہا ہے:

تا بہ عاشور رہے کارِ امامت میں شریک
جس طرح شیرِ خُدا کارِ رسالت میں شریک

---

مجھ پہ روشن ہے جو کچھ پردۂ تقدیر میں ہے
میرے غازی یہ ترائی تری جاگیر میں ہے

---

دِل عباسؑ میں اِک جوشِ فراواں جاگا
جس کو حضرت نے سُلایا تھا وہ طوفاں جاگا

---

قافلہ عمر کا منزل کی طرف جاتا ہے
یہ غلام آپ کا ساحل کی طرف جاتا ہے

---

اب تو مولا مجھے مرنے کی اجازت دیجے
یہ نہ ممکن ہو تو سقائی کی خدمت دیجے

---

مجھے پورا مرثیہ پسند ہے۔ دل ایسا ہی بے چین ہوا کہ میں اِس امر کی مبارک باد دینے پر مجبور ہوا کہ یقیناً آپ کا یہ ہدیہ بارگاہِ ابوالفضل العباسؑ میں مقبول ہے۔

چہلم میں اپنے وطن سرسی ضلع مُراد آباد میں آپ کا یہ مرثیہ بصورتِ نظم ایک اچھے نوحہ خوان سے، ایک جلوس میں سُنا تھا۔ مجمع بہت سنجیدہ اور اہلِ فکر و نظر افراد پر مشتمل تھا۔ ہر طرف سے آہ و واہ کی آوازیں بلند تھیں۔ اُس وقت مجھے یہ تحقیق نہ ہو سکا تھا کہ یہ مُسدّس کس کا ہے۔ اب ذرا تاخیر سے "محرّم نمبر" نظر سے گزرا تو معلوم ہوا کہ یہ نظم جوہر آباد کے پرنسپل صاحب کا کارنامہ ہے۔ کاش آپ کی ایسی معیاری نظمیں آئندہ بھی اِسی طرح نظر سے گزرتی رہیں۔ آمین!

بسانکھنی۔ ضلع بلند شہر
یکم اگست ۱۹۶۶ء

## ہاشم جلالی

○

پہلے آپ کا خط ملا اور اُس کے بعد "آئینِ وفا"۔ گویا پہلے تو بہار آئی اُس کے بعد ایک پھول کھلا۔ ابھی تک مشامِ جاں معطر ہے۔ پڑھ کر محسوس ہوا کہ واقعی کوئی چیز ہے جو اتنے دِنوں بعد نظر آئی۔ "زاویۂ نگاہ" کے عنوان سے آپ نے جس تحقیق سے کام لیا ہے وہ مرثیے کی تاریخ و تحقیق کی دُنیا میں گراں بہا اہمیت کا حامل ہے۔ بہرحال جیسے جیسے "آئینِ وفا" پڑھتا جاتا تھا ایسا محسوس ہوتا جا رہا تھا جیسے آپ کی آواز آہستہ آہستہ اُبھری اور پھر اپنی پوری شیرینی، گرفت اور تاثیر کے ساتھ گونجنے لگی۔ کچھ دیر کے بعد ایسا محسوس ہونے لگا جیسے پڑھ نہیں رہا ہوں بلکہ سُن رہا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب کتنی سلاست ہے اِن بندوں میں!

وعدہ کرتا ہوں کہ تلوار نہ لے جاؤں گا
مشکیں خاموشی سے بھر لوں گا چلا آؤں گا
صبرِ حضرت کا نمونہ اُنھیں دِکھلاؤں گا
سر جُھکا کر تبر و تیر و سِناں کھاؤں گا
ایک نیزے کی اجازت ہو ضرورت کے لیئے
وہ بھی اپنی نہیں، مشکوں کی حفاظت کےلیئے

---

بسکہ عاشور کے دن سخت تھی عباسؑ کی پیاس
پھر بھی دریا میں جو اُترے تو رہے جمع حواس
یوں بھری مُشک کہ حیران ہوئے خضرؑ و الیاسؑ
تشنگیٔ آب کو آنے نہ دیا ہاتھ کے پاس

آبرو فرض کو، توقیر وفا کو بخشی
تپشِ نَو دلِ اربابِ وِلا کو بخشی

اِس مرثیے کے بعد آپ کی رباعی اِس شان سے اُبھرتی ہے کہ تمام دھندلکے کافور ہو جاتے ہیں۔ ع

تلوار کی طرح چلنے والے ہم ہیں

اِس موقع پر میر انیسؔ یاد آجاتے ہیں جنہوں نے کہا تھا ع

خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

مختصر یہ کہ آپ کی نئی کتاب 'تحقیق، تنقید اور تخلیق کا ایک مثالی نمونہ ہے' یا کوثر کا وہ جام ہے جس میں کئی رنگ جھلکتے ہیں۔ میرے خیال میں اِس دَور کے مرثیوں میں جس ادبی سنجیدگی اور جذباتی رکھ رکھاؤ کا اظہار آپ کے مرثیوں میں ملتا ہے کہیں اَور نہیں ملتا۔ اِس ادبی دَور میں جب برف کے ٹھنڈے پانی اور سالن میں مرچوں کی تیزی نے حقیقی ذائقے کو نظروں سے اوجھل کر دیا ہے اور ہر طرف جذباتیت کا دَور دورہ ہے، آپ کا سنجیدہ اور معقول اندازِ فکر اس بات کا شاہد ہے کہ" ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں" بقولِ جوشؔ۔ ع

یہ قُدسی کون ہیں رہ رہ کے جو پیغام دیتے ہیں

کراچی

۳ رمئی ۱۹۶۶ء

## مرتضیٰ حسین فاضل

○

کل آپ کا مُرسلہ "آئینِ وفا" ملا۔ بے حد ممنون ہوں۔ بہت بہت شکریہ۔ خوبصورت جلد، بہت عُمدہ اور معنی خیز سرورق، بہترین کاغذ، عُمدہ ترین کتابت، معیاری طباعت، موزوں قیمت۔ یہ ظاہری محاسن تھے جو کتاب میں دلکشی پیدا کرتے ہیں۔ کتاب کا مواد دوگونہ محاسن کا حامل پایا۔ پہلا حصّہ، نثر، جس میں جنابِ عابد علی عابدؔ کا مضمون بڑا علمی اور موضوع کے لحاظ سے بے حد بصیرت افروز ہے، آپ کا مضمون بڑی اچھی یادداشتوں اور کارآمد باتوں کا خلاصہ ہے۔ نثر سے بڑھ کر نظم سامنے آتی ہے۔

مرثیہ کہنا بہت مشکل ہے۔ سَوا، سوا سَو بند، خاص قسم کی ٹکنیک، مخصوص اسلوب، جوش، خلوص، ارتقا، تسلسل، غرض انتہائی چابکدست قلم کار، پختہ شعور شاعر، نکتہ شناس نگاہ، ذوقِ سرشار، عشقِ حسین علیہ السلام۔ بصیرت، نفسیات شناسی، شرط ہے۔ اگر آپ کا یہ پہلا ہی مرثیہ ہے تو ہمارے ادب کے لیئے بہت بڑی فال نیک ہے۔

بعض حضرات نے لکھا ہے اور دوسرے ذرائع سے بھی سُنا ہے کہ "واقعاً آپ بہت اعلیٰ درجے کے پڑھنے والے ہیں۔ آپ کی قابلیت، مطالعہ اور ذوق مُسلّم ہے۔ اسی قابلیت کا اثر ہے جو اتنی اچھی تخلیق عمل میں آئی ہے۔

لاہور

۶ رمئی ۱۹۶۶ء

پروفیسر سیّد صفدر حسین

۱۹۵۵ء



مجھ سے قائم ہے زمانے میں وقارِ منبر
میں نے اسلاف سے سیکھے ہیں شعارِ منبر

# علمدارِ کربلا

آغا مسعود رضا خاکی

# تائید

آج بروز یکشنبہ بتاریخ ۹ رشوّال المکرّم ۱۳۹۶ ہجری مطابق ۲ر اکتوبر ۱۹۷۶ء بوقتِ شب کہ غالباً دو بجے کا عمل ہوگا، میرانیسؔ اعلی اللہ مقامہٗ کو میں نے خواب میں دیکھا۔ اِس موقع پر اُنھوں نے ایک بھری مجلس میں اپنا مرثیہ پڑھ کر سُنایا۔ پھر کچھ وقفے کے بعد منظر خود بخود تبدیل ہوگیا، اور اب دوسری مجلس منعقد ہوئی جس میں مَیں نے اپنا کہا ہوا مرثیہ پڑھا۔ ان دونوں مجلسوں کا ماحول کچھ اس طرح کا تھا جیسے پہلی مجلس فردوس کالونی، کراچی میں منعقد ہوئی تھی اور دوسری ناظم آباد نمبر ۲ میں۔ بہرحال میری مجلس کے خاتمے پر خدائے سخن نے مجھے شاباش دی۔ میری خوانندگی اور مرثیہ سے متعلق میرے فنّی موقف پر پسندیدگی کا اظہار کیا اور میری گوناگوں ادبی اور ملّی کاوشوں کی تحسین فرمائی!

جب آنکھ کھُلی تو گھڑی میں تین بج کر ۲۵ منٹ ہوئے تھے۔

ڈاکٹر سیّد صفدر حسین

لاہور

آغا مسعود رضا خاکی

ڈاکٹر سیّد صفدر حسین کے فکر و فن پر صاحبانِ قلم اور دانشورانِ محترم نے بہت کچھ لکھا ہے اور مجھے ابتدا ہی میں یہ اعتراف کرلینا چاہیئے کہ میں کوئی نئی بات نہیں کہہ سکوں گا۔

ڈاکٹر صاحب کوئی غیر معروف شخصیت نہیں ہیں۔ برِّ صغیرِ پاک و ہند کے ادبی حلقوں میں انھوں نے اپنی منفرد تخلیقی اور تحقیقی صلاحیتوں اور مخصوص فکر و نظر کی قوّت پر ایک بلند مقام حاصل کرلیا ہے۔ اُن کی شخصیت جامع الصّفات ہے۔ وہ ایک معلّم بھی ہیں اور مفکّر بھی۔ شاعر بھی ہیں اور محقّق بھی، ادبیات کے خالق بھی ہیں اور نقّاد بھی۔ غزل بھی کہتے ہیں اور جدید انداز کی نظم معرّا بھی۔ مرثیہ خوانی کے سلسلے میں گزشتہ تیس ۳۰ پینتیس ۳۵ سال سے اُن کا شہرہ ہے اور مرثیہ گوئی کے سلسلے میں گزشتہ بارہ تیرہ سال ہی میں اُنھوں نے صفِ اوّل کے مرثیہ نگاروں میں اپنے لیئے جگہ پیدا کرلی ہے۔ یہی نہیں کہ وہ مرثیہ پڑھنے اور کہنے میں اپنا جواب نہیں رکھتے بلکہ مرثیے کو حُسن و خوبی کے ساتھ کتابی صورت میں شائع کرانے میں بھی اُن کا کوئی جواب نہیں ہے۔ آئینِ وفا، جلوۂ تہذیب، چراغِ مصطفوی، مقامِ شبیری اور علمدارِ کربلا، اُن کے پانچ مرثیوں کے عنوانات ہیں جو (آخر الذکر دو مرثیوں کے علاوہ) علیحدہ علیحدہ کتابی صورت میں شائع ہو کر علمی اور ادبی حلقوں میں مقبول ہوچکے ہیں۔

"علمدارِ کربلا" یعنی مرثیہ در احوالِ شہادتِ حضرتِ عباس علیہ السلام اپنی ابتدائی صورت میں "محفلِ اعجاز" میں شائع ہوچکا ہے۔ اس کتاب میں ڈاکٹر صفدر حسین کے جدِّ نامدار جناب سید حسن رضا مرحوم کے چند مراثی شامل ہیں جن کے آخر میں ڈاکٹر صاحب نے اپنا ایک مرثیہ (علمدارِ کربلا) بھی شامل کردیا ہے۔

یہی مرثیہ نظرِ ثانی کے بعد میرے اِس مضمون میں زیرِ بحث آئے گا لیکن اِس سے قبل یہ ضروری ہے کہ ڈاکٹر صفدر حسین کی مرثیہ گوئی کا ایک مجموعی جائزہ لے لیا جائے۔ اُن کی مرثیہ گوئی کا زمانہ ۱۹۴۲ء سے شروع ہوتا ہے لیکن اُردو مرثیہ اور اُس کی تاریخ پر اُن کی نظر گذشتہ نصف صدی سے ہے۔ مرثیہ خوانی اور منبر نشینی کا شرف انھیں بچپن سے حاصل رہا ہے۔ اُردو اور فارسی ادب میں ایم اے کرنے کے ساتھ اُنھوں نے مرثیہ پر تحقیقی نظر بھی ڈالی ہے۔ جنوری ۱۹۴۲ء کے ایک مضمون کا اقتباس اُن کے پہلے مرثیے آئینِ وفا کے مقدمے میں شامل ہے، جس سے اُن کے جادۂ فکر و نظر کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اِس کتاب میں اُن کے ۱۹۶۲ء کے ایک مضمون کا اقتباس بھی درج ہے۔ ان دونوں مضامین کو مربوط کرنے کے بعد یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ڈاکٹر صفدر حسین نے مرثیہ گوئی محض روائتی انداز میں یا خوش اعتقادی کے طور پر شروع نہیں کی بلکہ اس کے پس منظر میں سماجی، تہذیبی اور ادبی تقاضوں کا گہرا شعور کار فرما ہے۔

اُردو مرثیہ کے قدیم اور جدید انداز کا فرق بھی اُن کی نظر میں ہے۔ اُنھوں نے اُردو مرثیے کے ارتقائی منازل کا تنقیدی اور تحقیقی ذہن کے ساتھ جائزہ لیا ہے اور اِس صنفِ سخن کے عروج و زوال، مقبولیت اور عدمِ مقبولیت، اہمیت اور افادیت پر گہری نظر ڈالی ہے۔ ایسی صورت میں اُنھوں نے جو مرثیے کہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ کسی عام شاعر کے کہے ہوئے مرثیوں سے بہت مختلف ہونے چاہئیں، چنانچہ ایسا ہی ہے۔

ڈاکٹر صفدر حسین نے دورِ جدید کو اعلیٰ اخلاقی اقدار سے روشناس کرانے کے لئے ادب کا سہارا لیا ہے اور ادب کو پاکیزگی کے بلند ترین مقام تک پہنچانے کے لئے مرثیے کو ذریعۂ اظہار بنایا ہے۔ اُن کے مرثیے شہدائے کربلا کے کردار، انسانیت کے کمالات اور اعلیٰ صفات کا تعارف کراتے ہیں اور زندگی کی اُس قوت کا شعور بخشتے ہیں جو معاشرتی خرابیوں کا سدِّباب کرکے تہذیب و تمدّن کو انسانیت کی منزلِ مقصود تک پہنچاتی ہے۔

ڈاکٹر صفدر حسین صرف واقعہ نگاری یا روایت نویسی نہیں کرتے بلکہ پورے فنی رچاؤ کے ساتھ اپنے تاریخی اور تنقیدی شعور کو بروئے کار لاتے ہیں۔

انھیں اِس حقیقت کا بھی پورا پورا احساس ہے کہ اُردو مرثیہ اپنی موجودہ شکل میں (جو انیسؔ و دبیرؔ کے زمانے سے قائم ہے) ایک جامع الصفات صنفِ ادب بن چکا ہے۔ اِس میں غزل کی اشاریت، مثنوی کی تصویریت، قصیدے کا شکوہ، رُباعی کی وحدت، گیت کا درد، دوہے کی اثر آفرینی اس طرح شیر وشکر ہوگئی ہے کہ اب کسی ایک صنف کی خصوصیت کو علٰحدہ کرنا ممکن نہیں ہے اور اگر علٰحدہ کرنے کی کوشش بھی کی جائے تو مرثیہ مرثیہ نہیں رہے گا۔

ڈاکٹر صفدر حسین کے مقالات اور شعری تخلیقات کا جائزہ لینے کے بعد یہ اندازہ بھی ہو جاتا ہے کہ وہ اس حقیقت سے بھی پوری طرح واقف ہیں کہ مرثیہ نگار کا دائرۂ عمل صرف اصنافِ شاعری تک ہی محدود نہیں بلکہ اُسے بہت سی اصنافِ نثر کے خصوصیات سے بھی کام لینا پڑتا ہے۔ کرداروں کا تعارف، تشخص اور رُخصت، جذبات و احساسات کی عکاسی، مکالمے اور معرکہ آرائی یہ تمام باتیں اِس بات کی مُتقاضی ہیں کہ مرثیہ نگار کے لئے ڈراما اور افسانہ نگاری کے فن سے بھی واقفیت لازمی ہے۔ اور اس کے علاوہ بہت سے دوسرے علوم سے کما حقہٗ واقف ہونا بھی ضروری ہے۔ مثلاً فلسفہ، حکمت، منطق، مدنیت، تاریخ، جغرافیہ، نفسیات، دینیات اور اِس کے متعلقات سے مرثیہ نگار کو اپنے مرثیے میں جابجا کام لینا پڑتا ہے۔ مرثیہ نگار کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ تمام فنونِ لطیفہ کے اسرار و رموز کو سمجھتا ہو، کیونکہ مرثیے میں مصوری، موسیقی ہئیت اور تعمیر کا علم بھی بروئے کار آتا ہے۔ مثلاً مناظرِ فطرت کا بیان، میدانِ جنگ کی نقشہ کشی، امامِ عالی مقام اور اُن کے رُفقار کے شوقِ شہادت کی کیفیت، فوجِ یزید کی کثرت اور بربریت۔ ان تمام باتوں کی تصویر کشی کے لئے ایک مصوّر کی نظر اور ایک ماہرِ نفسیات کا ذہن بھی ضروری ہے۔ اِسی طرح مرثیے کی بحروں کا انتخاب، مصرعوں کا دروبست، الفاظ کی بندش موقع کی مناسبت سے مصرعوں کا مردّف یا غیر مردّف ہونا اور بیت یا ٹیپ کے دونوں مصرعوں میں قافیہ اور ردیف کا التزام ـــــ ان تمام باتوں میں فنِ موسیقی کو بڑا دخل ہے۔ مرثیے کا پلاٹ اور اُس کے عناصرِ ترکیبی (یعنی چہرہ، رُخصت، سراپا، آمد، رجز، شہادت اور دُعا) کا حُسنِ تناسب علمِ ہئیت و تعمیر کا آئینہ دار ہے۔

فکر کی بلندی، خیال کی پاکیزگی اور اعلیٰ اخلاقی اقدار کا شعور تو ہر شاعر کو ہونا چاہیئے، لیکن مرثیہ نگار کو اس کے ساتھ ہی مجلسِ عزا کے تقاضوں اور فنِ خطابت کے لوازم سے بھی واقف ہونا لازمی ہے۔

اُردو مرثیے کی یہی دشواریاں ہیں جن کے پیشِ نظر دوسری اصنافِ سخن کے مقابلے میں بہت کم لوگوں نے اِس طرف توجہ دی ہے۔ گذشتہ نصف صدی میں یوں تو بہت سے مرثیہ گو شعرا سامنے آئے ہیں، لیکن مرثیہ نگاری کے جس معیار کا تعارف مذکورہ بالا سطور میں کرایا گیا ہے اُس کے پیشِ نظر اگر دیکھا جائے تو صحیح معنوں میں مرثیہ نگاروں کی تعداد بہت ہی کم نظر آئے گی۔

ڈاکٹر صفدر حسین اُن چند مرثیہ نگاروں میں سے ایک ہیں جنھوں نے انتہائی نامساعد حالات میں بھی اپنا خونِ جگر ملا کر اس صنفِ سخن کو زندہ رکھنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اُن کے پانچوں مرثیوں میں وہ تمام خصوصیات موجود ہیں جن کا تذکرہ پہلے کیا جا چکا ہے۔ "علمدارِ کربلا" اُن کا تیسرا مرثیہ ہے۔ ستّر بند کا یہ مرثیہ حضرتِ عباس علمدار علیہ السلام کی کربلا میں جنگ اور شہادت کے واقعات پر مشتمل ہے۔ اِسی موضوع پر ڈاکٹر صاحب کا پہلا مرثیہ "آئینِ وفا" بھی موجود تھا، لیکن اُس میں کربلا کے تاریخی پس منظر میں حضرتِ عباسؑ کے کردار کو نمایاں کیا گیا تھا اور ایک سو نو بند پر مشتمل ہونے کے باوجود اُس میں روزِ عاشور کی جنگ اور شہادتِ حضرتِ عباسؑ کے بعض گوشے بیان ہونے سے رہ گئے تھے، جن کے لئے ڈاکٹر صاحب کو "علمدارِ کربلا" کے عنوان سے ایک نیا مرثیہ کہنا پڑا۔

دونوں مرثیوں کی بحر بھی ایک ہی ہے اِس لحاظ سے "علمدارِ کربلا" کو "آئینِ وفا" کا تکملہ کہا جائے تو بیجا نہیں ہوگا۔ اِس باہمی ربط کے باوجود یہ دونوں مرثیے انفرادی طور پر بھی مکمّل ہیں۔

میں پہلے بھی یہ بات کہہ چکا ہوں لیکن ضمناً یہاں اس کی تکرار ضروری معلوم ہوتی ہے کہ ڈاکٹر صفدر حسین مرثیہ کہنے کا ڈھنگ خوب جانتے ہیں اور مرثیہ خوانی کے فن پر بھی اُنہیں عبور حاصل ہے، اس لئے وہ اپنے مرثیے کے مطلع ہی سے قاری کی توجہ کو مسخّر کرنے کا عمل شروع کر دیتے ہیں اور چہرہ مکمّل ہونے تک اُن کی گرفت اس قدر مضبوط ہو جاتی ہے کہ پھر اختتامِ مرثیہ تک قاری

سامع مرثیے کی گرفت سے نہیں نکل سکتا۔ اُن کا مرثیہ بتدریج مختلف مرحلوں سے گزرتا ہوا آگے بڑھتا ہے۔ امام علیہ السلام سے اجازت یا خیمۂ اہلِ حرم سے رُخصت کے تحت وہ اپنے ممدوح کا تعارف کراتے ہیں اور اس کا سراپا اس انداز سے بیان کرتے ہیں کہ اس کی تمام ذاتی اور خاندانی خصوصیات نمایاں ہوجاتی ہیں۔ میدانِ جنگ میں آمد کے سلسلے میں وہ محاذ کا نقشہ اور دشمن کی فوج کی کثرت قوت اور بے دینی کی جھلک دکھاتے ہیں۔ رزم سے رجز کی منزل بھی آتی ہے جس میں وہ ممدوحِ مرثیہ کی زبانی اُن خدمات کا ذکر کرتے ہیں جو دینِ اسلام کے لئے محمدؐ و آلِ محمدؐ نے سرانجام دیں اور اُن کارناموں کا ذکر بھی کرتے ہیں جو ممدوحِ مرثیہ نے یا امام حسینؑ نے یا آلِ محمدؐ نے وقتاً فوقتاً سر کئے۔ اختتامِ رجز، دعوتِ خیر اور مذمتِ شر پر ہوتا ہے اس کے بعد رزم کا مرحلہ آتا ہے گھوڑے اور تلوار کی تعریف ہوتی ہے معرکۂ کارزار میں ممدوحِ مرثیہ کے کارہائے نمایاں کا تذکرہ ہوتا ہے اور اس کے بعد شہادت کی منزل آتی ہے۔ مرثیے کی مناسبت سے گریہ انگیزی عموماً رُخصت اور شہادت کے مواقع پر ہوتی ہے۔ مقطع سے پہلے دُعا اور بعض اوقات مقطع کے بند ہی میں دُعائیہ کلمات آجاتے ہیں۔ یہ بُنیادی ڈھانچا ہے جس پر ڈاکٹر صفدر حسین اپنے مرثیے کی عمارت تعمیر کرتے ہیں۔ کلاسیکی مرثیے کی بھی یہی حدود ہیں۔ "علمدارِ کربلا" میں بھی یہی صورت موجود ہے۔ چنانچہ پہلا بند یہ ہے ؎

صبحِ عاشورِ محرّم جو نمودار ہوئی　　بزمِ فطرت کی فضا مطلعِ انوار ہوئی
ہر کلی حمدِ خدا میں لبِ اظہار ہوئی　　نکہتِ لالہ و گُل خواب سے بیدار ہوئی
بوئے دوشیزۂ نسرین دمن آنے لگی
سہمی سہمی ہوئی حُجرے سے دُلہن آنے لگی

صبح کا منظر بیان کیا گیا ہے لیکن وہ صبح جو عاشورِ محرّم کو کربلا میں طلوع ہوگئی تھی عام صبحوں سے مختلف تھی۔ ڈاکٹر صفدر نے اس فرق کو زمان و مکان کی تمام رعایتوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے واضح کیا ہے۔ اسی منظر سے مرثیے کا چہرہ تیار ہوا ہے، جو پہلے بند سے لے کر

آٹھویں بند تک اپنی جھلک دکھاتا ہے۔

ڈاکٹر صفدر کی فکر کیمرے کے لینس کی طرح ایک ایک منظر کو محفوظ کرتی ہوئی آگے بڑھتی ہے اور اس منظر کشی میں جو کردار سامنے آئے ہیں اُن کے مراتب کا بھی خاص خیال رکھا گیا ہے۔ مصوری کا انداز دیکھئے پہلے ایک وسیع کینوس پر صبح کا منظر اُبھرتا ہے جس میں کربلا کی تمام رعائتیں موجود ہیں۔ اس کے بعد اذان کی آواز بلند ہوتی ہے۔ یہ اذان بھی کوئی عام اذان نہیں ہے لشکرِ امام میں شبیہہِ رسولؐ نے یہ اذان دی تھی۔ ڈاکٹر صفدر نے اس پہلو کو اپنے مخصوص انداز میں نمایاں کیا ہے۔ ملاحظہ کیجئے ؎

علی اکبرؑ کی اذاں تھی مترنّم اعجاز — بن گیا عالم خاموش جہانِ تگ و تاز
ہو گیا گُنگ خموشی کا بھی بجتا ہوا ساز — ہو گئی بند فرشتوں کے پروں کی آواز
عالمِ کیف میں حوروں کی جبینیں خم تھیں
جھلملاتے ہوئے تاروں کی بھی آنکھیں نم تھیں

اذان ختم ہوئی۔ نماز کا اہتمام شروع ہوا۔ امام مصلّے پر تشریف لائے۔ مرثیے کے چوتھے بند میں یہی منظر پیش کیا گیا ہے ؎

مہرِ سجدہ خطِ ابیض کی جو تنویر بڑھی — بن گیا آئینۂ خُلد گلستانِ نبیؐ
لائے تشریف مُصلّے پہ حسینؑ ابنِ علیؑ — صف بصف تھے رُفقا بہرِ نمازِ سحری
نیتیں بندھتے ہی فردوس کے در کھلنے لگے
عملِ خیر کے میزان میں دل تُلنے لگے

حسینؑ ابنِ علیؑ اور اُن کے رُفقا کی یہ جماعت بھی کوئی معمولی جماعت نہ تھی۔ مرثیے کے پانچویں چھٹے اور ساتویں بند میں اس جماعت کی اہمیت، عظمت اور حوصلے کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ ہر بند اپنی جگہ قابلِ ذکر ہے لیکن خصوصیت سے پانچویں بند کی بیت ملاحظہ کیجئے حسینی جماعت کی اہمیت کو کس عنوان سے بیان کیا ہے ؎

روک دے پاؤں تو رفتارِ زمانہ رک جائے
آنکھ اٹھا دے تو فرشتوں کی جماعت جھک جائے

ڈاکٹر صفدر حسین کے کلام میں ایک خوبی یہ ہے کہ وہ وسیع تر مضمون کو ایک مختصر مصرع میں بیان کر دیتے ہیں۔ اشاریت اور ایجاز کا یہ حُسنِ تناسب اُن کے زیرِ نظر مرثیے کے ہر بند میں موجود ہے مرثیے کا آٹھواں اور نواں بند ملاحظہ کیجیے۔ اصل مضمون کی طرف کس خوبصورتی سے گریز کیا ہے ؂

الغرض پَو نہ پھٹی تھی کہ ہوئی ختم نماز　　جو سر افگندہ تھے سجدوں میں اُٹھے سرافراز
ناگہاں آنے لگی طبلِ وِغا کی آواز　　متبسّم ہوئے لب ہائے شہنشاہِ حجاز
عکسِ انجام بہ آئینۂ حال آنے لگا
رکھی تسبیح تو چہرے پہ جلال آنے لگا

سُن کے آوازِ دُہل شہ کے غمخوار اُٹھے　　یا علیؑ کہہ کے مصلّوں سے وہ دیندار اُٹھے
مُسکراتے ہوئے تنتے ہوئے جرّار اُٹھے　　جاگ اُٹھی روحِ شجاعت جو علمدارؑ اٹھے
وہ علمدارؑ کہ تھا ناشرِ فرمانِ حُسینؑ
حاملِ رایتِ حق، شوکتِ دیں شانِ حُسینؑ

علمدار اور علم، لازم و ملزوم ہیں اِس لئے مرثیے کا دسواں اور گیارھواں بند عَلَم کی تعریف میں ہے اور اس کے تاریخی پس منظر کو بھی نمایاں کرتا ہے۔ بارھواں بند اجمالاً خصوصیاتِ علمدارؑ کی نشاندہی کرتا ہے ؂

اَبروئے عزم پہ صفّین سے بَل تھا موجود　　جس کو دنیا کے رویّے نے کیا اور افزود
کربلا میں ہوا جس دن سے ورودِ مسعود　　بن گئے پیکرِ آیاتِ جلالِ معبود
شکنِ غیرتِ اَبروئے شجاعت نہ گئی
کٹ گئے ہاتھ مگر رُخ کی جلالت نہ گئی

ڈاکٹر صفدر حسین کے اِس مرثیے میں ایک مصرع دوسرے مصرع سے اور ایک بند دوسرے بند سے

اس طرح مربوط ہے کہ کسی ایک بند بلکہ ایک مصرع کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے مطلع سے مقطع تک ایک مسلسل زنجیر ہے جس کی ایک کڑی دوسری کڑی سے پیوست ہوتی چلی گئی ہے۔ ایک بند کا مضمون دوسرے بند کے مضمون کی بنیاد کا کام دیتا ہے۔ تیرھویں بند میں حضرتِ عباسؑ کو اہتمامِ لشکر میں مصروف دکھایا گیا ہے، اور یہ وضاحت بھی کر دی گئی ہے کہ نگاہِ عباس میں مقامِ حسینؑ کیا تھا۔ اس بند کے پہلے دو مصرعے بطورِ مثال پیش ہیں۔ ملاحظہ کیجئے ؎

لبِ حضرت سے مشیت کا اشارہ جو ہُوا
جاں نثاروں کو یہ لائے سرِ میدانِ وغا

اِن دو مصرعوں میں مقامِ امامؑ، عقیدتِ حضرتِ عباسؑ اور رُفقائے امام کا شوقِ شہادت اس خوبی کے ساتھ اُجاگر کیا گیا ہے کہ دل سے بے ساختہ داد نکلتی ہے۔ مرثیے کے چودھویں، پندرھویں اور سولھویں بند میں آغازِ جنگ سے قبل خُطبۂ امام سے بات کی ابتدا کر کے مضمون کو اس مقام تک پہنچا دیا ہے جہاں تمام ناصرانِ امامِ عالی مقام شہید ہو چکے ہیں۔ اب صرف علی اکبرؑ اور حضرتِ عباسؑ باقی ہیں۔ چنانچہ سترھویں بند میں یہی صورتِ حال پیش کی گئی ہے ؎

دھوپ ڈھلنے لگی چہرہ ہوا سورج کا اُداس　　فرض اپنا جو ادا کر چکے وہ فرض شناس
بس اُدھر تھے علی اکبرؑ تو اِدھر تھے عباسؑ　　راس و چپ کوئی بھی باقی نہ رہا شاہ کے پاس
عازمِ سیرِ گلستانِ جناں تھے دونوں
چشمِ حسرت سے سوئے شہ نگراں تھے دونوں

اس کے بعد ڈاکٹر صفدر نے حضرتِ علی اکبرؑ اور حضرتِ عباسؑ کی انفرادی اہمیت کو واضح کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ نگاہِ امامؑ میں اِن حضرات کا کیا مرتبہ تھا جس کی وجہ سے انھیں اپنے سے جدا کرتے ہوئے امامِ حسینؑ کو بہت زیادہ سوچنا پڑا ؎

ایک ہمشکلِ نبیؐ، دوسرا حیدر کا نشاں　　ایک تھا نورِ نظر دوسرا تھا راحتِ جاں
یہ امانت تھی پدر کی، وہ بہن کا ارماں　　ایک سے تابِ جگر دوسرے سے دل کی تواں

مرحلہ سخت ہے کیونکر انھیں رخصت دے دیں
کس کو روکیں کسے مرنے کی اجازت دے دیں

یہ مرثیے کا انیسواں بند ہے اور اس میں بھی بھرپور ڈرامائی کیفیت موجود ہے۔ ڈاکٹر صفدر نے امام حسینؑ کی ذہنی کیفیت اور جذباتی کشمکش کو جس خوبی سے اس بند کی بیت میں پیش کیا اُس کی داد نہ دینا بُخل ہوگا۔

امام حسین علیہ السلام، کربلا میں جنگ کرنے نہیں آئے تھے۔ اُن کا ہر عمل خدا کی مشیت کے تابع تھا۔ حضرت عباس علیہ السلام کو اگر جنگ کی اجازت دے دی جاتی تو اُن کی شجاعت اور قوتِ خداداد سے یزیدیت کا تختہ اُلٹ جاتا۔ مشیتِ الٰہی اور اس کے تحت امام حسینؑ کی خواہش یہ تھی کہ صبر اور ایثار کے ذریعہ یزیدیت کو ایسی شکست دی جائے کہ رہتی دُنیا تک ہر انسان اُس سے متنفر ہو جائے اِس لئے بھی اُنھوں نے حضرتِ عباسؑ کو جنگ کی اجازت نہیں دی اور اُن کی درخواست کو مُلتوی کرتے رہے۔ آخر وہ وقت آگیا جب کوئی نہ رہا صرف اکبرؑ و عباسؑ رہ گئے اور دونوں نے اجازتِ جہاد طلب کی۔ ڈاکٹر صفدر حسین نے اس موقع کی نفسیات کو بڑی خوبی سے نظم کیا ہے اور امرِ واقعہ کو تاریخی حقائق کی روشنی میں دیکھا ہے۔

رفیقانِ امام علیہ السّلام میں بچّوں کی حالت، سہ روزہ پیاس کی شدت سے زبوں تر ہوگئی تھی اور سکینہؑ بنتِ حسینؑ کے بیہوش ہونے کی خبر حضرتِ عباسؑ کو ملی تو وہ بے تاب ہوکر امام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور پانی لانے کی اجازت طلب کی۔ پانی پر دشمنوں کا قبضہ تھا اور بغیر جنگ کے حصولِ آب ممکن نہ تھا۔ چنانچہ جب امام حسینؑ نے حضرتِ عباسؑ سے یہ عہد لے لیا کہ وہ صرف پانی حاصل کرنے کے لئے جدوجہد کریں گے اور اس کے علاوہ کسی اور مقصد سے جنگ نہیں کریں گے تب اُنھیں رخصت دی گئی۔ علمِ امامت میں یہ موجود تھا کہ پانی خیمۂ حسینی تک نہیں پہنچ سکے گا اور حضرتِ عباسؑ شہید ہو جائیں گے، اِس لئے بھائی کو رُخصت کرنا امام کے لئے جتنا صبر آزما تھا، وہ بھی ظاہر ہے۔ ڈاکٹر صفدر حسین نے اپنے مرثیے کے بیسویں، اکیسویں اور بائیسویں بند میں اِسی صورتِ حال کو اجمالاً پیش کیا ہے۔

مرثیے کے تیئسویں بند میں وہ منظر پیش کیا گیا ہے جب علمدارِ حسینی اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر لشکرِ اعدا کی طرف دریا کی سیدھ میں روانہ ہوتے ہیں۔

چوبیسویں بند میں حضرتِ عباسؑ علیہ السلام کی آمد سے لشکرِ اعدا میں خوف و ہراس کی کیفیت کا نقشہ کھینچا ہے اور اسی بند کے چوتھے مصرع سے رَجَز کا مضمون پیدا کیا ہے جو چھبیسویں بند تک اپنے نقطۂ عروج کو جا پہنچتا ہے۔

ستائیسواں اور اٹھائیسواں بند اس کیفیت کو بیان کرتا ہے جو میدانِ جہاد میں حضرتِ عباسؑ پر طاری تھی۔ اِسی میں غازی کا سراپا بھی اجمالاً بیان ہو گیا ہے۔ مُشک و عَلَم اور تلوار کی تعریف بھی ہے جس میں تشبیہات اور استعاروں کی خوبی بیان نظر آتی ہے ؎

سایہ افگن تھا عَلَم بالِ ہُما کی صورت
برق اِک ہاتھ میں تھی قہرِ خدا کی صورت

---

عَلَم و مُشک جو والفتح کی تحریر بنے
جوہرِ تیغ انا لبرق کی تفسیر بنے

اُنتیسویں[۲۹] بند سے بیالیسویں[۴۲] بند تک حضرتِ عباس علیہ السلام کے اس جہاد کی منظر کشی کی گئی ہے جو اُنھوں نے ساحلِ دریا پر قبضہ کرنے کے لئے کیا تھا۔

موجودہ زمانے کے لوگ آتشیں اسلحہ اور اُس کے اندازِ استعمال کا تصوّر تو آسانی سے کر سکتے ہیں لیکن نیزہ اور تلوار سے لڑائی ہزار سال قبل کے زمانے سے تعلق رکھتی ہے۔ اُس کے داؤ پیچ اور تکنیک حرب و ضرب کو موجودہ دور کے لوگوں کے سامنے اِس طرح پیش کرنا کہ ہر بات آئینہ ہو جائے اور ماضی کی ایک جیتی جاگتی تصویر سامنے آ جائے بہت مشکل کام ہے۔ اِس کے لئے ماضی کے فنونِ حرب اور تاریخ سے فاضلانہ واقفیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ڈاکٹر صفدر حسین نے اس منزل پر بھی اپنی قدرتِ بیان اور علم و نظر کا ثبوت دیا ہے۔ مرثیے کی کلاسیکیت کو بھی ہاتھ سے

نہیں جانے دیا اور اُس زمانے کے آلاتِ حرب اور میدانِ جنگ کی مصوری اس انداز میں کی ہے کہ موجودہ زمانے کے قاری اور سامع کو صحیح صورتِ حال کے ادراک میں کوئی دشواری نہیں ہوتی ہے

چونکہ غازی تھا خفا گھاٹ کے رکھوالوں سے
بے حیا مُنھ کو چھپائے ہوئے تھے ڈھالوں سے

---

بسکہ تھی مُوت کی مٹھی میں عنانِ لشکر
تھیں وہ قسرنا کی صدائیں کہ فغانِ لشکر

---

دست و پا بکھرے تھے ٹوٹے ہوئے نیزوں کی طرح
بیرقیں ڈھیر تھیں اُکھڑے ہوئے خیموں کی طرح

---

مَوجزن دشت میں تھی خون کی ہر سُو ندی
لاشیں یوں بہتی تھیں ٹوٹی ہوئی جیسے کشتی

---

تیغ قبضے میں کہ اک پیکرِ مَنو ہاتھ میں ہے
رُخ ہے خورشیدِ مُبیں اور مہِ نو ہاتھ میں ہے

---

معجزہ دشت میں دکھلاتے تھے دست و بازو
مُرغِ مذبوح کے مانند تڑپتے تھے عدو
آبِ شمشیر میں تھے غرق عدو تا بہ گلو
سُرخ تھی رَن کی زمیں مَوت چھڑکتی تھی لہو
گردنیں کٹ کے بھی فوارہ صفت خاک پہ تھیں
خونِ ناپاک کی چھینٹیں خس و خاشاک پہ تھیں

---

خاک اُڑنے لگی لشکر میں ستم گاروں کے
ہر طرف ڈھیر تھے ٹوٹے ہوئے ہتھیاروں کے

---

کیا تعجب کہ مَلک جُھک کے زمیں تھامے ہوں
ہاتھ عباسؑ کا جبریلِ اَمیں تھامے ہوں

---

کلاسیکی مرثیے کی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے ڈاکٹر صفدر حسین نے مرثیے کے سینتیسویں[۳۹] سے اُنتالیسویں[۴۰] بند تک خصوصی طور پر حضرتِ عباسؑ کی تلوار کے جوہر بیان کئے ہیں ؎

یوں چلی تیغ کہ ایوانِ دَغَل بیٹھ گیا
جنبشِ باد سے بابلؔ کا محل بیٹھ گیا

---

تیغِ غازی کی لچک حشر کی انگڑائی تھی
جس کے پَرتو سے ہُوا دشت کی پُلائی تھی

ڈاکٹر صفدر حسین نے تلوار اور گھوڑے کی تعریف مزید کی ہے لیکن اُس میں دَورِ جدید کے تقاضوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ استعاروں اور تشبیہوں سے کام لے کر بہت تیزی سے وہ مرثیے کی اُس منزل سے آگے بڑھ گئے ہیں۔ مرکب کی تعریف کو وہ راکب کی تعریف کے بغیر بیان نہیں کرتے ؎

گھاٹ پر شور تھا بھاگو کہ دلیر آپہنچا
وہ چمکتا ہے عَلَم اَب نہیں دیر آپہنچا
باگیں پھیرو کہ نہیں راہ کا پھیر آپہنچا
فرسِ تیز جری صورتِ شیر آپہنچا

اُس کی ٹاپوں کی دھمک لے کے ہوا آتی ہے
دلِ گیتی کے دھڑکنے کی صدا آتی ہے

گھاٹ پر قبضے کا منظر ڈاکٹر صفدر حسین نے جس اختصار اور جامعیت کے ساتھ بیان کیا ہے اُس سے مضمون بیان کی گرفت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے ۔

زلزلہ تھم گیا گھوڑے نے قدم گاڑ دیا
جب اُلٹنے لگی گیتی تو عَلم گاڑ دیا

ساحلِ نہر پہ لہرانے لگا سبز عَلم — آنکھ خورشید کی جھپکاتا تھا جس کا پیچ و خم
دامنِ عترتِ اطہار تھا جس کا پرچم — جس کے سائے میں بڑھی حُرمتِ محرابِ حرم
سَر اُٹھائے ہوئے کہتا تھا پیمبرؐ کا نشاں
میں ہوا آج سے عباسؑ دلاور کا نشاں

جس مقصد سے سرکارِ وفا نے میدانِ جہاد میں قدم رکھا تھا اُس کی تکمیل ہوئی مشکیزۂ سکینہؑ لبریز ہوا اور حضرتِ عباسؑ نہر سے خیمۂ امام کی جانب روانہ ہوئے۔ اس منظر کو مرثیے کے چوالیسویں[۴۴] بند میں بیان کیا گیا ہے جس کی بیت کا جواب نہیں ہے۔ اسے حضرتِ عباسؑ کی اس تاریخی جنگ کا خلاصہ کہنا چاہیئے

سبھی دُنیا میں فقط تیغِ دو دم لے کے لڑے
صرف عبّاسؑ تھے جو مشک و عَلم لے کے لڑے

کربلا کے تمام مجاہدین میں صرف حضرتِ عبّاس علیہ السّلام وہ فردِ واحد ہیں جنھیں دوسری جنگ کرنا پڑی۔ پہلی مرتبہ گھاٹ تک پہنچنے کے لئے اور دوسری مرتبہ پانی کو خیمے تک پہنچانے کے لئے۔ مرثیے کی تکنیک اور اُس کے عناصرِ ترکیبی کی ترتیب کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے جنگ کے سلسلے میں تمام لوازم کو دوسری مرتبہ بھی لانا ضروری تھا اور تکرارِ مضامین سے پہلو بھی بچانا تھا۔ ڈاکٹر صفدر حسین اس مرحلے سے بھی کامیابی کے ساتھ گزرے ہیں۔ مرثیے کے پینتالیسویں[۴۵] بند سے لے کر چھپنویں[۵۶] بند تک جو منظر کشی کی ہے اُس میں حضرتِ عبّاسؑ کی واپسی کی جنگ دکھائی گئی ہے جس کا نقطۂ عروج اُن کی شہادت ہے۔ دشمنوں کی بعدِ فرار دوبارہ یلغار کو اس کے اسباب و علل کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ غازی عبّاسؑ کی رزم کو اُن کے عزم کے ساتھ دکھایا گیا ہے۔

غم نہیں راہ میں گر سنگِ گراں باقی ہے
مشک لے جاؤں گا گر جسم میں جاں باقی ہے

رجزیہ اشعار بھی حسب موقع آئے ہیں اور خوبی یہ ہے کہ دوسری جنگ کے رجز کا انداز پہلی جنگ سے مختلف ہے جس کی وجہ سے تکرارِ مضمون نہیں ہونے پائی۔ یہی صورت گھوڑے اور تلوار ڈھال اور عَلَم کے مضامین میں بھی نمایاں ہے۔ حضرتِ عباس علیہ السلام کی واپسی کی جنگ پہلی جنگ سے زیادہ شدید تھی۔ یلغارِ اعدا بھی پہلے سے بہت زیادہ تھی۔ اِس صورتِ حال کو ڈاکٹر صفدر حسین نے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ بیان کیا ہے ؎

ایک انبوہِ گراں، رکھتیں یہ کس کس پہ نظر　　　بھیڑ ہی بھیڑ ہے ہر سمت کریں وار کدھر
کاٹیں تیغوں کی زباں، تیروں کے پَر گُرزوں کے سر　　　بوڑیاں نیزوں کی توڑیں کہ کمانوں کی کمر
موجزن قلب میں تھا جذبۂ اسلام بہت
صرف دو ہاتھ تھے اور پیش نظر کام بہت

دشمنوں نے شدید تر حملے کیے پُشتِ غازی سے وار ہوئے اور پہلے داہنا اور پھر بایاں ہاتھ حضرتِ عباسؑ نے مشک و عَلَم کے تحفظ میں نثار کر دیا لیکن عزم میں اُس وقت تک کمی نہیں آئی جب تک کہ دم میں دم رہا ؎

دانت سے مشک کو پکڑے رہا پھر بھی جرّار　　　وہی جرأت، وہی ہمّت، وہی شیرانہ وقار
ناگہاں پُشت سے سَر پر ہوا اک گُرز کا وار　　　آنکھ میں تیر لگا، گرنے لگا سینہ فگار
دی صدا، یا شہِ دیں! خُلد کے عازم کا سلام
لیجیے، مخدومِ جہاں! آخری خادم کا سلام

ڈاکٹر صفدر حسین نے اس مرثیے میں حضرتِ عباسؑ علیہ السلام کی شخصیت کے ہر پہلو کو اُجاگر کیا ہے۔ حضرتِ عباسؑ کے کردار کا یہ پہلو بھی کہ اُنھوں نے کبھی امام حسین علیہ السلام کو بھائی کہہ کر خطاب نہیں کیا بلکہ ہمیشہ اُنھیں آقا اور مخدوم سمجھا اور خود کو خادمِ امامِ حسینؑ سمجھتے رہے، مذکورہ بالا بند کی ٹیپ کے شعر میں نمایاں ہوگیا ہے۔ اِس کے ساتھ ہی یہ اشارہ بھی موجود ہے کہ اب امام کی خدمت کرنے والا کوئی باقی نہیں رہا۔ حضرتِ امامِ حسین علیہ السلام پر اس واقعہ کا کیا اثر ہوا۔ اس کا تذکرہ

مرثیے کے ستاونویں[۵۷] بند سے انسٹھویں[۵۹] بند تک کیا گیا ہے۔

امامِ عالی مقام کا لاشِ حضرتِ عباسؑ پر پہنچنا اور دونوں بھائیوں کا آخری مکالمہ ساٹھویں[۶۰] بند سے انسٹھویں[۶۹] بند تک پہنچتا ہے اور اس میں بھرپور تاثر موجود ہے جو اس بیت میں اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ جاتا ہے ؎

قہر برپا گیا جب موت کی انگڑائی نے
بھائی کی گود میں دم توڑ دیا بھائی نے

کلاسکی مرثیے کے آخری اجزائے ترکیبی میں "بَین" اور "دُعا" شامل ہیں۔ ڈاکٹر صفدر حسین نے "بَین" کے حصّے کو امام حسین علیہ السلام اور حضرتِ عباسؑ کے مکالمے کا جُز بنا کر پیش کیا ہے جس سے اثر انگیزی میں اضافہ ہو گیا ہے۔ "دُعا" کی منزل سے پہلے ڈاکٹر صفدر کے مرثیوں میں عموماً ایک فکر انگیز ٹھہراؤ آتا ہے۔ اِس مقام پر وہ اپنے مرثیے کے ممدوح کے سامنے سرِ عقیدت خم کرتے ہوئے نظر آتے ہیں چنانچہ زیرِ نظر مرثیے میں بھی یہی صورت ہے۔ مقطع سے پہلے ایک بند مرثیہ نگار کے جذباتِ عقیدت کا آئینہ دار ہے۔ اِس سے یہ غلط فہمی پیدا نہیں ہونا چاہیئے کہ باقی تمام مرثیے میں اظہارِ عقیدت موجود نہیں تھا۔ ڈاکٹر صفدر حسین کے مرثیوں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اُن کا ہر مصرع عقیدت میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے، لیکن اختتامِ مرثیہ سے پہلے وہ مجموعی طور پر ایک بار پھر اپنا سرِ عقیدت ممدوحِ مرثیہ کے سامنے خم کر دیتے ہیں اور اس کے بعد دُعائیہ کلمات کہہ کر مرثیہ ختم کرتے ہیں۔

ستّر بند کا یہ مرثیہ قدیم اور جدید اسالیب کا ایک خوشگوار امتزاج لئے ہوئے ہے۔ علمِ بیان اور علمِ بدیع سے تقریباً ہر بند میں بلکہ ہر مصرع میں کام لیا گیا ہے۔ مرثیے کے فنّی رچاؤ کے ساتھ بیان و بدیع کی آمیزش سے دلکشی میں کئی گُنا اضافہ ہو گیا ہے۔

علمِ معانی کی ایک یہ خوبی بھی اِس مرثیے میں موجود ہے کہ پورے مرثیے میں (صرف چند ابیات کو چھوڑ کر) ہر بیت ہر مصرع میں مُبتدا اور خبر موجود ہے اور پہلا مصرع اپنی جگہ انشائی اعتبار سے مکمّل ہونے کے ساتھ دوسرے مصرع کی بُنیاد کا کام دیتا ہے۔

اکثر و بیشتر مصرعے سہلِ ممتنع میں ہیں اور جہاں یہ صورت نہیں ہے وہاں بلاغت اپنا جلوہ دکھاتی ہوئی نظر آتی ہے اور اس طرح مرثیے میں فصاحت و بلاغت کا توازن برقرار رہتا ہے۔

ڈاکٹر صفدر حسین کے اسلوبِ مرثیہ نگاری پر میر انیس کا اثر نمایاں ہے لیکن میر انیس کے مقابلے میں اُن کے یہاں تفصیل کے بجائے اجمال کا رُجحان زیادہ ہے اور میرے خیال میں یہ دورِ جدید کے اُن تقاضوں کا نتیجہ ہے جن کو ڈاکٹر صفدر نظر انداز نہیں کر سکتے۔

لاہور

۱۸ ۸/۱۹۷۵ء

# جلوۂ تہذیب

راغب مرادآبادی — کسریٰ منہاس

ڈاکٹر محمد احسن فاروقی — ناصر زیدی

روزنامہ ڈان کراچی — پروفیسر سلیم اختر

پروفیسر حامد حسن سیّد — مولانا ماہر القادری

ڈاکٹر اسد اریب — روزنامہ مساوات، لاہور

پروفیسر سجّاد باقر — پروفیسر صفی حیدر دانش

سید قمر حیدر قمر — علی حیدر ملک

انتظار حسین — سید انصار ناصری

احمد سبطین شاہجہانی — قیوم شاکر

پیام شاہجہانپوری — سیّد سعید مرتضیٰ زیدی

محمد قیوم — سیارہ ڈائجسٹ

حفیظ صدیقی — اخبارِ خواتین

محمد حبیب اللہ اوج

# رباعی

ہر بند ہے شرحِ غمِ ممتازِ حسینؑ
ہر بیت ہے آئینۂ جاں بازِ حسینؑ
اکبرؑ کی شجاعت کے ہیں جوہر اِس میں
صفدر کا یہ مرثیہ ہے اعجازِ حسینؑ

راغب مرادآبادی

ڈاکٹر محمد احسن فاروقی

# مجلس پر اثرات

آج اتوار (۱۱ر جولائی ۱۹۶۵ء — ۱۱ ربیع الاوّل ۱۳۸۵ھ) پھر ڈاکٹر صفدر حسین مرثیہ نگاری اور مرثیہ خوانی کی روایات کو حیاتِ نو بخشنے کے لئے امام بارہ رضویہ کالونی (کراچی) میں زیب دہِ منبر ہوئے۔ پھر اُنھوں نے جو مرثیہ "جلوہ تہذیب" کے عنوان سے پڑھا وہ جدید شاعری کی فلسفیانہ گرمی (INTELLECTUAL FERVANCE) کو ہماری پرانی مرثیہ نگاری کی رسمی خصوصیات سے ملاتا ہے۔ چنانچہ مرثیہ حضرتِ علی اکبرؑ کے حال میں تھا مگر اُس کا چہرہ تہذیب پر ایک جدید نظم کی صُورت میں سامنے آیا۔ موضوع تہذیب ہے، مطلع کی ردیف بھی تہذیب ہے اور بارہ[۱۲] بندوں میں تہذیب کی مکمل توضیح کر دی گئی ہے۔ یوں تو ہر بند بڑا زور دار ہے اور صفدر صاحب نے اُسے ایسی آواز، اداؤں اور اشاروں سے پڑھا کہ وہ مشاق مرثیہ خوان نظر آنے لگے مگر پوری مجلس کو پھڑکا دینے والا بند چوتھا تھا جس میں تہذیب کی اہم ترین خصوصیت کو یوں رقم کر دیا گیا ہے ؎

ہے یہی حسُن کا اِدراک بنائے تہذیب
یہی احساس ہوا جلوہ نمائے تہذیب
یہی تزکیۂ باطن ہے صفائے تہذیب
تشنگی کا یہی جذبہ ہے غذائے تہذیب

یہی تطہیر ہے صفدر یہی تنویر بھی ہے
یہی انسان کے ہر خواب کی تعبیر بھی ہے

اور پھر نواں بند اس سے بھی آگے نکل گیا ؎

نازِ تخلیق یہی، رازِ تجلّی بھی یہی
جلوۂ طور یہی، آتشِ سینا بھی یہی
سینۂ گوتم و زرتشت کا شعلہ بھی یہی
حُسنِ یُوسف بھی یہی ہے یدِ بیضا بھی یہی

یہی ناگاہ دلِ کوہِ صفا سے نکلا
مشعلِ نور لیئے غارِ حِرا سے نکلا

موضوعِ تہذیب سے حضرتِ علی اکبرؑ کے حال کی طرف گُریز بھی بڑے قیامت کی ہے جس سے کربلا اور حضرتِ علی اکبرؑ تہذیب کے اشارے بن کر سامنے آتے ہیں اور جدید فلسفیانہ شاعری، روایاتِ مرثیہ نگاری سے ہم آہنگ ہو جاتی ہے ؎

کربلا کیا ؟ اِنھیں آیاتِ درخشاں کی دلیل
ایک، صَدیوں کی روایات کی صبحِ تکمیل
جس پہ بَرپا ہوئی قُربانیِ موعودِ خلیلؑ
علی اکبرؑ تھے یہاں اور وہاں اسماعیلؑ

خُونِ کم مایہ اُدھر خُونِ نبی کے بَدلے
لاکھ تلواریں اِدھر ایک چُھری کے بَدلے

اس کے بعد پُرانے مرثیہ نگاروں کی طرح حضرتِ علی اکبرؑ کی مدح ہوتی ہے۔ یہاں حضرتِ موصُوف کی جوانی اور حُسن ہی زیادہ تر موضوعِ مدح رہے ہیں۔ صفدر صاحب نے کم از کم تین بندوں میں شباب کا ایک نیا نقشہ کھینچا ہے جن میں سے پہلا بند یہ ہے ؎

اے خوشا صلِّ علیٰ اکبرِ غازی کا شباب
جس کی پرچھائیاں دیں خوابِ زلیخا کا جواب
مہِ یثرب، مہِ کنعاں سے زیادہ شاداب
اللہ اللہ وہ کِھلتے ہوئے عارض کے گلاب

کیا تعجب کہ شفق اور شہابی ہوگی
دُھوپ بھی پرتوِ عارض سے گلابی ہوگی

اِس بند کے دوسرے مصرعے میں خوابِ زلیخا کو اُنھوں نے جس طرح ادا کیا وہ بھی اُن کی ایسی جدّت تھی جس سے پوری مجلس بے کل ہوگئی۔ پھر ٹیپ میں بھی شفق کا اور شہابی ہوجانا اور دُھوپ کا عارض کے پرتَو سے گلابی بن جانا نزاکت بیانی کی بڑی لطیف مثال ہے۔ یہاں مرثیہ رنگِ تغزّل سے معمور ہوگیا اور احساسی SENSUOUS تاثرات کا ایک ایسا میدان کھلا کہ تمام مجلس ایک عالمِ کیف میں ڈوب گئی۔ حضرت علی اکبرؑ ہم شبیہہِ پیغمبرؐ تھے اور اس بارے میں بھی صفدر صاحب نے کئی زوردار بند پڑھے مگر اُن کا خاص حصّہ وہ بند ٹھہرے جن میں اُنھوں نے موصوف کی شجاعت کا ذکر کیا۔ ایک نہایت خاص پہلو اس سلسلے میں اُنھوں نے یہ نکالا ہے کہ حضرتِ علی اکبرؑ کو گہوارے ہی سے شجاع دکھایا ہے۔ اس پہلو میں وہ لطافت ہے جس کی طرف کسی مرثیہ نگار کا دھیان نہیں گیا تھا۔ اُنیسویں بند میں "ہمکے" کی ردیف کے ساتھ بچپن میں شجاعت کے نشانات کا عجیب نفسیاتی عالم سامنے آتا ہے ؎

ماہِ نو کو کبھی تلوار سمجھ کر ہمکے
ہمکے یوں جیسے علیؑ دیکھ کے اژدر ہمکے
سُن کے آوازِ اذاں جھولے میں اکثر ہمکے
جب بھی عباسؑ قریب آئے تو اکبرؑ ہمکے

کیوں نہ بچپن سے شجاعت کا اُسے پیار ملے
شہسواری کو جسے دوشِ ملمدّار ملے

اِس ٹکڑے کو اَدا کرنے میں بھی صفدر صاحب نے کمالِ مرثیہ خوانی دکھایا اور تمام مجلس پر ایک عجیب عالم طاری ہوگیا۔

اِس کے بعد یہ مرثیہ اُس زمانے کے سیاسی حالات کا جائزہ لیتا ہے۔ یہ حصّہ زیادہ تر بیانیہ اور صاف زبان میں ہے۔ صفدر صاحب بھی اِسے قصّہ گوئی کی روانی کے ساتھ پڑھتے گئے۔ اِسی حِصّے میں یزید کا ذِکر مزاحیہ انداز میں یُوں آیا ہے ؎

یہی دن تھے کہ ہوا تخت نشیں اِک جاہل
شوقِ لذّت میں اوَامر تھے نواہی جس کو
باپ وِرثے میں عطا کر گیا شاہی جس کو

امام حسینؑ کا عزم، پھر سفر اور اُس کے مصائب، کربلا میں پہنچنا اور صبحِ عاشور کا آجانا یہ سب باتیں مرثیہ کی خاص شان سے الگ ہو کر ایک قسم کی تسکین RELIEF دیتی ہیں۔ صفدر صاحب اس حصّے سے روانی کے ساتھ گزر گئے۔ اور پھر مرثیہ گوئی کا مخصوص رنگ حضرتِ علی اکبرؑ کی اذان کے ساتھ آیا جس کا بیان اس بند میں ہوا تھا ؎

بارک اللہ وہ اکبرؑ کی اذان کی تاثیر
تھم گیا وقت سرِ راہ مثالِ رہگیر
عرش تک دونوں جہاں چُپ تھے بہ کیفِ تکبیر
بن گیا عالمِ آواز جہانِ تصویر
سر بسجدہ ہوئی ہر شاخِ شجر جُھک جُھک کر
نفسِ سرد بھرا بادِ صَبا نے رُک کر

اِس کے بعد حضرتِ امام علیہ السّلام کا اپنی فوج لے کر بڑھنا دکھایا گیا ہے۔ اِس سلسلے میں حسبِ ذیل بند کی تخئیل بالکل نئی ہے اور فلسفیانہ اشاریت کی حامل ہے۔

نصرتِ حق کے لئے دیں کا شہنشاہ چلا
مطمئن نفس سُوئے لشکرِ گمراہ چلا
گرد و پیش اپنے ستاروں کو لئے ماہ چلا
ختم حجّت کے لئے ابنِ یداللہ چلا

چڑھ کے ناقے پہ دیا خطبۂ عالی شہ نے
کی سرِ معرکہ تقریرِ مثالی شہ نے

اِس کے بعد سے یہ مرثیہ حضرتِ علی اکبرؑ کے لئے مخصوص ہو جاتا ہے۔ حضرتِ علی اکبرؑ کی حضرتِ زینبؑ سے رُخصت کے سلسلے میں پُرانی بزم نگاری کی مثال سامنے آتی ہے۔ مگر جدید شاعر کی طرح صفدؔر صاحب اُس جذباتیتِ محض سے فوراً ہٹ جاتے ہیں جو ہمارے پُرانے مرثیوں میں کثرت سے ہوتی تھی اور جس کی بنا پر میرانیس کو بین نگاری میں معروف گِنا جاتا تھا۔ حسبِ ذیل بند کا تیسرا مصرع رُخصت کو جذباتی عمل کی بجائے ایک اہم ایثار بنا دیتا ہے اور یہ تاثر آٹھ بندوں میں جاری رہتا ہے۔ ع

پا کے رُخصت کا اشارہ جو ہوا دِل بے چین

اِس حصّے کا لکھ دینا اتنا مشکل نہ تھا جتنا کہ اس کو ایک ایسے مرثیہ کا جزو بنانا جس کا اثر بہر حال مُبکی ہو۔ مرثیہ خوان کی حیثیت سے یہ مقام صفدر صاحب کے لئے بڑا مشکل تھا۔ ایک طرف رقّت طاری کرانا لازمی تھا اور دوسری طرف ایثار سے وابستہ فخر کو بھی نمایاں کرنا ضروری تھا مگر اس سلسلے میں انھوں نے ایسے ایسے

اشاروں سے کام لیا کہ مجلس رو بھی دیتی اور پھر سنبھل بھی جاتی تھی مثلاً رسول صلعم کی آواز کے سلسلے میں اِس بیت کو اُنھوں نے اِس طرح اَدا کیا کہ عجیب پیچیدہ (COMPLEX) جذبے کی صورت پیدا ہوگئی ؂

تازہ پھر حادثۂ ارضِ منا کرنا ہے
قرض اُس کا ترے بھائی کو اَدا کرنا ہے

اَور پھر حضرتِ زینبؑ کے اِن الفاظ پر وہ پیچیدہ جذبہ ایک تسکین کے عالم میں پہنچ جاتا ہے ؂

خیر مَیں خوش ہوں رہِ حق میں ہوں اکبرؑ بھی نثار
اَور اکبرؑ تو جواں ہیں علی اصغرؑ بھی نثار
امتحاں ہے ابھی باقی تو برادر بھی نثار
میرا مقنع بھی نثار اور مری چادر بھی نثار

صابرہ اب بھی ہے دو روز کی پیاسی نانا
آپ کے دین پہ صدقے یہ نواسی نانا

یہ مقام مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی دونوں لحاظ سے بہت مشکل تھا اور اس پر سے کامیابی سے گزرنے میں مَیں صفدر صاحب کا سب سے بڑا کمال سمجھتا ہوں۔

صفدر صاحب مرثیہ خوانی کی قدرتی صلاحیت ضرور رکھتے ہیں۔ کچھ اشارے بھی ضرور ایسے ہیں جو مرثیہ خوان برابر کرتے آئے ہیں اور صفدر صاحب نے اُن کو دیکھ کر سیکھ لیا ہے مگر خاص بات اُن کی مرثیہ خوانی میں یہ ہے کہ اُن کا کوئی اشارہ سیکھا ہوا یا روائتی نہیں معلوم ہوتا۔ محسوس ہوتا ہے کہ پیدائشی اَداکار کا محرک اُن کے اندر کام کر رہا ہے اور وہ قدرتی طور پر وہ حرکات اپنی چشم و ابرو اور ہاتھوں کے اشاروں سے ادا کر دیتے ہیں جو مرثیہ میں شاعرانہ انداز سے بیان ہوتے ہیں۔ یہ کمال

اُنھوں نے مرثیہ کے رزمیہ حصّے کو پڑھنے میں خاص طور سے دکھایا۔گھوڑے کی تعریف کے سلسلے میں جب یہ بیت آئی ؎

بدلی گھوڑے نے کنوتی کہ چڑھیں رَن پہ چڑھیں
مگر اکبرؑ مُتامل کہ وہ بڑھ لیں تو بڑھیں

دو انگلیوں سے گھوڑے کی کنوتی کی حرکت دکھانا بہت ہی پُر اثر تھا۔حضرتِ علی اکبرؑ کا رجز اُنھوں نے اِس طرح پڑھا جیسے وہ اسٹیج پر وہی پارٹ ادا کر رہے ہوں جو مصرعوں میں بیان ہوا تھا۔خاص طور پر اِس بند میں:

دیکھو اِس تیغ میں ہیں تیغِ علیؑ کے جوہر

پہلے مصرعے میں تیغ کی طرف اشارہ ہاتھ سے ہوا مگر دوسرے مصرعے میں والیِ شام کا ذکر چہرے پر ایک خاص تبدیلی لے آیا اور پھر ٹیپ میں جوانیِ پیغمبرؐ کو پورے جسم کے ایک خاص تناؤ سے ادا کیا گیا۔اس کے بعد کے بندوں میں بھی اداکاری کا خاص رنگ زیادہ تر ٹیپوں ہی میں نمایاں ہوا۔مثلاً اس بیت کو ؎

شان اِس آنکھ میں جچتی ہی نہیں شاہوں کی
شیر بھبکی میں نہیں آتے ہیں رُوباہوں کی

آنکھوں کے تیور اور آواز کے لہجے سے اس طرح ادا کیا کہ سچ مچ معلوم ہوا کوئی غازی اپنی شجاعت پر فخر کر رہا ہے۔تمام رزمیہ بندوں میں ایک عجیب خصوصیت یہ تھی کہ اُن کی ٹیپ حالانکہ چاروں مصرعوں کے ربط سے نکلتی تھی پھر بھی ایک نیا سماں سامنے لاکر چونکا دیتی تھی مثلاً اس بند میں:

اِن صفوں میں جو فرس کو ابھی گرما کے پھروں

کا آخری مصرعہ

آنکھ کھُلتے ہی جہنّم نظر آئے تم کو

بڑا ہی معنی خیز تھا اور اُس نے پُوری مجلس کو ایک نئے طریقے سے چونکا دیا۔ اِسی طرح تلوار کے سِلسلے میں یہ لطیف بیت ؎

لیلیٰ صاعقہ خُو صاعقہ بار آتی ہے
پھُول زخموں کے برستے ہیں بہار آتی ہے

بہت ہی زیادہ چونکا دینے والی تھی اور اس پر مجلس نے بڑی تعریف کی۔

گھوڑے اور تلوار کی تعریف میں اس مرثیہ میں روایتی مرثیوں کی طرح کافی بند ہیں۔ اِن میں صفدر صاحب نے اپنی طبع اور مشق کے خاص جوہر دکھائے ہیں۔ اس لئے بہت سے مصرعوں پر شُبہ ہوتا ہے کہ یہ میر انیس کے ہیں۔ جنگ کے میدان میں گھوڑے کی رفتار کا سماں خاص طور پر توجّہ کے قابل ہے۔ اِس کا مثالی بند یہ ہے ؎

جلوۂ برق عقابِ علی اکبرؑ پہ نثار
دامنِ زیں کو نہ چھُو سکتا تھا میداں کا غبار
انکھڑیاں سُرخ کہ مستانہ رَوی کا تھا خمار
قلبِ لشکر میں گھُسا توڑ کے آہن کا حصار
پسرِ سعد کے خیمے پہ کئی بار گیا
بحرِ فولاد میں اِس پار سے اُس پار گیا

مگر اس بند کے بعد رنگِ رزم طنز میں بدل جاتا ہے اور اس کو صفدر صاحب نے ایسے ادا کیا کہ مجلس ہنس دی ؎

سب سے پہلے جو نشاں کھولے تھے کالے بھاگے
سپریں پھینک کے سرتن پہ سنبھالے بھاگے
مَیسرہ ٹوٹ گیا، میمنے والے بھاگے
یہ صَفْ اُکھڑی وہ صفْ اُکھڑی وہ رسالے بھاگے

اب بناتے رہیں افسانہ فسانے والے
پیٹھ دکھلا ہی گئے پیٹھ دِکھانے والے

یہ تاثر مرثیے میں لانا جو مخصوص طور پر مبکی صنف ہے بڑا مشکل کام تھا مگر صفدر صاحب نے اس کو ایسے اظہار EXPRESSION سے پڑھا کہ اُس قسم کی ہنسی آئی جو کسی کو روتے روتے آجاتی ہے۔ طنز کی چوٹ اپنے پورے زور سے اس کے بعد کے بند کی ٹیپ میں آئی ہے ؎

دُور از حال یہ عادت ہی نہیں تھی اُن میں
استقامت کی روایت ہی نہیں تھی اُن میں

اس کے برخلاف محمدؐ کے گھرانے کا دستور ذیل کے بند میں پیش ہوا ؎

بے جھجک چھاؤں میں تیغوں کی دَر آنا بھی وہی
زَد پہ جو ہو اُسے ہنس ہنس کے رُلانا بھی وہی
جھُومنا بھی وہی ہونٹوں کو چبانا بھی وہی
کوئی مانگے جو اَماں مُنہ کو پھِرانا بھی وہی
بھاگتی فوج کا پیچھا کبھی منظور نہ تھا
کہ یہ مردانِ اولوالعزم کا دستور نہ تھا

اس سے دونوں طرف کے جنگ آزماؤں کے کردار کا تضاد سامنے آگیا۔

رزم کا خاتمہ بہت قدرتی طور پر مخالفین کے امان مانگنے سے کیا گیا ہے۔ ایک جَری کا فوجوں کو کاٹتے ہوئے ایک دم شہید ہو جانا تمام مرثیہ نگاروں کے لئے ایک ایسا مسئلہ تھا جس کی بناء پر وہ غیر واقعاتی اور غیر نفسیاتی ہونے سے نہ بچ سکے۔ مگر یہاں ایک مبدۂ فیضِ خدا کا اپنی فیاّضی میں آکر ہاتھ روک لینا نہایت قُدرتی اَمر معلوم ہوتا ہے۔

فوج اماں مانگتی ہو جب تو کریں کیا اکبرؑ
بیچ لشکر میں رُکے، روک کے گھوڑا اکبرؑ
چار سُو فوج کے دَل اور تنِ تنہا اکبرؑ
جھُوم کر کھانے لگے نیزے پہ نیزہ اکبرؑ

آخری حصّہ مصائب کا ہے مگر یہاں وہ جذباتیت نہیں ہے جو پُرانے مرثیہ نگار مصائب کے بیان میں لاکر مجلس میں بین ڈلوا دیتے تھے۔ یہاں غم کا اثر ضرور قائم ہوا ہے مگر عزم کے ساتھ۔ چنانچہ علی اکبرؑ کی شہادت کی خبر پاکر امام علیہ السلام سجدۂ شکر میں جُھک کر فرماتے ہیں ؎

عرض کی تجھ سے خجل سبطِ محمدؐ نہ ہوا
شُکر صد شُکر کہ ہدیہ یہ مرا رَد نہ ہوا

نمازِ مغرب کا وقت چونکہ قریب آگیا تھا اس لئے صفدر صاحب کو کچھ بند چھوڑنا پڑے مگر دو بند پڑھ دینا ضروری تھے کیونکہ وہ پورے مرثیے کے موضوع کو بڑی لطافت سے سمیٹے تھے۔ آخری بند میں وہ موضوعِ تہذیب جس سے مرثیہ شروع ہوا تھا اور جس کی مثال حضرتِ علی اکبرؑ، حضرتِ زینبؑ اور امام حسینؑ کی تمام باتوں سے ملی تھی اس طرح انجام پذیر ہوتا ہے ؎

لاشِ فرزندِ جواں مرگ اُٹھائے تھے حسینؑ
چاند کو اپنے کلیجے سے لگائے تھے حسینؑ
خون کو غازۂ رُخسار بنائے تھے حسینؑ
رُوحِ تہذیب کو پروان چڑھائے تھے حسینؑ

عزم انساں کی وہ حد تھی کہ مَلک حیراں تھے
زیرِ پا سیکڑوں طوفانِ بلا لرزاں تھے

کراچی میں ڈاکٹر صفدر حسین کی مرثیہ گوئی کی یہ دوسری اور مرثیہ خوانی کی چوتھی کوشش تھی۔ اِن تمام کوششوں میں اُن کا خلوص نمایاں ہوا اور اسی کی بنا پر وہ کامیاب ہوکر وہ رنگ جما گئے کہ مرثیہ نگار اور اَدا شناس دونوں عش عش کرتے ہوئے گئے۔ مگر یہ بات بھی صحیح ہے کہ اس بار وہ فنکارانہ حیثیت سے پہلے کے مقابلے میں کہیں آگے نظر آئے تھے۔ مرثیہ کی شاعری اور خوانندگی کے طرز دونوں میں فکر اور مشق کا اثر نمایاں تھا۔ تشبیہ و استعارات میں بھی زیادہ گہرا اثر نکھرا اور زیادہ تر مجلس کے لوگ یہی کہتے ہوئے پائے گئے کہ اِن کا رنگ جم ہی نہیں گیا بلکہ پختہ ہوگیا ہے۔ مرثیہ خوانی کے سلسلے میں بھی قُدرتی جذبے کے ساتھ ساتھ ایک اطمینان اور ایک خود اعتمادی ہر لمحہ جاری وساری نظر آئی۔ اور آواز کا زور اس طرح برابر قائم رہا کہ جب کچھ لوگوں نے کہا کہ "آپ تھک گئے ہوں گے" تو صفدر صاحب نے جواب دیا کہ "میں اُن اسلاف کی اَولاد ہوں جو کبھی تھکتے نہ تھے"۔ اَور اِس جواب سے اُن کی آج کی مجلس اور اِس مرثیہ کی نہ صرف اہمیت قائم ہوئی بلکہ اُمید کی کرن بھی دکھائی دی کہ وہ ہر سال مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی کے میدان میں بلا تھکے چلتے جائیں گے اور ہماری تہذیب کی اِس روایت کو جو نثری واعظوں کی مقبولیت سے پس پشت پڑ گئی تھی پھر سے زندہ کرکے وہ مقام دیں گے جس سے مرثیہ نگاری کا ایک نیا دَور شروع ہوجائے گا۔

روزنامہ ڈان (انگریزی) کراچی
۱۶ر جولائی ۱۹۶۵ء

# مرثیہ میں نیا رُجحان

اتوار کے دِن حسینیۂ رضویہ کالونی میں کئی ہزار شائقینِ شعروسخن کا مجمع تھا جب ڈاکٹر سید صفدر حسین نے مُحرّم کی تقریبات کے سلسلہ میں اس سال کی مرثیہ خوانی کا اِہتمام اپنا تصنیف شدہ مرثیہ "جلوۂ تہذیب" سُناکر کیا۔

مخصوص شعراء نے جن میں حضرتِ جوشؔ ملیح آبادی، نسیمؔ امروہوی اور زیباؔ ردولوی کے علاوہ بعض دوسرے شاعر بھی موجود تھے اس مرثیہ کی عظیم تمثال کاری اور غائر فلسفیانہ مضامین کی بڑی ستائش کی ہے۔ مرثیہ نگاری کے فن میں ایک ممتاز تخلیق کی حیثیت سے اِس تصنیف کا بڑا خیر مقدم ہوا ہے۔

امام حسینؑ، اُن کے افرادِ خاندان اور اُن کے وفاداروں کی مختصر جماعت نے تاریخ کی ایک یادگار جنگ میں حق و ناحق کے مابین ہوئی اپنی جانیں قربان کیں۔ مراثی میں اُنہیں مصائب اور قربانیوں کا تذکرہ ہوتا ہے۔ یہ مرثیے جہاں مُحرّم کی تقریبات کا ایک حصّہ ہوتے ہیں وہیں یہ اُردو شاعری کی ایک روایت کی حیثیت بھی رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر صفدر حسین نے مرثیہ کی کلاسکی روایت میں زمانۂ حال کی شاعری کی جدید ترین خصوصیات شامل کردی ہیں۔

پروفیسر حامد حسن سید۔ ایم اے

# مرثیہ۔ کربلا اور صفدر حسین

کسی پیارے کے غم میں رنج و اَلم کا اظہار اِنسانی طبیعت کا خاصہ ہے۔ اِسی لئے اِبتدا، سے کلام عرب میں مرثیہ کو جگہ ملی۔

علی ابن ابی طالب علیہ السلام نے حضور نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مرثیہ کہا۔

"آپ کی موت سے تاریکی چھاگئی۔ دن سیاہ ہوئے۔ راتوں کی سیاہی بڑھ گئی مُسلمانوں پر ایسی اُفتاد پڑی جیسے پتھر میں شگاف جسے ملانا ممکن نہیں۔ بلالؓ ہر نماز کے لئے آپ کو بُلاتا ہے اور آپ کے نام پر دوسرے چلے آتے ہیں۔"

حسانؓ بن ثابت انصاری نے فرمایا:۔

"تم میری آنکھیں تھے تمہارے مرنے سے میری آنکھیں اندھی ہوگئیں۔ اب کوئی مرے یا جیے مجھے ڈر نہیں۔ مجھے تو تمہارے مرنے کا ڈر تھا۔"

ہاشم۔ عبدالمطلب۔ ابو طالب۔ حمزہ و جعفر طیّار کے مراثی مؤرخ ابن ہشام نے نقل کئے ہیں۔

مرثیہ، واقعۂ کربلا کے بعد حسینؓ ابن علی علیہ السلام اور اہلِ بیت اطہار کے

مصائب سے خاص ہوگیا۔ ذاتی دُکھ درد کے اظہار میں مرثیے کہے گئے ہیں۔ ابو تمام کے دیوان حماسہ کا باب المراثی اسی پر ہے۔ اِن میں انتخاب متمم بن نویرہ کا مرثیہ اپنے بھائی مالک کی وفات پر ہے۔

فارسی میں عنصری نے محمود غزنوی کا مرثیہ انشا کیا۔ حافظ و جامی نے بیٹوں کے مرثیے کہے۔ جامی لکھتے ہیں:

نو بہار آمدہ گلہا ہمہ رستند زِ خاک

تو ہم از خاک برآ اے گُلِ خندانِ پدر

اُردو ادب میں احسن و غالب نے پیاروں کی وفات پر گہرے رنج و الم کا اظہار کیا ہے۔ غالب کا مرثیہ بڑا پُر درد ہے:

تُم ماہِ شبِ چار دہم تھے مرے گھر کے

پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشہ کوئی دن اور

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے

کیا خوب! قیامت کا ہے گویا کوئی دِن اَور

بایں ہمہ مرثیہ کی فنّی تعریف میں صاحبِ آئینہ البلاغت نے درست لکھا ہے:۔

"مرثیہ وہ صنفِ سخن ہے جو حضرتِ امام حسینؑ اور دیگر شہدائے کربلا کی شہادت اور اُن پر رنج و الم ظاہر کرنے کے لئے مخصوص ہو"

مرثیہ کے ہمراہ تعزیہ، عَلَم، ذوالجناح، نیاز، شربت، روحِ کیوڑہ، گلاب، موتیے کے پھول بھی آتے ہیں جو خون میں بس گئے ہیں اور سانسوں میں جن کی خوشبو آتی ہے اور سوز خوانی اور ــــ سینہ زنی۔ زائدہ، امام علیؑ ابن الحسینؑ شہید سے روایت کرتے ہیں کہ آپ سے جناب زینب علیا نے فرمایا۔

"اس اُمّت کے کچھ لوگ ہیں جن کو اسی اُمّت کے فرعون نہیں پہچانتے

مگر آسمانوں پر وہ پہچانے جاتے ہیں جو ان بکھیلے ہوئے خون آلود اعضاء کو جمع کر کے دفن کریں گے اور قبر کا نشان بنا دیں گے جو کبھی نہیں مٹے گا۔"

حسینؑ ابنِ علیؑ سید الشہدا کا نشانِ قبر قائم و دائم ہے۔ عزاداری قائم و دائم ہے اور حسینؑ شہید کا پُرسہ دینے والے بھی ہمیشہ رہے ہیں اور رہیں گے۔

دُعبلِ خزاعی، عباسی دَور کے شاعرِ اہلِ بیت نے بیٹی کی موت پر مرثیہ کہا جس میں شہادتِ حسینؑ ابنِ علی علیہ السلام اور وفاتِ جنابِ امام علی رضاؑ کا ذکر ہے اور کہا:

"میں نے پارۂ جگر کو دفن کر دیا اور اگر نبیؐ و آلِ علیؑ پر نہ روتا تو آنکھوں سے ضرور خون کے دریا بہہ نکلتے۔"

دعبلِ خزاعی نے دلِ بے تاب کی تسکین کا جو نسخہ تجویز کیا ہے آج بھی اُتنا ہی مؤثر ہے۔ کسی کے ماں باپ۔ بھائی بہن۔ بیٹا بیٹی چھوٹ جائیں تو سفینۂ غم دل کو کنارے پر لے آنے کی بس ایک سبیل ہے کہ اپنے دُکھ دَرد کربلا والوں کی مصیبت میں گم کر دیں اور سوچ کے زینوں سے یوں اُترتے جائیں ؎

عالم میں جو تھے فیض کے دریا وہ کہاں ہیں؟
جو نورِ خدا سے ہوئے پیدا وہ کہاں ہیں؟
تھے ہم سے بہت افضل و اعلیٰ وہ کہاں ہیں!
پیدا ہوئی جن کے لئے دنیا وہ کہاں ہیں؟

جو زندہ ہے وہ موت کی تکلیف سہے گا
جب احمدِ مُرسلؐ نہ رہے کون رہے گا

عزاداری کی ضرورت کے پیشِ نظر ہی میر انیس اعلیٰ اللہ مقامہٗ نے فرمایا:

اے مومنو! مصروف رہو یادِ خدا میں
جینے کا بھروسہ نہیں اِس دارِ فنا میں

اوقات کرو صرف عزائے شُہدا میں
سرگرم رہو نالہ و فریاد و بُکا میں
غافل نہ ہو بِل جائے جو وقفہ کوئی دم کا
نزدیک ہے دُنیا سے سفر مُلکِ عدم کا

نئی روشنی والے (دَبی زبان سے) مراثی میں بیان کردہ واقعات سے حُسنِ ظن نہیں رکھتے۔ واقعاتِ کربلا کے منثور و منظوم نویسوں کی تاہم ایک مسلسل زنجیر ہے جس کی ہر ایک کڑی قابلِ اعتبار ہے۔

شریکۃ الحسینؑ حضرتِ زینبؑ بنتِ فاطمۃُ الزہراؑ نے کربلا کے جہاد کو کُوفہ کے بازار اور شام کے دربار میں باللّسان جاری رکھا۔ بشیر بن خزیم الاسدی کہتا ہے:

"بازارِ کوفہ میں اُس دن میں نے حضرتِ زینبؑ کو دیکھا اور پھر کسی کو دُنیا میں فصیح نہ پایا۔ آپ گویا زبانِ امیر المومنین علیؑ ابنِ ابی طالبؑ سے باتیں کرتی تھیں۔"

عقبہ بن سمعان، حضرتِ رباب، حرمِ محترمِ حسین الشہیدؑ کے مولیٰ تھے۔ ابنِ شہر آشوب، شیخ طوسی اور طبری انہیں اصحابِ امام علیہ السلام میں شمار کرتے ہیں جو کربلا میں موجود تھے مگر شریکِ شُہدا نہیں ہو سکے۔ عقبہ بن سمعان نے جابجا واقعاتِ کربلا بیان فرمائے۔ حضرتِ عقبہ سے حارث بن کعب وہبی نے سُنا جن سے ابو مخنف لوط ازدی نے روایت کی جن کے راوی ہشام ہیں اور ہشام سے مُورّخ ابو جعفر بن جریر الطبری روایت کرتے ہیں۔

صاحبِ کتابِ آغانی کہتے ہیں:

"شعرائے عرب عام طور پر مرثیہ انشا کرنے میں احتیاط کرتے تھے کیونکہ بنی اُمیہ کا خوف تھا۔"

تاہم مراثیِ حسینِؑ مظلوم کہے گئے۔ ابنِ شہر آشوب، مقتل الحسینؑ میں عقبہ بن عمیق

کو پہلا شاعرِ اہلِ بیتؑ بتلاتے ہیں۔ ابنِ قتیبہ نے سلیمان بن قتہ کو یہ سعادت دی ہے۔ ابوالاسودؓ صحابی ابن سکیت اور کثیر نے مراثی کہے۔ کمیت اور فرزدق "ہاشمیات" کی وجہ سے بھی مشہور تھے۔

دعبلِ خزاعی، عباسی دَور کے شاعرِ اہلِ بیتؑ تھے۔ صفوی دَور میں وعظ کا رواج بھی ہوا۔ شیخ مفیدؒ اور شیخ صدوقؒ اسنادِ صحیح کے ساتھ فضائل و مصائبِ اہلبیتؑ اطہار میں روایات بیان فرماتے تھے۔ علامہ مجلسی نے کئی جلدوں میں بحار الانوار اور ملا حسین واعظ نے کتاب روضۃ الشہدا مرتب کی۔ محتشم کاشی نے مرثیہ گوئی میں نام پایا۔

اُردو ادب کے پہلے صاحبِ کلیات سلطان محمد قلی قطب شاہ نے نوحہ و سلام کی طرز پر مرثیہ لکھا جس کے بعد (رفتہ رفتہ) مرثیہ میں چار مصرع، مخمس اور مسدس کا رواج ہوا۔ وجہی، غواصی، لطیف، افضل، شاہی، کاظم وغیرہ نے مرثیے لکھے۔ ولی دہلوری نے واقعاتِ کربلا میں مثنوی لکھی۔

شمالی ہندوستان میں مرثیہ کا یہی چلن مسکین اور میر سودا نے اپنایا جو اورنگ زیب کے شیعی وزیر نعمت خان عالی کے نواسے تھے۔ میر تقی میر نے بھی مراثی لکھے ہیں۔

نواب وزیروں کے عہد میں حسینی سوگواروں کی کمی نہ رہی۔ ضمیر، دلگیر، فصیح، خلیق، انیس، دبیر، مونس، جلیس، اوج، مرزا محمد طاہر رفیع، رشید، عارف اور دولہا صاحب عروج نے بڑا نام پایا۔

اور حال میں مہاراجہ محمود آباد، جوش ملیح آبادی اور جناب آلِ رضا نے۔

ابنِ شبیب امام علی الرضاؑ سے روایت کرتے ہیں:

"اگر تو چاہے کہ تجھے ثواب ملے جو انصارِ حسینؑ کو دیا جائے گا تو جب حضرت کو یاد کرے تو کہہ یالیتنی کنت معھم فتا فوزاً فوزاً عظیماً

تاروں کی اسی بارات میں جو امام علیہ السلام اور شہدائے کربلا کے ساتھ شریکِ ثواب ہے جناب صفدر حسین بلند مقام پر فائز ہیں۔

ابی مخنف بن لوط ازدی لکھتے ہیں کہ حسینؑ شہید نے فرمایا۔

"میں گزر ہی جاؤں گا اور موت آدمی کے لئے کوئی عیب نہیں جس وقت وہ حق کا ساتھ دے مسلمان رہ کر جہاد کرے۔ جان دے کر نیک کی غم خواری کرے۔ ظالم سے جُدا رہے، گنہ گار کو چھوڑ دے"

واقعۂ کربلا کا یہی مقصد اور یہی اوّلین تفسیر تھی۔

کوفہ و شام میں حضرت علیؑ ابن الحسینؑ شہید اور حضرتِ زینب علیا نے مصائبِ اہلِ بیتؑ بیان فرمائے۔ کثیرؔ، ابوذہیلؔ اور کمیتؔ نے مراثی میں ان مصائب کا ذکر کیا پھر جعفر بن عفانؔ، دعبلِ خزاعی اور ابراہیم نے یہ سب اموی اور عباسی حکومتوں کے باوصف ہوا تھا۔ اس لئے قدرتاً امامِ عالی مقام کی "مظلومیت" ہی بیش از بیش سامنے آسکتی تھی۔ واقعۂ کربلا کی یہ دوسری تفسیر تھی۔

شیخ مفیدؒ، شیخ صدوقؒ، اور طوسیؒ۔ اور فارسی مرثیہ گو بھی حسینؑ ابنِ علی علیہ السلام کے لئے آنسوؤں کے خراج میں کوشاں رہے۔ ابنِ شبیب، امام علی الرضاؑ سے روایت کرتے ہیں:

"اگر تو حسینؑ پر روئے تا اینکہ آنسو جاری ہو جائیں تو خدا تیری بخشش کا سامان کرے گا۔"

دکن میں مرثیہ کا یہی مقصد پیشِ نظر رہا۔ سانحہ کربلا میں تاہم بقائے اسلام کا راز بھی دریافت ہوا تھا۔

سر داد نہ داد دست در دستِ یزید
حقا کہ بنائے لا الٰہ است حسینؑ

شمالی ہندوستان میں مرثیہ گو شعراء نے یہ ساری تعبیریں اور تفسیریں اپنے دامن میں سمیٹ لیں اور ان کے سوا کربلا میں دو متحارب طاقتوں کی کشمکش کا مدھم سا خیال ہی بیان کیا۔

غیرت کی ہے جا نام بزرگوں کے بڑے ہیں
یاں شمر و عمر، واں شہِ مظلوم کھڑے ہیں

مرثیہ میں مسئلۂ شفاعت کو بھی معین صورت میں پیش کیا گیا جس کی وجہ (جدید نفسیات کی روشنی میں) احساسِ گناہ میں کسی پناہ کی تلاش ہو سکتی ہے۔

بتولؑ نکلی ہیں مرقد سے خاک اُڑانے کو
حسینؑ جاتے ہیں اُمت کے بخشوانے کو

واقعۂ کربلا کی یہی تفسیر حضرتِ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے پیشِ نظر تھی۔

نقشِ الّا اللہ بر صحرا نوشت
سطرِ عنوانِ نجاتِ ما نوشت

۔حضرتِ علامہ تک تاہم مرثیہ میں اور رطب و یابس جمع ہو گیا تھا تبلیغی مرثیہ میں خلافت، فدک، جمل، بیعت، خمس، جہاد جیسے اختلافی مسائل پر شیعی نقطۂ نظر سے بحثیں ہوتی تھیں۔ جن کا انداز کسی حد تک "مناظرانہ" تھا۔ حضرتِ جوش ملیح آبادی کے لئے کربلا کے واقعات "انقلاب سے عبارت ہیں جن میں وہ سُرخ سویرے کا مژدہ سُنتے ہیں اور مرثیہ سے اشتراکی پروپیگنڈہ کی راہ استوار کرتے ہیں۔

جناب صفدر حسین اس کے خلاف نہیں کہ حسین علیہ السلام اور شہدائے کربلا کو آنسوؤں کا خراج دیا جائے مگر آپ نے واقعۂ کربلا کی اپنی تعبیر و تشریح بھی پیش کی ہے۔ آئینِ وفا کربلا والوں کے حوالے سے جناب صفدر حسین اس طرح پیش کرتے ہیں:۔

بسکہ عاشور کے دن سخت تھی عباسؑ کی پیاس
پھر بھی دریا میں جو اُترے تو رہے جمع حواس
یوں بھری مشک کہ حیراں ہوئے خضرؑ والیاسؑ
خشکیِ آب کو آنے نہ دیا ہاتھ کے پاس
آبرو فرض کو توقیر وفا کو بخشی
تپشِ نَو دلِ اربابِ وِلا کو بخشی

نکلے دریا سے تو خوں اپنا بہاتے نکلے
ریگِ ساحل کو لبِ خشک دکھاتے نکلے
عشق اور فرض کی تقدیر جگاتے نکلے
صبر و ایثار کی تاریخ بناتے نکلے
پیاس اِس طرح سے ٹھکرا دے بھلا پانی کو
موڑ دیتی ہے وفا فطرتِ انسانی کو

مرثیہ کی تاریخ میں یہ نئی آواز ہے۔ زیرِ نظر مرثیہ "جلوۂ تہذیب" میں جناب صفدر حسین اُس عمل کی نشان دہی کرتے ہیں جس سے تہذیب کو صدیوں گزرنا پڑا۔ تہذیب جسے بالآخر میدانِ کربلا میں معراج مل گئی۔ تہذیب کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

نازِ تخلیق یہی رازِ تجلّی بھی یہی
جلوۂ طور یہی آتشِ سینا بھی یہی
سینۂ گوتم و زرتشت کا شعلہ بھی یہی
حسنِ یوسفؑ بھی یہی ہے یدِ بیضا بھی یہی
یہی ناگاہ دلِ کوہِ صفا سے نکلا
مشعلِ نور لئے غارِ حرا سے نکلا

تہذیب کی اِس روایت کو جناب صفدر حسین کربلا سے اس طرح ہم آہنگ کرتے ہیں:

کربلا کیا؟ انہیں آیاتِ درخشاں کی دلیل
ایک صدیوں کی روایات کی ہےتکمیل
جس پہ برپا ہوئی قربانیٔ موعودِ خلیلؑ
علی اکبرؑ تھے یہاں اور وہاں اسماعیلؑ

خونِ کم مایہ اُدھر خون نبی کے بدلے
لاکھ تلواریں اِدھر ایک چھُری کے بدلے

واقعۂ کربلا کی نئی تعبیر جناب صفدر حسین کی مرثیہ میں عظمت اور آزمائش بھی ہے۔ کیمیاگر مختلف اجزار کو آنچ پر ترکیب دے کر نیا مادہ بنالیتا ہے۔ جناب صفدر حسین نے مرثیہ کی روایات، قدیم اجزار کو نئی تعبیرات اور نئے جزو کے ساتھ ایک جان کردیا ہے۔ تازہ لہو سے مرثیہ کا چہرہ دمک اُٹھا ہے۔

جنابِ صفدر حسین، اُن مرثیہ نگاروں سے آگے نکل آئے ہیں جن کا سستا پروپگنڈا بسا اوقات گراں گزرتا ہے۔ اشتراکی پروپگنڈا کے اجزا واقعۂ کربلا کے بیان سے میل کھاتے ہوئے معلوم نہیں ہوتے۔

رہے کِسی کو کسی انقلاب سے نسبت
ہے اس جگہ کو رسالتمآبؐ سے نسبت

اور جن لوگوں نے اپنے مرثیہ میں مروجہ مخصوص اجزا حذف کرکے جا بجا اختلافی مسائل کی بحثوں کو پھیلا دیا ہے، ممکن ہے مذہبی مناظروں کی تاریخ میں اُن کے مراثی کی کوئی جگہ نکل آئے مگر ہمیں ڈر ہے کہ اس کا ماضی نہیں تو مستقبل کیسے ہوسکتا ہے۔

اِختلافی بحثیں بے فائدہ بلکہ مُضر ہیں۔ مگر شیعانِ علیؑ دو حصوں میں رہے ہیں۔ ایک تو وہ جو کسی قیمت پر دوسروں سے صُلح پر آمادہ نہیں۔ دوسرے آزاد خیال جن کے لئے "حُسینیت" کی خدمت کا قرینہ فضائل و معائب کا بیان کرنا ہے۔ جنہیں غیر سُنتے ہیں اور زیادہ نہ سہی کم کم اثر ضرور لیتے ہیں۔ جنابِ صفدر حسین اسی مؤخر الذکر گروہ میں ہیں۔

مطلع، چہرہ، رُخصت، رجز کے اشعار، تلوار، گھوڑے کی تعریف، جنگ، شہادت کے چند در چند بند سے گزرتے ہوئے (مثلاً) انیس اعلی اللہ مقامہ، ایک مرثیہ میں یہاں پہنچتے ہیں۔

سَر پیٹ کے ہاتھوں سے یہ شبیرؑ پکارے
عباسؑ ہمیں چھوڑ کے جنّت کو سدھارے
سَر بھائیؑ کے قدموں سے اُٹھاؤ مرے پیارے
بس ہو چکی تعظیم میں قُربان تمہارے
عباسؑ تری تشنہ دہانی کے تصدّق
عباسؑ تری مرتبہ دانی کے تصدّق

بَین و بُکا کے بند روائتی مرثیہ میں حاصلِ کلام ہیں جن سے مجلس میں کُہرام مچ جاتا تھا۔

جنابِ صفدر حسین روائتی مرثیہ کی منزلوں سے گزرے ہیں۔ زبان آپ کے گھر کی ہے۔ پھر آپ نے الفاظ و فن کی باریکیوں میں ایک عمر بِتادی ہے، آپ تو طویل مشقِ سخن کے پیشِ نظر کہہ بھی سکتے ہیں:۔

پیری میں نکالے گُلِ مضمون جو دہن سے
سب بول اُٹھے پھول جھڑے شاخِ کہن سے

روائتی مراثی میں بطورِ خاص حسینؑ اور انصارِ حسینؑ کے سراپا کے بیان میں مرثیہ گو شعرا داد طلب ہیں:۔

ہم نے کبھی دیکھے نہیں اس طرح کے خوش رُو
میدان میں ہے جلوہ گری نُور کی ہر سُو
چہرے پہ لٹکتے ہیں عجب حُسن سے گیسو
جب ہنستے ہیں تو پھولوں کی آجاتی ہے خوشبو
رُتبہ چمنِ خُلد کا صحرا کو مِلا ہے
دریا کی ترائی میں عجب باغ کِھلا ہے (انیس)

رنگت گُلِ عارض میں ہے جنّت کے چمن کی
خالِ رُخِ روشن میں ہے بُو مشکِ خُتن کی
لالہ کا جگر داغ ہے سُرخی سے دہن کی
فردوس میں جاتی ہے مہک سیبِ ذقن کی
آسیبِ نظر سے اسے کیا خوف خطر ہے
یہ نخلِ گلستانِ محمدؐ کا ثمر ہے (انیس)

کس حُسن سے تابندہ ہے گیسو کا ہر اک تار
ہے سنبلِ پیچاں انہیں حلقوں میں گرفتار
خوشبو سے مہکتی ہے سر پاک پہ دستار
بے جا نہیں پیچیدگیِ گیسوئے خم دار
ہے خاطرِ سرور جو پریشاں کئی شب سے
کاکُل بھی ہے بل کھائے ہوئے جوشِ غضب سے (انیس)

مرثیہ گو شعرائے دبستانِ لکھنؤ کی پابندی میں شعر دغزل کے گُلِ شاداب ڈھیر

کر کے مضامین کی بہاریں لُٹا دی ہیں۔ اس زمانے میں تاہم الماس کے ترشے ہوئے بے جان پیکروں میں ویسی دلچسپی قدرتی طور پر نہیں رہی ہے۔ فن کار، دِل کی دھڑکنیں سُنتا ہے اور زبان میں اظہار کی وسعتوں کے باعث سُن کر سُنانے کے قابل بھی ہوتا ہے۔

فیض احمد فیضؔ (مثلاً) "دو عشق" نظم کی ابتدا کرتے ہیں۔

تازہ ہیں ابھی یاد میں اَے ساقیِ گُلفام
وہ عکسِ رُخِ یار سے لہکے ہوئے ایّام
وہ پُھول سی کِھلتی ہوئی دیدار کی ساعت
وہ دِل سا دھڑکتا ہوا اُمّید کا ہنگام

فیض احمد فیضؔ کی نظم "ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے" سائنسی راز کے چوروں کی سزائے موت پر کہی گئی تھی۔ جذبے کی لطافت اور تاثر کی پچاس سال اُدھر کا شاعر پا نہیں سکتا تھا اور اگر پاتا بھی تو اظہار پر قدرت نہ رکھتا۔

جنابِ صفدر حسینؔ "ہم شکل پیمبرؐ" کے سراپا میں یہ بند بھی لکھتے ہیں:۔

اَے خوشا صلِ علیٰ اکبرؑ غازی کا شباب
جس کی پرچھائیاں دیں خوابِ زلیخا کا جواب
مہِ یثرب، مہِ کنعاں سے زیادہ شاداب
اللہ اللہ وہ کِھلتے ہوئے عارض کے گلاب

کیا تعجب کہ شفق اور شہابی ہوگی
دُھوپ بھی پرتوِ عارض سے گلابی ہوگی

پرچھائیاں، خوابِ زلیخا کا جواب، مہِ یثرب، زیادہ شاداب، شفق شہابی، دُھوپ گلابی۔ بس یوں کہیئے ؎

سُبک ہو گئی تھی ترازوئے شعر  مگر ہم نے پلّہ گراں کر دیا

روائتی مرثیہ کی منزلوں میں تنظیم و ترتیب کا نام و نشان نہیں تھا جس سے مختلف منازل کی اہمیّت کے پیشِ نظر اُن کے بیان میں کمی بیشی ہو سکتی جناب صفدر حسین نے کربلا کا مقصد جلوۂ تہذیب کی صُورت میں دکھلانے کے لئے بھی مرثیہ کی روائتی منزلیں اعتماد کے ساتھ طے کی ہیں مگر آپ کا مقصد صرف شاعرانہ کمال کی نمائش نہیں ہے بلکہ قدم بقدم جلوۂ تہذیب کی جھلکیاں دکھلانا ہے۔ اِس لئے کمالِ فن اور رچاپک وستی کے ساتھ جنابِ صفدر حسین راہِ ثواب طے کرتے جاتے ہیں مگر کہیں آپ کو مقصد فراموش نہیں ہوتا جسے آپ آگے بڑھاتے اور اُجاگر کرتے جاتے ہیں جناب صفدر حسین کا ایک ایک بند بلکہ ایک ایک مصرع اس "ڈرامائی اکائی" کو قائم کرنے میں معاون ہے جس کا تصوّر کسی مرثیہ گو شاعر کو قطعی نہیں تھا حضرتِ علی اکبرؑ کے بچپن کا بیان سنیئے:۔

ماہِ نَو کو کبھی تلوار سمجھ کر جھکے
جھکے یُوں جیسے علیؑ دیکھ کے اژدر جھکے
سُن کے آوازِ اذاں جھولے میں اکثر جھکے
جب بھی عباسؑ قریب آئے تو اکبرؑ جھکے

کیوں نہ بچپن سے شجاعت کا اُسے پیار ملے
شہسواری کو جسے دوشِ علمدار ملے

جنابِ صفدر حسین کا مقصد پیشِ نظر رہے تو مرثیہ کا ہر ایک مقام ایک نئے معنی کا حامل نظر آتا ہے۔

اِس مقصد کے حصول میں جناب صفدر حسین نے "مرثیت" میں بھی ذرا کمی کر دی ہے اور مرثیہ کا مقصد صرف بَین و بُکا قبول نہیں کیا ہے۔ لیکن کربلا کے فلسفیانہ تعمیری پہلو کی طرف توجہ دِلا کر جناب صفدر حسین نے مرثیہ کو گہرائی اور گیرائی دے دی ہے۔ جس سے مرثیہ اس "ایپک" شاعری کے قریب پہنچ گیا ہے جس کا معیار ارسطو نے

متعیّن کیا تھا۔

سب سے سوا یہ کہ جناب صفدر حسین مدّاحِ امیرؑ ابنِ امیرؑ ہیں۔ کربلا اور نجف کے حرم میں آپ نے نئے چراغ جلائے ہیں جن کا صلہ معلوم ہے:

جلتا ہے جو شب کو قبرِ حیدر پہ چراغ
وہ صبح کو آفتاب ہو جاتا ہے

چراغِ حرم اور آفتابِ صبح کی روشنی "آئینِ وفا" اور اب "جلوۂ تہذیب" یعنی جنابِ صفدر حسین کے دو مرثیوں کی صورت میں دُور دُور پھیلی ہے۔

اُس گھر کی کھلی چھت پہ چمکتے ہوئے تارو!
کہتے ہو کبھی بات وہاں جا کے یہاں کی؟

---

ڈاکٹر اسد اریب

# جلوۂ گل دیکھ اسد

"آئینِ وفا" کے بعد شاعرانہ صناعی کا ایک اور نمونہ "جلوۂ تہذیب" کی صورت میں نظر آیا۔ شاعرانہ صناعی میں نے یوں کہا کہ اِن مرثیوں سے پہلے، مرثیے کے چہرے اِس ڈھب کے نہ تھے۔ جس کاوش و آرائشِ فن سے ڈاکٹر صفدر نے اپنے مضامین کو نبھایا ہے قدیم مرثیہ گویوں کی روش سے بالکل جداگانہ ہے۔ میں اُن لوگوں میں ہوں جو مرثیہ کو سب سے مشکل صنفِ سخن جانتے ہیں اور یہ نہیں چاہتے کہ عام آدمی بھی مرثیہ کہے۔ کیوں کہ مرثیہ کی قابلِ فخر روایات کے سامنے مرثیہ کہنا آسان نہیں۔ ڈر یہ رہتا ہے کہ کم سخنوں اور علم کے کوتاہ دستوں کے سبب روایت بجائے آگے بڑھنے کے پیچھے نہ ہٹ جائے۔ ہاں مگر خلاقِ فطرت سے طبیعت کی روانی اور قلم کی جولانی جو کوئی اپنے ساتھ لایا ہے، علم و فن کی نزاکتوں کا آشنا ہے مضمون و مطالب کی دولت سے اُس کا ذہن معمور ہے۔ وہ بے شک اس میدان میں آئے "جلوۂ تہذیب" کو میں نے اُردو مرثیے کی روایت میں ایک اضافے کے طور پر قبول کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں ڈاکٹر صفدر صاحب اُردو مرثیے کے میدان میں ایجادِ معانی اور ایزادِ مطالب کی ایک مستقل علامت بن کے اُبھرے ہیں۔ اُنھوں نے مرثیے کا گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے۔

وہ بخوبی جانتے ہیں کہ ہر دَور کے سامعین کا مزاج مختلف ہوتا ہے۔ تمدنی تہذیبی اور معاشرتی انداز بدلتے نہیں مگر کم وبیش ضرور ہوتے رہتے ہیں "جلوۂ تہذیب" کا سامع اور قاری بیسویں صدی کے اس عرصے کا انسان ہے جو عرصہ ذہنی کشمکش اور فسادِ خلق کے لئے ممتاز ہے۔ اس صدی کی دو عظیم جنگیں اپنے پیچھے تیسری عالمگیر جنگ کے اسباب چھوڑ کر ختم تو ہو گئیں، مگر دنیا کی بیشتر قومیں اب بھی حالتِ جنگ میں ہیں۔ نسلِ انسانی کی بقا کا دارومدار جس تہذیب اور صلح کُل معاشرے پر تھا، انسان اُس کو ترس رہا ہے۔ شاعر کا خیال ہے کہ تہذیب زندگی کی اشد ترین ضرورت ہے اور رُوحِ تہذیب کا سرچشمہ حسینؑ کی ذاتِ گرامی ہے۔ ؎

رُوحِ تہذیب کو پروان چڑھائے تھے حسینؑ

اِس مرثیے میں "تہذیب" تخلیقِ کائنات کے حُسنِ ترتیب کا نام ہے مگر شاعر کے تحت الشعور میں دُنیا کے تمدن کی تہذیب کا عمل بھی کارفرما ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اس تمثالِ لفظی سے قارئین کے ذہن پر وہی معنی اثر انداز ہوں جو اس لفظ سے عمومی طور پر وابستہ ہیں۔ مَیں بڑے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اُردو مرثیہ تو درکنار پوری اُردو شاعری میں مسلسل خیالات والی نظموں میں کہیں بھی اس ڈھب کا چہرہ نہیں ملتا۔

مجھے یہ تسلیم ہے کہ اس مرثیے پر اظہارِ خیال کی یہ طرز تاثراتی ہے اور تاثراتی تنقید میں معیارِ فن کا راستہ روکتی ہیں مگر محاسنِ کلام کا برملا اظہار نہ کرنا بھی تو بخلِ ضمیر ہے، مَیں اس مرثیے کو پڑھتا ہوں، سوچتا ہوں، کیا اب ایسی زبان، اتنی آراستہ بولی، یہ اندازِ سخن کوئی اور بھی لکھے گا؟ کسی اور کا مقدر بھی ہو گا؟ حقائق سامنے ہیں، جواب ملتا ہے: اب ایسا نہیں ہو گا۔ ہو گا تو بمشکل ہو گا۔ کیوں کہ اب وہ زمانہ نہیں رہا۔ علم کے وہ جوہری کہاں ہیں؟ وہ خریدار جو اس جنس کے طلبگار تھے، اُٹھ گئے۔ دادِ سخن کون دے؟ ظاہر ہے کہ تخلیق کا عمل رُک جائے گا۔ لیکن منہ اندھیرے بھی کوئی نہ کوئی چراغ ٹمٹماتا ہی رہتا ہے شیعہ

لندن کی مرکزیت کے خاتمے اور اس تہذیب کے جغرافیائی انتشار کے باوجود ابھی ماحول باقی ہے۔ کچھ نہ کچھ علم دوست، نکتہ شناس، ہنر پرور مل جاتے ہیں۔ مکرّم عالی ڈاکٹر سیّد صفدر حسین ملتانی بھی ایک سال تشریف لائے تھے۔ یہاں اپنے مرثیے پڑھے۔ سُنا ہے گورنمنٹ کالج کے ارباب ادب نے فرمائش کی کہ کالج میں آئیں اور مرثیہ ارشاد فرمائیں۔ میں اُن دنوں یہاں نہیں تھا مگر اب جو یہاں آیا ہوں ہر شخص کو جو ذرا بھی ذی شعور ہے اور صاحب موصوف کے مرثیے سُن چکا ہے، معترف پاتا ہوں۔ ان میں سے بیشتر کی یہ خواہش ہے کہ وہ مجلسیں پھر برپا ہوں۔ اور پھر یہ مرثیے سُنے جائیں...... یہ سب کیا ہے۔ یہ وہی قدردانی اور جوہر شناسی ہے جس سے تخلیق کا ماحول بنتا ہے۔ جو شعری تخلیق کے لئے شاعر کو مہمیز دیتا ہے۔

میں منصب کے اعتبار سے معلّم اور فطرت کے اعتبار سے ناقد ہوں۔ معلّم اور ناقد دونوں ہی سخت گیر ہیں۔ "جلوۂ تہذیب" کو میں نے سب سے پہلے جس ارادے سے پڑھا وہ بخدا مخالفانہ تھا۔ میں ایک ایک مصرعے پر ٹھہرا۔ حرف حرف پر قیام کیا۔ بند کے بند دوبارہ پڑھے۔ ربطِ خیال کو دیکھا۔ گریز کی منزل پر نظر کی۔ بیتوں کو بار بار دہرایا۔ صرف اس خیال سے کہ شاعر پر حرف گیری کر سکوں۔ مگر کوئی تدبیر ایسی ہاتھ نہ آئی۔ جی چاہتا تھا کہ چھبیسویں بند کی معنٹی حالت پر متوجہ ہوؤں۔ اس بند کا مصرعۂ اوّل ہے ؎

پشتِ رہوار پہ یکبارگی جو جھپکی آئی

اِس کے قافیے شاعر نے 'سُنی' 'کی' اور 'علی' یعنی روی کے سِوا ایک قافیہ سے باندھے ہیں۔ یہ عمل مرثیے کے صوتی مزاج سے مطابقت نہیں رکھتا۔ بلکہ "جلوۂ تہذیب" کے معیاری آہنگ سے بھی کسی قدر کم تر ہے۔ تاہم مجھے معلوم ہے کہ بڑے بڑے اُستاد مرثیہ گویوں نے ایسا کیا ہے۔ لیکن جہاں کہیں اور جس کسی کے ہاں ایسا ہے اُس پر اُنگلی ضرور رکھی گئی ہے۔

مجھے کعبۂ لکھنؤ کے کلید بردار میر انیس کی اس بیت کے قافیے پر سخت اعتراض ہے کہ اس میں قافیے کا لحاظ نہیں رکھا۔ اور پہلے مصرعے کے قدم پر قدم رکھ دیا ہے ؎

خواہاں تھے نخلِ گلشنِ زہرا جو آب کے
شبنم نے بھر دیئے تھے کٹورے گلاب کے[1]

میں ڈاکٹر صاحب کی اس بیت کے قافیوں سے بھی صرفِ نظر نہیں کر سکتا کہ اس میں ظاہر اور مظاہر کو مقفّٰی سمجھا گیا ہے[2]

یعنی آراستہ باطن بھی ہو ظاہر کی طرح
سینے روشن ہوں حبیب ابنِ مظاہر کی طرح

---

[1] فاضل مقدمہ نگار نے میری ایک بیت میں "ظاہر" اور "مظاہر" کو ایطا کی ایک صورت قرار دیتے ہوئے میر انیسؔ کی شہرۂ آفاق بیت میں "آب" اور "گلاب" کے قافیوں پر بھی ناآسودگی کا اظہار کیا ہے۔ اس سلسلے میں عرض ہے کہ میر انیسؔ کے مذکورہ بالا قافیوں میں ایطا نہیں ہے کیونکہ "گلاب" کا لفظ گُل + آب سے مل کر بنا ہے۔ جب پہلے مصرع کا قافیہ دوسرے مصرع میں مرکّب کلمے کی صورت میں آئے اور اُس کے معنی ترکیب کے بعد بدل جائیں تو اُس پر ایطا کا اطلاق نہیں ہوتا۔ ظاہر ہے کہ انیسؔ کے دوسرے مصرع گُل بمعنی گُل اور آب بمعنی آب نہیں بلکہ دونوں کلمے مل کر ایک خاص پھول کے معنی دے رہے ہیں۔

[2] "ظاہر" اور "مظاہر" کے قافیوں کی صورت اِس سے مختلف ہے لیکن ان میں بھی نہ ایطائے خفی ہے نہ جلی۔ "ظاہر" اسم فاعل ہے اور "مظاہر" مظہر کی جمع۔ اگرچہ مادّہ دونوں کا ایک ہی ہے یعنی "ظ ہ ر" مگر معانی میں فرق ہے، اوّل الذکر میں "الف" اسم فاعل ہے اور موخر الذکر میں "الف" جمع کے لئے آیا ہے۔ دونوں کے معنی ایک نہیں ہیں۔ علاوہ ازیں "ظاہر" اپنے لغوی معنوں میں استعمال ہوا ہے اور "مظاہر" عَلَم (نام) ہے۔ ایسی صورت میں اصولِ قافیہ کے اعتبار سے ایطا نہیں ہوتا۔ چنانچہ عزیزؔ لکھنوی نے بھی انھیں دونوں قافیوں کو اِس طرح نظم کیا ہے ؎

یوں صاف محبت میں رکھو باطن و ظاہر	ہر فرد بنے تم میں حبیب ابنِ مظاہر

(صحیفۂ ولا صفحہ ۲۹۳)

(صفدر حسین)

اس مرثیے میں ایک اور مصرع ہے ؎

اُمِ لیلیٰ کی جبیں پر نہ شکن تھی نہ عرق

نہ شکن تھی نہ عرق میں ایک فعلِ ناقص کو مؤنث باندھ کر مُذکر اِسم (عرق) سے بھی منسوب کر دیا ہے جو علمی احتیاط کے برخلاف ہے۔

مگر میں سمجھتا ہوں کہ یہ سب وہ باتیں ہیں جو برائے نام ہوتی ہیں، مرثیے کے کمال پر اِن سے کوئی حرف نہیں آتا۔ جب طبیعت کے باطن سے میں نے پردہ اُٹھا دیا ہے تو خوبیوں کے اقرار کا موقع بھی دیجئے۔ "جلوۂ تہذیب" اپنی انفرادیت کے لحاظ سے یوں بھی نیا ہے کہ جنابِ علی اکبرؑ کے حال کے مرثیوں میں اتنی شاعرانہ لطافتوں سے مصائب کی منزل تک یوں خوبیِ اظہار کے ساتھ نہیں پہنچا گیا۔ کسی مرثیے کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ وہ اپنے چہرے سے اپنے موضوع کا پتا دے۔ مگر رمزیہ پیرائے میں لطیف اشاروں اور موزوں کنایوں میں۔ اس مرثیے کے مضامین میں صدق و صفا، ایثار و عطا، پابندیِ احساس، آراستگیِ باطن اور گذرِ منزلِ تسلیم و رضا کی جو باتیں ہیں وہ صاف صاف کہہ رہی ہیں کہ کیا ہونے والا ہے؟ چنانچہ شعور کا یہ خیالی راستہ طے کرتا ہوا ذہن اُس منزل پر پہنچتا ہے جہاں صاف کھُل جاتا ہے کہ یہ مرثیہ حالِ جنابِ علی اکبرؑ میں ہے۔

کِس قدر مرحلۂ صبر و تحمل ہے اَدَق
تا جرہ تک پئے فرزند رہیں محوِ قلق
لیکن ایثار کی تاریخ نے اُلٹا جو ورق
اُمِ لیلیٰ کی جبیں پر نہ شکن تھی نہ عرق

کر لیا حق کے لئے جبر گوارا اُس نے
موت کو سونپ دیا آنکھ کا تارا اُس نے

مرثیہ تمثیلی شاعری DRAMATIC POESY کی صنف میں بھی آتا ہے۔ اس اظہار میں

شاعر کو جن مؤثر ذرائع سے کام لینا پڑتا ہے اُن میں آہنگ کی خوبی بھی ایک ذریعہ ہے۔"جلوۂ تہذیب" میں بحر کی موزونیت کے قرینے قرینے برمحل صوتیات کا مؤثر عمل بھی دکھایا گیا ہے جس کو صرف وہی لوگ بخوبی سمجھ سکتے ہیں جو اس مرثیے کے نظامِ ہیئت سے آشنا ہوں۔ خاص طور پر ماسبق بندوں کو پیشِ نظر رکھ کر ساتویں بند کو پڑھیے تو میرا مُدعا روشن ہو جائے گا۔

اِنہیں آیاتِ منوّر نے اُجالی دُنیا
اِسی پَرتَو کا نتیجہ ہے جمالی دُنیا
چاہتی ہے یہ بہرحال مثالی دُنیا
ہو مصفّیٰ عملی اور خیالی دُنیا

یعنی آراستہ باطن بھی ہو ظاہر کی طرح
سینے روشن ہوں حبیب ابنِ مظاہر کی طرح

اِس مرثیے کی دوسری خوبی جو بے ساختہ اپنی طرف کھینچتی ہے وہ اس کا لسانی پیکر ہے۔ جس میں سر بسر جمال ہی جمال ہے۔ شہزادۂ علی اکبرؑ کے انجام پر پہنچنے کے لئے اس سلیقے سے شاعرانہ تخیّل کا استعمال اتنا آسان نہیں تھا جتنا اس مرثیے کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے۔ شاعر کی نہ معلوم کتنی ریاضتوں کا یہ پھل ہے۔ کیسی کیسی محنتوں کا یہ صلہ ہے۔ مرثیے کی یہ وہ قابلِ فخر اَدا ہے جس نے پوری دنیائے شاعری کو محرومی کا احساس دلایا ہے۔ بہترین سرمایۂ زبان سے، اعلیٰ درجے کے علمی و تاریخی کنایوں سے، پاکیزہ اور لطیف تشبیہوں سے، تخیّلِ شعر کے اس عمل کو مرثیے کا وصفِ امتیاز سمجھنا چاہیئے۔ "جلوۂ تہذیب" اُردو شاعری کے جمالیاتی اسلوب کا نمونہ ہے خاص کر کے اس صورت میں جب مرثیے کا آخر شہادت اور انجام دُبکا ہو۔

یہ اظہار کی سخت ترین راہ ہے۔ اس سے بس وہی گذر سکتے ہیں جو مشقِ سخن کا

تیشہ رکھتے ہوں - اس سفر میں کتنے پیچیدہ موڑ آتے ہیں۔ ٹیپ کی بیتیں شاعر کا کلیجہ نکال لیتی ہیں - اور ان بیتوں کے لئے یہ کڑی شرط بھی ہے کہ مُردّف ہوں۔ حرفِ قافیہ سے قافیئے مزیّن ہوں۔ بند سے بندوابستہ ٹیپ کا شعر چاروں مصرعوں کا حاصل ٹھہرے معنوی اعتبار سے بھی اور صوتی اعتبار سے بھی - اس مرثیے کی بیتیں شاندار خیالات سے معمور ہیں۔ بعض تو ایسی ہیں کہ ضرب المثل بن جائیں گی اور اگر کہیں کسی ذاکر کے ہاتھ آگئیں تو مجلس میں کہرام مچائیں گی - دو چار منزلیں نقل کرتا ہوں ؎

صدقے ہوتا تھا کوئی گرد کوئی پھرتا تھا
پردۂ در کبھی اُٹھتا تھا کبھی گرتا تھا

---

رَن میں کس کس پہ نہ تھا تیغ شرربار کا قرض
گھاٹ ادا کرنے لگا خونِ علمدار کا قرض

---

یہ تگ و دَو تھی کہ فوجوں کا بُرا حال کیا
یادِ قاسم میں سمندوں کو بھی پامال کیا

---

جس کا سُوکھا ہوا میداں میں نہ پانی مانگے
رُونمائی میں جو زخموں کی نشانی مانگے

---

مرثیے کی سماعت میں خاص طور پہ بیتوں کے حُسن کی طرف سامع کا ذہن متوجہ رہتا ہے۔ تمام مسدسوں میں تو نہیں مگر مسدسی مرثیے میں اس خوبی کو ایک فنی تقاضے کی حیثیت حاصل ہے۔ "جلوۂ تہذیب" کو ٹیپ کے ان شعروں کے حُسن نے اور بھی دوبالا کیا ہے۔ یہ نئی روایت نہ سہی مگر روایت کو خوش اسلوبی سے آگے بڑھانے کا عمل ضرور ہے۔

تجدد اور تفکر تو اس مرثیے میں صاف عیاں ہے۔ کہیں کوئی پامال مضمون نہیں

کوئی مصرع اگلوں سے نہیں ٹکراتا۔ توارد کی نظیر نہیں ملتی۔ مرثیے کا خاکہ تک جُدا ہے۔ پہلے یہ ہوتا تھا کہ سراپا اور جنگ پر زور دیا جاتا تھا مگر اس عہد کے مرثیہ گویوں نے اپنی راہ الگ نکالی ہے۔ چہرے کو یعنی مرثیے کے دیباچے کو زیادہ سے زیادہ فکر انگیز بنایا اور شاعرانہ ہُنر کے ساتھ جہاں کہیں فکر کے اظہار کا موقع ملا' ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ اُردُو مرثیے دیکھیئے تو معلوم ہوگا کہ خاتمے میں شہادت کے مضمون دَم بہ دَم آگے بڑھتے ہیں۔ شاعر ان کے زور کو کم نہیں ہونے دیتا، کیونکہ میلِ گریہ کا عمل نفسیاتی ہوتا ہے۔ کہیں درمیان میں بیان ذرا بھی ادھر اُدھر ہوا، آنکھ میں آیا ہوا آنسو واپس جانے لگتا ہے۔ اس لئے مرثیے کا خاتمہ عام طور پر غیر شاعرانہ اور کمزور تخلیقی عمل کا مظہر ہوتا ہے۔ مگر "جلوۂ تہذیب" کو شاعر نے جس اندازِ خاص سے ختم کیا ہے' ایک طرف تو وہ مکمل سامانِ گریہ ہے' دوسری طرف اظہار کا حسین ترین پیرایہ بھی۔ جنابِ علی اکبرؑ کی شہادت سے جو بجائے خود گُریز کا حاصل تھی ایک اور گُریز کی طرف اشارہ کیا ہے۔ وہ گُریز اس مضمون کی طرف التفات معنی ہے جسے شاعر نے مرثیے کا سرنامہ بنایا تھا اور جسے شاعر اپنے اظہار کی آخری اور مکمل صورت دینا چاہتا ہے۔ چنانچہ مرثیے کے نفسِ مضمون کا یہ آخری بند پڑھیئے اور جنابِ علی اکبرؑ کے بارے میں یہ مصرع دیکھیئے ؏

خُون کو غازۂ رُخسار بنائے تھے حسینؑ

پھر اس مصرع سے خون کی قدر و قیمت پر نظر کیجیئے' جسمِ بشر میں اُس کی سرمتوں کے کمال کو دیکھئے۔ سرگرمیٔ حیات کا یہی تو ایک باعث ہے۔ "جلوۂ تہذیب" اسی احساس کو جگاتا ہے ؎

وہی خون آج بھی ہے رونقِ بازارِ حیات
عزم نے جس کے بنائی تھی کل انسان کی بات
آبروِ چہرۂ کونین کی ہے جس کا ثبات
جس کے ہاتھوں میں سجا آئینۂ ذات و صفات

رُوئے تہذیب کا ہر نقش سنوارا جس نے
زندگی ڈوبتی تھی پار اُتارا جس نے

حرفِ آخر کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ نئے اور پرانے دونوں گروہوں کے لئے یہ تخلیق ایک تحفہ ہے۔ خصوصاً اُن شاعروں اور ادب دوستوں کے لئے جو ترقی پسندانہ خیالات رکھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ روایت سے ہٹ کر نئی نئی اور اچھی اچھی باتیں کی جائیں۔ چنانچہ یہ مرثیہ جو فکر کی نئی راہیں اور اسلوب کے نئے پیرائے لئے ہوئے ہے، اس عہد کے ترقی پسندوں کو بھی بہت بھائے گا۔ غزل، مثنوی، قصیدے اور نظم میں نئے انداز بنانا یا تجربات کرنا آسان کام ہے مگر روایات اور عقائد سے وابستہ شاعری کے مضامین اور تہذیبی علامتوں میں تبدیلی کرنا بڑا ہی مشکل مرحلہ ہے۔ "جلوۂ تہذیب" نے ان معیّن راہوں میں جس انداز سے کاٹ چھانٹ کی ہے اور اس کے خلا کو جس حسنِ تدبّر سے تبدیل کیا ہے، ہم جیسے رجعت پرستوں کو بھی پسند آتا ہے۔ وجہ اس خوبی کی جہاں تک میں سمجھا ہوں یہ ہے کہ "جلوۂ تہذیب" کا شاعر "رقصِ طاؤس" اور "چراغِ دَیر و حرم" خلق کر چکا ہے۔ اُس نے شاعری میں ہیئت و معنی کے کئی تجربات کئے ہیں۔ اُس کے اس سابق ہنر نے اس تخلیق کی راہ ہموار کی ہے۔

میں یہ تو نہیں کہتا کہ "جلوۂ تہذیب" اُردو مرثیے کے سفر میں آخری منزل ہے مگر اتنا ضرور عرض کروں گا کہ منزلِ مقصود کچھ اس سے زیادہ دور بھی نہیں۔

## پروفیسر سجاد باقر رضوی

"جلوۂ تہذیب" ڈاکٹر سید صفدر حسین کا ایک نو تصنیف مرثیہ ہے جسے بارگاہِ ادب، ۴۵ حیدر روڈ، اسلام پورہ، لاہور نے شائع کیا ہے۔ قیمت چھ روپے ہے۔ سفید دبیز کاغذ، خوبصورت کتابت اور دیدہ زیب گرد پوش کے ساتھ طبع شدہ یہ کتاب اُردو مرثیے میں ایک اہم اضافہ ہے۔

ڈاکٹر سید صفدر حسین، مرثیہ نگاری کی نئی تحریک سے وابستہ ہیں۔ تحریکوں سے ہمارے ذہن میں یہ تصور پیدا ہوتا ہے کہ گویا کچھ لوگ مل کر کسی نصب العین کے حصول کے لئے کوشاں ہیں۔ دیگر تحریکوں کی طرح اُردو ادب میں بھی تحریکیں اسی طرح چلائی گئی ہیں، لیکن جدید مرثیہ نگاری کے ضمن میں یہ نہیں کہا جا سکتا۔ لکھنؤ میں بھی خلیق و ضمیر اور انیس و دبیر کے ہاتھوں مرثیہ کا عروج کسی شعوری تحریک کا نتیجہ نہ تھا۔ اصنافِ سخن کا وجود میں آنا یا کسی صنف کا یکایک عروج پانا اس امر کا غماز ہوتا ہے کہ قومی زندگی میں بعض رویے اپنا اظہار چاہتے ہیں۔ قوم کی احساساتی و جذباتی رَو کسی خاص طرزِ اظہار میں خود کو ڈھالنا چاہتی ہے۔ آج کا مرثیہ بھی زندگی کے قدری رویّوں کو متشکل کرنے کا کام انجام دے رہا ہے۔

ایک اور بات غور طلب یہ ہے کہ اُردو مرثیہ ایک ایسی صنفِ سخن ہے جو برِصغیر میں مسلمانوں کی روایت سے مختص ہے۔ میں مرثیہ کی تاریخ اور عربی و فارسی زبانوں میں مرثیہ کی موجودگی کا ذکر کیے بغیر محض یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اُردو میں صنفِ مرثیہ اپنے تکمیلی دَور میں واقعاتِ کربلا کے موضوع اور مسدس کی ہیئت سے مختص ہو گئی اور مرثیے کا یہ اختصاص

اب تک قائم ہے۔ اِسی باعث ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گے کہ صنفِ مرثیہ برِصغیر میں مسلمانوں کی تہذیب و روایت کے بعض اہم اور زندہ عناصر کی نشاندہی کرتی ہے اور آج کے دور میں اس صنف کا احیاء اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ تہذیبی عناصر ایک بار پھر زندگی میں توانا کردار ادا کرنا چاہتے ہیں۔

غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اردو غزل اور اردو مرثیہ مسلمانوں کی تہذیب کے دو بنیادی عناصر یعنی عشق اور جہاد کے رویّوں کا اظہار ہیں۔ علامہ اقبال کی شاعری کی عظمت کا راز اس ایک بات میں بھی ہے کہ اُنھوں نے ان دونوں رویّوں کو اپنے فلسفہ اور شاعری میں ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی۔

اس روشنی میں دیکھا جائے تو آج کے دَور میں مرثیہ کا احیاء بعض تہذیبی عناصر اور اقدارِ حیات کے احیاء کے مترادف ہو جاتا ہے۔ حق و صداقت اور عدل و مساوات کے اصول کا احساس، حق جوئی اور باطل سے ٹکرا جانے کی خواہش، زندگی میں جلال و جمال کے اعلیٰ رویّوں کو پھیلانے کا جذبہ، مزید یہ کہ اقدار کے مٹنے کا غم مختصر یہ کہ حضرتِ حسینؑ کا المیہ زندگی کی اعلیٰ اقدار کا المیہ ہے۔ ان تمام باتوں کے اظہار کے لئے صنفِ مرثیہ موزوں ترین صنف ہے۔ ورنہ اگر مرثیے کے عروج کا تعلق کسی خاص مذہبی یا سیاسی مسلک یا حکومت سے ہوتا تو آج کے دور میں اس صنف کا احیاء ممکن ہی نہ تھا۔

ڈاکٹر صفدر حسین کا مرثیہ "جلوۂ تہذیب" تہذیب کی مختلف جمالی اور جلالی اقدار اور رویّوں کو پیش کرتا ہے، اور پھر ایک گریز کے ساتھ ان رویّوں کو کربلا کی ایک مثالی اور اہم شخصیت، حضرتِ علی اکبرؑ کے ساتھ منسلک کر دیتا ہے۔

ڈاکٹر صفدر حسین نے مرثیہ کی کلاسیکی روایت سے اپنا رشتہ استوار رکھا ہے۔ اسی روایت کے مطابق اس مرثیے میں بھی رخصت اور جنگ کے مناظر پیش کئے گئے ہیں۔ اہم بات روایت کی پاسداری نہیں ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ حق و صداقت کے لئے جان کی بازی

لگانے والے اپنی جان سے گزرنے کے عمل میں کن کن مرحلوں سے گزرتے ہیں۔

صفدر حسین نے مرثیہ کی کلاسیکی ہیئت اور تکنیک میں کوئی اضافہ نہیں کیا۔ اس کے باوجود اُن کے یہاں ایک آگہی ہے جو اُن کے اس مرثیے کو آج کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرتی ہے۔ اس بات کی وضاحت کے لئے مرثیے کے آخری دو بند ملاحظہ ہوں ؎

بھوک اور پیاس کی شدت ہو کہ گرمی کا تعب
فکرِ بربادیِ نسل اور نہ غمِ نام و نسب
شوقِ سرتاجیِ عالم نہ ہوائے منصب
باعثِ ولولۂ شوق فقط مرضیِ رب

ایسا ہی خون تھا درکار امامت کے لئے
کائنات اپنی لٹا دے جو ہدایت کے لئے

وہی خون آج بھی ہے رونقِ بازارِ حیات
عزم نے جس کے بنائی تھی کُل انسان کی بات
آبروئے چہرۂ کونین کی ہے جس کا ثبات
جس کے ہاتھوں میں سجا آئینۂ ذات و صفات

رُوئے تہذیب کا ہر نقش سنوارا اُس نے
زندگی ڈوبتی تھی پار اُتارا اُس نے

اور اس روئے تہذیب کو جس کے نقوش شہدائے کربلا کے خون سے اُبھرے صفدر حسین اس طرح بیان کرتے ہیں ؎

ہے یہی حُسن کا ادراک بنائے تہذیب
یہی احساس ہوا جلوہ نمائے تہذیب
یہی تزکیۂ باطن ہے صفائے تہذیب

شُستگی کا یہی جذبہ ہے خدائے تہذیب

یہی تطہیر ہے صفدر، یہی تنویر بھی ہے
یہی انسان کے ہر خواب کی تعبیر بھی ہے

یہی اِدراک بنا آدمیت کا جوہر
اسی جوہر سے تجلّی ہے بہ آغوشِ نظر
ہے یہی حُسنِ ادا ، حُسنِ تکلّف یکسر
اور اسی حُسنِ تکلّف سے سلاسل زیور

شرطِ پابندیِ احساس لگائی اس نے
ہر جنوں کے لئے زنجیر بنائی اس نے

---

۲۶ر دسمبر ۱۹۷۲ء

# سید قمر حیدر قمر

○

موجودہ زمانے میں مرثیے کو لے کر جو لوگ اُبھرے ہیں اُن میں نسیم امروہوی، رئیس امروہوی، ڈاکٹر سید صفدر حسین اور حسین اعظمی امتیازی حیثیت رکھتے ہیں لیکن مرثیے کے واقعاتی اور المیاتی پہلوؤں کو برقرار رکھتے ہوئے جن لوگوں نے اس صنف میں فکری و تہذیبی عناصر شامل کئے ہیں اور شاعری کی اس صنف سے اصلاحِ ملت اور استواریِ قوم کا کام لینا چاہتے ہیں اُن میں جناب ڈاکٹر سید صفدر حسین کا نام بہت بھاری بھرکم اور دوامی نقوش کا حامل ہے۔ "جلوۂ تہذیب" ڈاکٹر صاحب موصوف ہی کا ایک مربوط مرثیہ ہے جو امام حسین علیہ السلام کے لختِ جگر شبیہ پیغمبرؐ حضرت علی اکبرؑ سے منسوب ہے۔

اس مرثیے کو مسدس ہی میں لکھا گیا ہے۔ یہ ستانوے[۹۷] بندوں پر مشتمل ہے۔ مرثیے کی سب سے بڑی خوبی اس کے تخیل و افکار کا بتدریج ارتقاء ہے۔ مقصدِ تخلیق کہیں جامد یا متزلزل نہیں ہوتا بلکہ ایک مخصوص راستے پر بڑی سبک اور مضبوط رفتار سے آگے بڑھتا جاتا ہے۔ مرثیے کے مرکزی خیال کا تنوع اور ندرت بجائے خود ایک بڑی چیز ہے۔ حضرتِ علی اکبرؑ کو تہذیب کی علامت بنا کر اُن کے کردار کو "جلوۂ تہذیب" کہنا ایک بڑی جدت ہی نہیں ایک زندہ حقیقت بھی ہے۔

اس مرثیے کی زبان انیس کی فصاحت و سلاست اور دبیر کی بلاغت و دقت کی درمیانی کیفیات سے مالا مال ہونے کے ساتھ اپنے اندر ایک پُر وقار نزاکت ایک دلفریب

جاذبیت اور ایک مترنم آہنگ رکھتی ہے۔ مرثیے کا ہر بند ڈاکٹر صفدر کو ایک باشعور محتاط اور حساس شاعر ماننے پر مجبور کرتا ہے۔ یہ تین بند دیکھیے ؎

قلب فطرت میں خودی جب خلش انگیز ہوئی
یعنی شمعِ دلِ آدم کی جو لَو تیز ہوئی
سینۂ ظلمت کا پھٹا، صبح جنوں خیز ہوئی
زندگی ابلقِ ایام کو مہمیز ہوئی
کھا کے ٹھوکر قدمِ عزم کی جانے جاگے
سینۂ دہر میں خوابیدہ ارادے جاگے

---

کیوں نہ ہو خون تھا وہ درد کا مارا ہوا خون
عرشِ اعظم کی بلندی سے اُتارا ہوا خون
تربیت گاہِ محمدؐ میں سنوارا ہوا خون
حیدرؑی عزم کے جوہر سے نکھارا ہوا خون
جو ہر اک معرکے میں برقِ شرر بار رہا
صادق الوعد رہا قائم الاقرار رہا

وہی خون آج بھی ہے رونقِ بازارِ حیات
عزم نے جس کے بنائی تھی کُل انسان کی بات
آبروئے چہرۂ کونین کی ہے جس کا ثبات
جس کے ہاتھوں میں سجا آئینۂ ذات و صفات
روئے تہذیب کا ہر نقش اُبھارا جس نے
زندگی ڈوبتی تھی پار اُتارا جس نے

کتاب میں مرثیے سے پہلے ڈاکٹر محمد احسن فاروقی، پروفیسر حامد حسن سید اور ڈاکٹر اسد اریب کے تین نہایت جاندار اور اہم مضامین ہیں جو زیر بحث مرثیے کا ہر اعتبار سے احاطہ کرتے ہیں۔ علاوہ بریں جہاں تک کتاب کی چھپائی اور کاغذ کے معیار کا تعلق ہے، دونوں چیزیں اپنا جواب آپ ہیں۔ کتاب اتنی خوبصورت نفیس اور پُر وقار ہے کہ بے اختیار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ کتاب کو آفسٹ پر سفید اور دبیز کاغذ اور بہترین جلد کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔ سرورق بھی انتہائی شاندار ہے۔ گویا کتاب صرف سیرت ہی نہیں صورت بھی رکھتی ہے۔

ہفت روزہ "فکر و عمل" حیدرآباد

۲۰ جنوری ۱۹۷۳ء

## انتظار حسین

○

زیرِ نظر کتاب ڈاکٹر سیّد صفدر حسین کے ایک مرثیے پر مشتمل ہے۔ اُردو مرثیہ ایک لمبے عرصے سے یہ تاثر پیش کر رہا ہے کہ یہ صنف اپنے تمام امکانات بروئے کار لاچکی ہے۔ اب مرثیہ لکھنے کے معنی ہیں انیسؔ یا دبیرؔ کی تکرار، مگر عہدِ حاضر کے بعض شاعر اس تاثر کو دُور کرنے کی کوشش میں مصروف نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر سیّد صفدر حسین اس معاملے میں پیش پیش ہیں۔

ڈاکٹر سیّد صفدر حسین مرثیے کے میدان میں بیک وقت دو کام کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ ہمارے عہد کا رشتہ انیسؔ و دبیرؔ کے عہد سے جوڑتے بھی نظر آتے ہیں اور اسی کے ساتھ اس عہد کو انیسؔ و دبیرؔ کے عہد سے ممیّز کرتے بھی نظر آتے ہیں۔ اس زمانے میں مرثیہ لکھنے والوں میں سے زیادہ کے ساتھ یہ حادثہ گزرا کہ وہ گزرے ہوئے عہد کے مرثیے کی جگالی کرتے نظر آئے۔ بعض نے نیا راستہ نکالنے کی کوشش کی تو ان کا مرثیہ ایسی نظم بن کر رہ گیا جس میں عہدِ حاضر کے کچے پکّے خیالات تو وافر مقدار میں نظر آتے ہیں مگر کربلا کا تجربہ تابندہ نظر نہیں آتا۔ صفدر حسین کا زیرِ نظر مرثیہ روایت اور نئی فکر کے امتزاج کی صورت پیش کرتا ہے۔ اس مرثیے میں کوشش نظر آتی ہے کہ وہ عہدِ انیسؔ کے اندازِ نظر کی تکرار بن کر نہ رہ جائے۔ گویا آج کے اندازِ نظر کو پیشِ نظر رکھ کر مرثیہ کہا گیا ہے۔ اسی کے ساتھ یہ کوشش کی گئی ہے کہ مرثیے کا جو امتیازی وصف ہے وہ برقرار رہے یعنی یہ کہ کربلا کا واقعہ اس طور پر بیان کیا جائے کہ وہ ایک تجربے کے طور

پر زندہ نظر آئے۔ اس اعتبار سے زیرِ نظر مرثیہ جوشؔ کے مرثیے "حسین اور انقلاب" سے یکسر مختلف ہے۔ موخر الذکر مرثیے میں واقعۂ کربلا ایک تجربے کے طور پر بیان نہیں ہوا، عہدِ حاضر کے بعض افکار کی روشنی میں اُس کی ایک قابلِ قبول تعبیر پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے، مگر یہ تعبیر چند نعروں اور (CLICHES) کا شکار ہو کر رہ گئی ہے۔

زیرِ نظر مرثیہ ہمیں حضرتِ علی اکبرؑ سے متعارف کراتا ہے۔ مرثیہ انسانی تہذیب کی توصیف سے شروع ہوتا ہے۔ پھر یہ بیان ہوتا ہے کہ کربلا کا واقعہ انسانی تہذیب کے لئے کیا معنی رکھتا ہے ؎

کربلا کیا؟ انھیں آیاتِ درخشاں کی دلیل
ایک صدیوں کی روایات کی صبحِ تکمیل

وقت آیا کہ کریں ظلم کی تکذیب حسینؑ
اپنے کردار سے دیں خیر کی ترغیب حسینؑ
از سرِ نو کریں اخلاق کی ترتیب حسینؑ
پھر سے تہذیب کو دیں صورتِ تہذیب حسینؑ

اور پھر اس پس منظر میں علی اکبرؑ کی شخصیت اُبھرتی ہے۔ حضرتِ علی اکبرؑ کا سراپا مرثیوں میں بالعموم بیان ہوا ہے۔ مگر صفدر حسین نے بھی اس سراپا کو بیان کرنے میں خوب کمال دکھایا ہے حضرتِ علی اکبرؑ کی صورت، سیرت اور شہادت حسن و خوبی کے ساتھ بیان کرنے کے بعد مرثیہ نگار یہ کہتے ہوئے مرثیہ تمام کرتا ہے کہ ؎

کس نفاست سے ہوا جلوۂ تہذیب رقم

مطبوعہ روزنامہ "مشرق" لاہور
۲۱ جنوری ۱۹۷۳ء

احمد سبطین شاہجہانی

○

مداحیِ اہلِ بیتؑ ایک عظیم نعمت ہے ع

یہ مرتبہ بلند ملا جس کو مل گیا

اِس سے وہی خوش نصیب عہدہ برآ ہوتا ہے جس کا دل محبتِ اہلبیتؑ سے معمور اور جسم اُن کی اطاعت سے مزیّن ہو۔ ایسی صورت میں لکھنے والا بیساختہ پکار اُٹھتا ہے ع

اب برستے ہیں مری روح پہ نغمے چھم چھم

ویسے ایں سعادت بزورِ بازو نیست

مرثیہ نگاری خاصی مشکل صنف ہے اور بقولِ میرؔ ع

عشق بن یہ ہنر نہیں آتا

زیرِ نظر کتاب "جلوۂ تہذیب" سیدنا امام حسینؑ کے فرزندِ نامدار جناب علی اکبرؑ کی سیرتِ مطاہر کا منظوم بیان ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ع

سفینہ چاہئے اس بحرِ بیکراں کے لئے

تاہم مصنّف نے بڑی کامیابی اور کامرانی کے ساتھ یہ سعادت حاصل کی ہے۔ اُن کی یہ مساعیِ جمیلہ لائق صد تحسین و آفریں ہیں۔ وہ ایک ژرف نگاہ اور پختہ قلم شاعر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کا ہر بند ابلاغ و اظہار کے جدید ستاروں سے منور و درخشاں ہے۔ اُن کا یہ فن پارہ اگر ایک طرف عقیدت و مودّت کی سرمستیوں سے سرشار ہے تو دوسری طرف محاسنِ سخن کی منہ بولتی تصویر ہے۔ مرثیہ نگاری کی روایات نہایت درخشندہ

ہیں۔ ان میں اضافہ کرنا معمولی اہلِ قلم کا کام نہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے نہ صرف ان روایات میں اضافہ کیا ہے بلکہ اپنے اندازِ بیان کی شیرینی سے اُسے مزید شگفتگی عطا کی ہے۔

"جلوۂ تہذیب" پر راغب مرادآبادی، ڈاکٹر محمد احسن فاروقی، پروفیسر حامد حسن، مولانا غلام اعظم اور ڈاکٹر اسد اریب کے خیالات و افکار ہر لحاظ سے قابلِ قدر ہیں۔

کتابت، طباعت عمدہ اور سرورق جاذبِ نظر ہے

ذرا مندرجہ ذیل بند ملاحظہ فرمائیے کیا لطف دے رہا ہے ؎

نازِ تخلیق یہی ، رازِ تجلّی بھی یہی
جلوۂ طور یہی ، آتشِ سینا بھی یہی
سینۂ گوتم و زرتشت کا شعلہ بھی یہی
حسنِ یوسفؑ بھی یہی ہے یدِ بیضا بھی یہی
یہی ناگاہ دلِ کوہِ صفا سے نکلا
مشعلِ نور لئے غارِ حرا سے نکلا

مطبوعہ: روزنامہ "جمہور" لاہور
۲۲؍ جنوری ۱۹۷۳ء

## پیام شاہجہان پوری

○

مرثیہ اُردو شاعری کی نہایت معروف صنف ہے اور اس کا موضوع بظاہر سیدنا امام حسینؑ اور آپ کے اہلِ بیتؑ کے اُن مصائب کا بیان ہے جن کا میدانِ کربلا میں آپ کو سامنا کرنا پڑا، لیکن ہمارے مرثیہ نگاروں خصوصاً انیسؔ و دبیرؔ نے اس صنفِ ادب میں بعض ایسے اضافے کئے کہ یہ صنف گریہ و ماتم تک محدود نہ رہی بلکہ اس میں زندگی کی ہماہمی اور مناظرِ قدرت کا بیان بھی شامل ہوگیا ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ مرثیہ ہی وہ صنفِ ادب ہے جس کے واسطے سے اُردو ادب، مناظرِ قدرت سے متعارف ہوا۔ اِس موضوع پر ہمارے گزشتہ مرثیہ نگاروں نے اِتنا کچھ کہہ دیا کہ بظاہر اَب اس میں کسی اضافے کی گنجائش اور کوئی نئی بات پیدا ہونے کا امکان باقی نہیں رہا مگر ڈاکٹر سیّد صفدر حسین نے "جلوۂ تہذیب" لکھ کر اس خیال کو غلط ثابت کر دیا۔ ڈاکٹر سیّد صفدر حسین اُردو زبان کے بلند پایہ نقّاد اور نغز گو شاعر ہیں۔ اس سے پہلے اُردو تنقید پر اُن کی کئی کتابیں اور کلام کے متعدد مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ "جلوۂ تہذیب" اُن کی نئی تخلیق ہے جو شہیدِ کربلا علی اکبرؑ کے واقعۂ شہادت کے بیان پر مشتمل ہے۔ اس مرثیہ کے مطالعے سے دل و دماغ سب سے پہلا تاثر یہ قبول کرتے ہیں کہ شاعر فن کی نزاکتوں سے بخوبی واقف ہے، صرف واقف ہی نہیں، انہیں برتنے پر بھی قادر ہے۔ اُسے زبان اور بیان دونوں پر غیر معمولی قدرت حاصل ہے اُس کے

پاس خیالات کا وسیع ذخیرہ ہے۔ ان خیالات کو ترتیب دینے کے سلیقے سے بھی اُسے پوری آگاہی ہے۔ "جلوۂ تہذیب" کا جتنا جتنا مطالعہ کرتے جائیے، یہ خیال پختہ سے پختہ تر ہوتا جاتا ہے کہ شاعر قدیم و جدید مرثیوں کے دونوں اَدوار پر گہری نظر رکھتا ہے اور اُس کے مرثیہ میں دونوں کا امتزاج ملتا ہے۔ ڈاکٹر سید صفدر حسین نے یہ مرثیہ لکھ کر مرثیے کی صنفِ ادب میں بعض قابلِ قدر اضافے کئے ہیں اور بہت سی نئی باتیں پیدا کی ہیں۔ اُنھوں نے شہادتِ حسینؑ کے واقعے کو تہذیبی نقطۂ نظر سے دیکھا ہے۔ اُن کے ذہن میں تہذیب کا نہایت وسیع اور حسین تصور ہے۔ مرثیے کے آغاز میں اُنھوں نے اس تصوّر کی تشریح و توضیح کی ہے، اور فلسفۂ تہذیب بیان کرتے ہوئے اُنھوں نے شاعرانہ حُسن اور فنّی نزاکتوں کو کہیں مجروح نہیں ہونے دیا۔

اِسی تصورِ تہذیب پر اُنھوں نے شہادتِ حسینؑ کی بُنیاد رکھی ہے، بلکہ وحیٔ رسالتؐ کی بُنیاد بھی اسی کو قرار دیا ہے، اور بڑی فن کارانہ چابکدستی سے نظم کو آگے بڑھایا ہے۔ اس مرثیے کا جمالیاتی پہلو خاص طور سے قابلِ ذکر اور قابلِ داد ہے، جو اس مرثیے کو عام مرثیوں سے ممیز کرتا ہے۔ افسوس کہ اِن سطور میں تفصیل کی گنجائش نہیں۔ ذیل میں اس مرثیے کا ایک بند درج کر کے جس میں تہذیب کی خصوصیات کا بیان درجۂ کمال کو پہنچ گیا ہے، ہم قارئین سے اس کے مطالعے کی سفارش کرتے ہیں ؎

نازِ تخلیق یہی، رازِ تجلّی بھی یہی
جلوۂ طور یہی، آتشِ سینا بھی یہی
سینۂ گوتم و زرتشت کا شعلہ بھی یہی
حُسنِ یوسفؑ بھی یہی ہے یدِ بیضا بھی یہی

یہی ناگاہ دلِ کوہِ صفا سے نکلا
مشعلِ نُور لیے غارِ حرا سے نکلا

"جلوۂ تہذیب" معنوی خوبیوں کی طرح صوری لحاظ سے بھی قابلِ قدر ہے۔ کتابت نہایت نفیس، طباعت دیدہ زیب، کاغذ دبیز اور سپید، سرورق نہایت جاذبِ نظر۔

مطبوعہ: ہفت روزہ "حمایتِ اسلام" لاہور
۲۲، فروری ۱۹۷۳ء

محمد قیوم

○

"جلوۂ تہذیب" میں جناب ڈاکٹر سید صفدر حسین کا مرثیہ کے بارے میں فاضلانہ مقدمہ، اپنا جواب آپ ہے۔ بقیہ کتاب میں حضرتِ علی اکبرؑ کی سیرت کا منظوم تذکرہ ہے۔ ہر شعر عترتِ اطہار سے عقیدت کا آئینہ دار ہے۔ بالعموم پاسِ ادب کی وجہ سے مرثیہ پر نقد کرنا مناسب نہیں سمجھا جاتا مگر ڈاکٹر صاحب نے بغرضِ نقد "جلوۂ تہذیب" کو رکھ کر مرثیے کو ایک نئے معنی سے ہم آہنگ کیا ہے۔

روزنامہ "نوائے وقت"۔ لاہور

۱۴ دسمبر ۱۹۷۲ء

محمد قیوم

○

ڈاکٹر سید صفدر حسین، مرثیے کے ایک قادرالکلام شاعر، نظم نگار اور غزل گو کی حیثیت سے ادبی حلقوں میں کسی تعارف کے محتاج نہیں، وہ ایک ماہرِ تعلیم ہونے کے علاوہ سخن گو بھی ہیں۔ سال بھر میں اُن کی ایک تصنیف زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر آجاتی ہے۔

تازہ کتاب "جلوۂ تہذیب" ایک عظیم مرثیہ ہے، جس میں حضرت علی اکبرؑ کی سیرت کا احاطہ کیا گیا ہے۔ کتاب کے شروع میں ڈاکٹر محمد احسن فاروقی، پروفیسر حامد حسن سید اور ڈاکٹر اسد اریب نے ڈاکٹر صفدر صاحب کے فنِ مرثیہ نگاری کا جائزہ پیش کیا ہے۔ ہمیں کتاب پڑھنے کے بعد ڈاکٹر احسن فاروقی کی اس رائے سے اتفاق ہے کہ ڈاکٹر صفدر صاحب ہماری تہذیب کی اس روایت کو جو منبری واعظوں کی مقبولیت کی وجہ سے پسِ پُشت پڑ گئی تھی پھر سے زندہ کر کے وہ مقام دیں گے جس سے مرثیہ نگاری کا ایک نیا دَور شروع ہو جائے گا۔

روزنامہ "نوائے وقت" لاہور

۱۳ جنوری ۱۹۷۳ء

حفیظ صدیقی

○

اُردو ادب کے کسی بھی بالغ قاری کے لئے ڈاکٹر سید صفدر حسین کا نام اور شخصیت محتاجِ تعارف نہیں۔ ڈاکٹر صاحب ایک ممتاز ماہرِ تعلیم اور بالغ نظر نقاد ہونے کے علاوہ، غزل اور نظم کے بھی مشّاق شاعر ہیں، اور مدّتِ مدید سے عروسِ سخن کے گیسوؤں کی آرائش میں پورے خلوص کے ساتھ منہمک ہیں جہاں آپ دیگر اصنافِ سخن پر فن کارانہ دسترس رکھتے ہیں، وہاں مرثیہ نگاری میں بھی آپ ایک اعلیٰ و ارفع مرتبے پر فائز ہیں۔ زیرِ تبصرہ کتاب میں شہزادۂ علی اکبرؑ ہمشکلِ پیغمبرؐ کا بیانِ سیرت ہے جو ستانوے ۹۷ بندوں پر مشتمل ہے ہر بند میں ڈاکٹر صاحب نے مرثیے کی تمام تر روایات کو بوجہِ احسن پورا کیا ہے۔ زورِ بیان، عظمتِ الفاظ، سراپا نگاری، لطافتِ زبان اور تمثیل کاری اِس مرثیے کے خصوصی عوامل ہیں "جلوۂ تہذیب" میں اُن کی شاعرانہ مشّاقی کے نمونے جا بجا ملتے ہیں۔ ڈاکٹر محمد احسن فاروقی، پروفیسر حامد حسن سیّد اور ڈاکٹر اسد اریب نے کتاب کے شروع میں ڈاکٹر صفدر صاحب کے فنِ مرثیہ نگاری پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ اور ہمیں ڈاکٹر اسد اریب کی اس رائے سے اتفاق ہے کہ:

"نئے اور پُرانے دونوں گروہوں کے لئے یہ تخلیق ایک تحفہ ہے۔
خصوصاً اُن شاعروں اور ادب دوستوں کے لیئے جو ترقی پسندانہ خیالات

دیکھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ روایت سے ہٹ کر نئی نئی اور اچھی اچھی تبدیلیاں کی جائیں. چنانچہ یہ مرثیہ جو فکر کی نئی راہیں اور اسلوب کے نئے پیرائے لئے ہوئے ہے اس عہد کے ترقی پسندوں کو بہت بھائے گا۔"

ماہنامہ "تحریریں" لاہور

شمارہ جنوری و فروری ۱۹۷۳ء

○

ڈاکٹر سید صفدر حسین کا نام ادبی اور علمی حلقوں میں محتاجِ تعارف نہیں۔ آپ کئی کتابوں کے مصنّف ہیں اور اپنی ادبی حیثیت اور مقام کی وجہ سے قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ "جلوۂ تہذیب" میں اُنھوں نے ہمشکلِ پیغمبر جناب علی اکبرؑ کی سیرت اور شہادت کا بیان فصیح اور بلیغ انداز میں کیا ہے۔ امام حسینؑ، اُن کے افرادِ خاندان اور وفاداروں کی قلیل جماعت نے تاریخ کی ایک یادگار جنگ میں جو حق اور باطل کے درمیان ہوئی، اپنی جانیں قربان کیں۔ شعرا نے اِن قربانیوں کی داستان اور ان مصائب کی کہانیوں کو مرثیوں کی شکل میں پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر صفدر حسین نے اپنے اِس مرثیے میں کلاسکی روایت کے ساتھ ساتھ جدید خصوصیاتِ فنّی پر بھی توجّہ دی ہے۔

کتاب میں ڈاکٹر محمد احسن فاروقی، پروفیسر حامد حسن سید اور ڈاکٹر اسد اریب کے تین مضامین اور مولانا غلام اعظم کی ایک فارسی نظم بھی شامل ہے۔ بلاشبہ "جلوۂ تہذیب" شاعرانہ صناعی کا ایک دلکش نمونہ ہے۔

مطبوعہ "سیارہ ڈائجسٹ" لاہور
شمارہ مارچ ۱۹۷۳ء

"جلوۂ تہذیب" شہیدِ کربلا حضرتِ علی اکبرؑ کی سیرت و کردار کا جذبات میں ڈوبا ہوا تذکرہ ہے، جسے ڈاکٹر سید صفدر حسین کے قلم نے مرثیے کا جامہ پہنایا ہے۔
ڈاکٹر صاحب نے اپنا یہ مرثیہ ۱۱ جولائی ۱۹۶۵ء کو امام باڑہ، رضویہ کالونی، کراچی کی مجلس میں پڑھا تھا، جسے اب کتابی صورت میں شائع کیا گیا ہے۔
جس وقت یہ مرثیہ پڑھا گیا تھا اُسی وقت اِس کے منفرد انداز اور نئے آہنگ نے شہرت حاصل کرلی تھی۔ اب کتاب کی اشاعت سے ہر پڑھے لکھے شخص کے لئے اِس کے مطالعے کی راہ نکل آئی ہے۔
یہ مرثیہ ۹۷ بندوں پر مشتمل ہے۔ اِن میں نہ صرف حضرتِ علی اکبرؑ اور آپ کی شہادت کے واقعے کو بڑے دلگداز اور جذباتی انداز میں پیش کیا گیا ہے بلکہ انسانیت و تہذیب کے تقاضوں پر بھی بڑے دل نشین پیرائے میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے مرثیہ نگاری کی عام ڈگر سے ہٹ کر مگر اس کے بنیادی تقاضوں کو برقرار رکھتے ہوئے اِس صنف میں بڑا کامیاب تجربہ کیا ہے۔

کربلا کیا؛ انھیں آیاتِ درخشاں کی دلیل
ایک صدیوں کی روایات کی صبحِ تکمیل
جس پہ برپا ہوئی قربانیِ موعودِ خلیلؑ
علی اکبرؑ تھے یہاں، اور وہاں اسماعیلؑ

خونِ کم مایہ اُدھر، خونِ نبیؐ کے بدلے
لاکھ تلواریں اِدھر ایک چھری کے بدلے

شہادت کے بعد کا منظر یوں پیش کرتے ہیں ؎

لاشِ فرزندِ جواں مرگ اُٹھائے تھے حسینؑ
چاند کو اپنے، کلیجے سے لگائے تھے حسینؑ
خون کو غازۂ رُخسار بنائے تھے حسینؑ
روحِ تہذیب کو پروان چڑھائے تھے حسینؑ

عزمِ انساں کی وہ حد تھی کہ مَلک حیراں تھے
زیرِ پا سیکڑوں طوفانِ بلا لرزاں تھے

کتاب میں ڈاکٹر محمد احسن فاروقی، پروفیسر حامد حسن سیّد اور ڈاکٹر اسد اریب کے بھرپور تبصرے بھی شامل ہیں۔

سفید دبیز کاغذ پر چھپی یہ کتاب خوبصورت کتابت اور دلکش طباعت کا اچھا نمونہ ہے۔

مطبوعہ، ہفت روزہ "اخبارِ خواتین"، کراچی
۱۰ ر تا ۱۶ مارچ ۱۹۷۳ء

محمد حبیب اللہ اوج

ڈاکٹر سید صفدر حسین نے "جلوۂ تہذیب" میں حضرتِ علی اکبرؑ کی سیرت و کردار کا منظوم تذکرہ جو مرثیے کی صورت میں پیش کیا ہے، یہ مرثیہ رضویہ کالونی، کراچی کے امام باڑے میں ڈاکٹر صاحب نے ۱۱ر جولائی ۱۹۶۵ میں محرّم کی تقریبات کے سلسلے میں سنا کر شعر و سخن کے ہزاروں سامعین سے دادِ تحسین حاصل کی۔ یوں تو مرثیہ نگاری انیسؔ و دبیرؔ پر ختم ہے مگر اس مختصر مرثیے کی خصوصیت یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے مرثیے کی کلاسیکی روایت میں زمانۂ حال کی شاعری کی جدید ترین خصوصیات شامل کر دی ہیں۔

زیرِ تبصرہ مرثیے میں جملہ ۹۷ بند ہیں۔ حضرتِ علی اکبرؑ کی شہادت کے واقعے کے بعد حال کی طرف گریز کر کے انسانیت اور تہذیبِ جدید کے تقاضوں کے پیشِ نظر حضرتِ علی اکبرؑ کو تہذیب کے اشارے اور علامت کے طور پر پیش کیا ہے۔

مطبوعہ: ہفت روزہ "پاک جمہوریت"، لاہور
شمارہ: ۱۷ر تا ۲۳ر مارچ ۱۹۷۳ء

کسریٰ منہاس

○

صوری اور معنوی اعتبار سے "جلوۂ تہذیب" کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ شروع میں ڈاکٹر محمد احسن فاروقی، پروفیسر حامد حسن اور ڈاکٹر اسد اریب کی تقریظات ہیں۔ ڈاکٹر صفدر حسین ہمارے زمانے کے جانے پہچانے شاعر اہلِ بیتؑ ہیں، اس لحاظ سے اگر یہ تقریظات شامل کتاب نہ ہوتیں تو بھی مضائقہ نہ تھا لیکن ایک عام قاری کے لئے اِن تقریظات میں مفید معلومات موجود ہیں خصوصیت کے ساتھ دورِ جدید کا مرثیہ کیا ہے؟ اور قدیم مرثیہ سے کس حد تک ہم آہنگ ہے اور کس حد تک مختلف؟ یہ بات کھُل کر ان تقریظات کے ذریعے سامنے آجاتی ہے،

"جلوۂ تہذیب" ستانوے ۹۷ بندوں پر مشتمل ہے۔ شاعر کا مقصد نہایت اعلیٰ ہے یعنی یہ کہ واقعاتِ کربلا کس معنی میں ہماری تہذیب کا جوہر ہیں۔ یہ مقصد جدید شعرا ہی کے پیشِ نظر رہ سکتا ہے۔ قدیم مرثیہ گو اپنی تمام تر فنی عظمت کے باوجود فضائل و مصائب تک اپنے کلام کو محدود رکھتے تھے۔ اِس لحاظ سے "جلوۂ تہذیب" ہمارے دَور کا ایک قابلِ قدر کارنامہ ہے۔ شاعر نے مرثیے کے جدید تصور کو ایک نئی جہت سے روشناس کرایا ہے۔ یہ مرثیہ وسعتِ خیال کا ایک نمونہ ہے۔ بُنیادی طور پر ڈاکٹر صفدر کا تصور یہ معلوم ہوتا ہے کہ شہادتِ کربلا انسانیت کے ارتقا کا مثالی نمونہ ہے۔ ارتقا لازمۂ حیات ہے۔ اِس خیال کو پیشِ نظر رکھ کر شاعر ارتقا اور تہذیب کا رشتہ دریافت کرتا ہے یعنی ارتقا بھی

تہذیب ہی کا دوسرا نام ہے ؎

جلوہ افگن ہے زمانے میں ضیائے تہذیب
چہرۂ دہر کی زینت ہے صفائے تہذیب
نسلِ انساں کی ضمانت ہے بقائے تہذیب
حرفِ کُن پہلے ہوا پردہ کُشائے تہذیب

لبِ قدرت جو ہلے، کَون و مکاں خلق ہوئے
بدلی کروٹ جو زمیں نے تو زماں خلق ہوئے

تخلیقِ آدم ایک عزم کی آئینہ دار ہے۔ اور وہ عزم یہ ہے کہ انسانیت وقت کے ساتھ ساتھ تہذیبی ارتقا کی منزلیں طے کرتی چلی جائے۔ شاعر نے اس عمل کو پچاس بندوں میں بیان کیا ہے۔ یہاں بھی طرزِ بیان محض رسمی نہیں۔ شہادت کو امامِ عالی مقام اور اُن کے اہلِ بیتؑ نے ایک مقدّس فریضہ خیال کیا۔ انسانیت کی بہبود اور برتری کا واحد طریقہ یہی نظر آیا کہ ظلم کے خلاف جہاد کیا جائے اور جہاد بھی بے مثال قُربانی دے کر۔ حضرتِ علی اکبرؑ کی تقریرِ پیش از جنگ 'ایک اعلانِ تہذیب ہے' اور اسلامی اقدار کی تبلیغ و اشاعت کر رہی ہے۔

ڈاکٹر صفدر نے ہمشکلِ پیغمبرؐ جناب علی اکبرؑ کے حُسن و جوانی کی وہ تعریف کی ہے کہ شاید و باید! پھر عرب کا جوشِ فصاحت اور ہاشمی جرأت کا لاجواب مظاہرہ! آخر میں جب فوجِ اشقیا پناہ مانگنے لگتی ہے، اُس مقام کو شاعر نے یوں دکھایا ہے ؎

فوج عاجز تھی جلالِ علی اکبرؑ کی قسم
سرِ نموداروں کے خم تھے سرِ سروؑ کی قسم
مورچے ٹوٹ کے ابتر ہوئے حیدرؑ کی قسم
حُسنِ تہذیب نکھر آیا، پیمبرؐ کی قسم

کان تک آئی جو فریاد و فغاں کی آواز
رُک گئی تیغِ جرّی سُن کے اماں کی آواز

یعنی خونِ جنابِ علی اکبرؑ غازۂ رُخسارِ تہذیب ہے۔ اس طرح مرثیے میں ایک نیا رنگ پیدا ہو گیا جو قابلِ ستائش ہے۔ ؎

اللہ کرے زورِ قلم اَور زیادہ

مطبوعہ: ہفت روزہ "رضا کار" لاہور
۲۴ مارچ ۱۹۷۳ء

## ناصر زیدی

ڈاکٹر سید صفدر حسین ایک ہمہ گیر ادیب ہیں جن کی ادبی زندگی کا آغاز اب سے چالیس۴۲ بیالیس سال قبل ایک نو مشق غزل نگار کی حیثیت سے ہوا تھا۔ اُنھوں نے تقریباً آٹھ نو سال اپنی مشقِ سخن اور ذوقِ سلیم کے کرشمے دکھا کر ۱۹۴۱ء میں شاعری کو خیرباد کہا اور تنقید و تحقیق کا مشغلہ اپنے لیے پسند کیا۔ مکمل بیس۲۰ سال تک شاعری سے بے نیازی اور انتقاد سے ربطِ خاص رہا۔ اس زمانے میں متعدد ادبی مسائل پر اُنھوں نے غور کیا اور "اُردو ادب میں جدید رُجحانات" "جدید اُردو غزل" "الہاماتِ یزدانی" "تاریخ مرثیہ نگاری" "لکھنوی ادب" "شخصیات نگاری" "ایک شاعری اور میر انیس" "اُردو مرثیہ کی تشکیلِ جدید" وغیرہ گراں قدر مقالات ترتیب دیئے۔

"۲۷ جنوری ۱۹۶۱ء سے اُنھوں نے دوبارہ شعر گوئی کی طرف التفات کیا۔ اور معرّا نظم کی صورت میں "رقصِ طاؤس" جیسی منفرد تخلیق اُردو ادب کو دی۔ اسی سلسلے میں اُنھوں نے اپنی قدیم غزلیات پر نظرِ ثانی کی اور چند تازہ غزلیں شامل کرکے "چراغِ دیرو حرم" کے نام سے کلاسیکی طرزِ نگارش کا بھی ایک اہم نمونہ پیش کیا۔

جولائی ۱۹۶۲ء کے بعد اُنھوں نے کراچی کے دورانِ قیام اُردو مرثیہ کے احیاء کی ضرورت محسوس کی، اور "دو مراثی تصنیف کرکے مرثیہ کی کلاسیکی

ہیئت پر نئی اقدار کے عمل اور اضافوں کے امکانات کی نشاندہی کی۔"
(جمیلہ خاتون۔ پیش گفتار، نقشِ قدم)

مندرجہ بالا اقتباس "نقشِ قدم" (مطبوعہ ۱۹۷۶ء) مرتبہ محترمہ جمیلہ خاتون سے ہے۔ ڈاکٹر صفدر صاحب کے مذکورہ ۲ دو مراثی میں سے ایک "آئینِ وفا" کے نام سے شائع ہوا جو حضرتِ عباس علمدار علیہ السلام کے حال پر مشتمل تھا۔ دوسرا مرثیہ "جلوۂ تہذیب" کے عنوان سے حال ہی میں شائع ہوا ہے جو زیرِ تبصرہ ہے۔ یہ مرثیہ حضرتِ علی اکبر علیہ السلام، ہمشکلِ پیغمبرؐ کا بیانِ سیرت ہے جو ستانوے ۹۷ بند کا حامل ہے۔

ڈاکٹر صفدر حسین مشہور و معروف ماہرِ تعلیم، محقق، نقّاد، ادیب، غزل و نظم کے خوبصورت شاعر اور کامیاب مرثیہ نگار ہیں۔ انھوں نے جہاں نظم کے سلسلے میں جدید راہیں نکالی ہیں وہاں فنِ مرثیہ نگاری میں بھی خوشگوار اضافے کیے ہیں۔ انھوں نے جدید و قدیم مراثی کا وسیع مطالعہ کیا ہے۔ جدت و روایت کو بخوبی آگے بڑھایا ہے۔ وہ مرثیہ نگاری کے علاوہ مرثیہ خوانی میں بھی اپنا ایک الگ مقام رکھتے ہیں، جو موجودہ مرثیہ نگاروں میں سے کم کو نصیب ہے۔

ان ۲ دو مرثیوں اور غزل و نظم کے مجموعوں یعنی "چراغِ دیر و حرم" اور "رقصِ طاؤس" کے علاوہ ڈاکٹر صاحب موصوف نظم و نثر کی کئی کتابوں کے مصنف ہیں، جن میں سے "مرثیہ بعد انیس" "کارنامۂ انیس" "رقصِ خیال" اور "نگارِ غزل" اہلِ علم و دانش سے دادِ تحسین وصول کر رہی ہیں۔

زیرِ نظر مرثیے کے ہر بند میں ڈاکٹر صاحب نے مرثیے کی تمام تر خصوصیات کو بحسن و خوبی اُجاگر کیا ہے۔ شکوہِ الفاظ، زورِ بیان، عظمتِ فکر، لطافتِ زبان، تمثیل نگاری اور منظر کشی، اس مرثیے کے خصوصی عوامل ہیں۔ حضرتِ علی اکبرؑ کے

بیان میں یہ بند ملاحظہ ہو ؎

ماہِ نو کو کبھی تلوار سمجھ کر ہمکے
ہمکے یوں جیسے علیؑ دیکھ کے اژدر ہمکے
سُن کے آوازِ اذاں جھولے میں اکثر ہمکے
جب بھی عباسؑ قریب آئے تو اکبرؑ ہمکے

کیوں نہ بچپن سے شجاعت کا اُسے پیار ملے
شہسواری کو جسے دوشِ علمدار ملے

مرثیے کی اُٹھان سے لے کر آخری بند تک "جلوۂ تہذیب" میں ڈاکٹر صفدر صاحب کی شاعرانہ مشاقی کے نمونے ملتے ہیں۔

کتاب کے شروع میں ڈاکٹر محمد احسن فاروقی، پروفیسر حامد حسن سید اور ڈاکٹر اسد اریب نے اپنی آرار کا اظہار کیا ہے اور ڈاکٹر صاحب کی مرثیہ نگاری کے ساتھ ساتھ اُن کے فنِ مرثیہ خوانی پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ مولانا غلام اعظم اور راغب مُراد آبادی نے منظوم خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ پورا مرثیہ پڑھنے کے بعد ڈاکٹر اسد اریب کی اِس رائے سے اختلاف نہیں کیا جا سکتا کہ:

"جلوۂ تہذیب" کو میں نے اُردو مرثیے کی روایت میں ایک اضافے کے طور پر قبول کیا ہے میں سمجھتا ہوں کہ ڈاکٹر صفدر صاحب اُردو مرثیے کے میدان میں ایجادِ معانی اور ایزادِ مطالب کی ایک مستقل علامت بن کے اُبھرے ہیں"

مطبوعہ: 'ماہنامہ کتاب' لاہور
شمارہ مارچ و اپریل ۱۹۷۳ء

پروفیسر سلیم اختر

انیسؔ و دبیرؔ نے مرثیہ کو وہ عروج بخشا کہ اس میں کلاسکیت کا درجہ اختیار کر گئے، اس لئے جہاں "بگڑا شاعر مرثیہ گو" والی تہمت ختم ہوگئی وہاں یہ بھی ہوا کہ آنے والے مرثیہ گو کے لئے انیسؔ اور دبیرؔ کے فن کی بلندیوں تک رسائی تقریباً ناممکن ہوگئی۔ شاید اسی لئے اظہارِ عقیدت کے طور پر تو بیشمار شعرا نے مرثیے لکھے لیکن اسے ایک ادبی نصب العین قرار دے کر لکھنے والے کم ہی نکلے، اور ایسے شعرا میں ڈاکٹر سید صفدر حسین صاحب کا نام خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔

ڈاکٹر سید صفدر حسین جامع الصفات شخص ہیں۔ ایک معلم، محکمۂ تعلیم کے سربراہ، ناقد، محقق، شاعر اور ایک خوش ذوق انسان! الغرض ڈاکٹر صاحب پہلودار شخصیت کے حامل ہی نہیں بلکہ ہر پہلو سے اُنھوں نے اپنی انفرادیت بھی تسلیم کرائی ہے۔

"جلوۂ تہذیب" سے قبل وہ "آئینِ وفا" جیسا لاجواب مرثیہ قلمبند کر چکے ہیں جو حضرت ابوالفضل العباسؑ کے احوال و سیرت پر مشتمل تھا اور جس کا ادبی حلقوں نے خیر مقدم کیا تھا۔ اب یہ دوسرا مرثیہ "جلوۂ تہذیب" حضرتِ علی اکبرؑ، ہمشکلِ پیغمبرؐ کے بیانِ سیرت پر ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی طبیعت میں ایک خاص طرح کا جوش اور ولولہ پایا جاتا ہے۔ تحرک کو اُن کی شخصیت کی ایک اہم صفت قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس لئے

وہ طبعاً نظم گوئی کے لئے موزوں ہیں اس کا اظہار "رقصِ طاؤس" کی تکلوں سے بھی بخوبی ہوجاتا ہے۔ اِسی طرح موضوع کی ثقاہت اور عقیدت و احترام کے جذبات کے باوجود "جلوۂ تہذیب" میں بھی ایک خاص نوع کا جو تحرّک ملتا ہے اُس کا سُراغ ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کی نفسی اساس سے ملتا ہے۔

الفاظ سے تحرّک کی مثال کے لئے صرف ایک بند پیش کروں گا:

ماہِ نَو کو کبھی تلوار سمجھ کر جھکے
جُھکے یوں جیسے علیؑ دیکھ کے اژدر جھکے
سُن کے آوازِ اذاں جھولے میں اکثر جھکے
جب بھی عباسؑ قریب آئے تو اکبرؑ جھکے

کیوں نہ بچپن سے شجاعت کا اُسے پیار ملے
شہسواری کو جسے دوشِ علمدار ملے

الفاظ کے دروبست سے ڈاکٹر صاحب نے بیک وقت تحرّک اور خوش گوار قسم کا صوتی آہنگ پیدا کیا ہے۔

مرثیہ کا محرک عقیدت و احترام کے جذبات ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اس الم ناک حادثے کی دل فگار جزئیات کا بیان بھی لازم ہے کہ اِن ہی سے تاثر آفرینی ہوتی ہے۔ اس لئے ان سب تقاضوں کی تکمیل کے ساتھ اسلوب کے فنّی تقاضوں اور ادبی حُسن کو ملحوظ رکھنا بہت مشکل ہوجاتا ہے، لیکن ڈاکٹر صاحب نے یہ مشکل فنّی مرحلہ، بڑی سہولت سے طے کرلیا ہے۔ چنانچہ ایسے بندوں کی کمی نہیں جہاں وہ زندہ تصاویر پیش کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔ مثلاً مناسب الفاظ سے شجاعت اور عزم و ہمّت کا بڑا خوب صورت تاثر دیا ہے ؎

تھا یہ نعرہ کہ جگر گوشۂ حیدر ہوں میں
اے شغالانِ عرب شیرِ دلاور ہوں میں
مجھ کو پہچان لو ہمشکلِ پیمبر ہوں میں
تم میں ہمت ہو تو آؤ علی اکبر ہوں میں
قصد رکھتا ہوں کہ یہ سدِ سکندر الٹوں
آستینوں کو الٹ کر صفِ لشکر الٹوں

---

## صاحبِ کتاب

ڈاکٹر سید صفدر حسین مئی ۱۹۱۹ء میں "سادات باہرہ" کے ایک گاؤں تسہ، ضلع مظفر نگر (یو۔پی) میں پیدا ہوئے۔ تعلیم مظفر نگر، میرٹھ اور علی گڑھ میں پائی۔ ایم اے (اردو) اور ایل ایل، بی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے کیا۔ ایم اے (فارسی) آگرہ یونیورسٹی سے۔ پی۔ ایچ، ڈی ۱۹۵۷ء میں پنجاب یونیورسٹی سے کیا۔

### ملازمت

لیکچرار، اسلامیہ کالج جالندھر، سینیر لیکچرار، گورنمنٹ کالج، راولپنڈی، پروفیسر گورنمنٹ کالج لائل پور، پرنسپل گورنمنٹ انٹر کالج، جہلم، گورنمنٹ ڈگری کالج دادو (سندھ)، گورنمنٹ ڈگری کالج جہلم، گورنمنٹ کالج کراچی، گورنمنٹ کالج جوہر آباد اور گورنمنٹ کالج راولپنڈی۔

ڈپٹی ڈائرکٹر (کالجز) حیدر آباد ریجن سندھ، ڈپٹی ڈائرکٹر (کالجز) کراچی ریجن، چیرمین بورڈ آف انٹرمیڈیٹ اینڈ سیکنڈری ایجوکیشن سرگودھا، ڈائرکٹر آف ایجوکیشن راولپنڈی رہے۔ آج کل ڈائرکٹر توسیعِ تعلیم و تخصیصی تعلیم، پنجاب کے طور پر کام کر رہے ہیں۔

ماہرِ تعلیم ہیں نظم اور غزل کے شاعر ہیں۔ مرثیہ لکھنے اور پڑھنے میں خاص شہرت رکھتے ہیں۔ نقاد ہیں۔ میر انیس پر اتھارٹی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بہت سی تصانیف شائع ہو چکی ہیں اور بہت سی زیرِ طبع ہیں۔

# تصنیفات و تالیفات

۱۔ رقصِ طاؤس (رومانی نظمیں)
۲۔ چراغِ دیر و حرم (مجموعۂ غزلیات)
۳۔ آئینِ وفا (مرثیہ)
۴۔ عرفانِ جمیل (ترتیب و مقدمہ ـــ کلامِ جمیل مظہری)
۵۔ کارنامۂ انیس (ترتیب و مقدمہ)
۶۔ مرثیہ بعدِ انیس (تحقیق و تنقید)
۷۔ جلوۂ تہذیب (مرثیہ)
۸۔ رقصِ خیال (نظمیں)
۹۔ نگارِ غزل (غزلیات)
۱۰۔ لبِ اظہار (ترتیب و مقدمہ ـــ کلامِ قاضی اظہار الحسن اظہر مرحوم)

مطبوعہ ہفت روزہ "شہاب" لاہور

۳۱ مارچ ۱۹۷۳ء

ماہر القادری

○

ڈاکٹر سید صفدر حسین کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ موصوف کی کئی کتابوں پر "فاران" میں مفصل تبصرہ آچکا ہے۔ ڈاکٹر صاحب گیارہ کتابوں کے مصنف ہیں۔ وہ خوش گو شاعر ہی نہیں دیدہ ور نقاد بھی ہیں۔ مرثیہ خوانی میں اُن کا انداز منفرد ہے!

"جلوۂ تہذیب" میں حضرت امام حسینؑ کے فرزند، ہمشکلِ پیغمبرؐ، حضرتِ علی اکبرؓ رضی اللہ عنہ کی سیرت اور شہادت اپنے مخصوص انداز میں صفدر صاحب نے منظوم کی ہے۔

اِس کتاب کا پہلا شعر پورے ایک صفحہ پر بہ عنوان "ہمشکلِ پیغمبرؐ" درج ہے:

جب چلے شیوۂ رفتارِ نبیؐ دِکھلا کر
چونک اُٹھیں شہر کی گلیاں وہی آہٹ پاکر

اس کا مصرعِ اولیٰ، دوسرے مصرعے کا جوڑ نہیں ہے! پھر "دکھلا کر" کی جگہ "دکھاتے ہوئے" ہونا چاہیئے تھا!

---

(نوٹ) مذکورہ بالا شعر ایک بند کی بیت ہے، پورا بند جو صفحہ ۵۳ پر درج ہے قارئین کے ملاحظے کے لئے یہاں دوبارہ نقل کیا جاتا ہے۔

رُخِ روشن وہی، پیشانیِ انور بھی وہی
چشم و ابرو وہی، لہجہ وہی، تیور بھی وہی

ڈاکٹر محمد احسن فاروقی نے اِس کتاب پر جان دار مقدمہ لکھا ہے۔ اور ڈاکٹر صفدر حسین کی مرثیہ خوانی کو خاص طور سے سراہا ہے۔ ۱۱ر جولائی ۱۹۶۵ء کو ڈاکٹر صاحب موصوف نے امام باڑہ، رضویہ کالونی میں یہ مرثیہ پڑھا تھا۔ ڈاکٹر فاروقی نے اس مقالہ میں "آنکھوں دیکھا حال" ادیبانہ انداز میں بیان کیا ہے۔

"وہ بھی اُن کی ایسی جدت تھی جس سے پوری مجلس بے کل ہوگئی"(صفحہ ۹)

کسی کی شاعری سُن کر اور پڑھنے کے انداز کو دیکھ کر کسی محفل کا "بے کل" یا "بے آرام" ہو جانا کوئی تحسین کی بات نہیں ہے۔ جس بند کی تعریف کی گئی ہے اُس میں شباب، خوابِ زلیخا اور شفق کے شہابی اور عارض کے گلابی ہونے کا ذکر ہے اس لئے "بے کل ہوگئی" کی جگہ "پوری مجلس جھومنے لگی" موزوں تر رہتا۔ اِس کے بعد کی سطر میں ڈاکٹر فاروقی نے "نازک بیانی" کے بجائے حیرت ہے کہ "نزاکت بیانی" لکھا ہے!

حضرتِ علی اکبرؑ کے شباب کے بیان میں جو بند ہے وہ خوب ہے اور ٹیپ خوب تر ہے:

کیا تعجب کہ شفق اَور شہابی ہوگی
دُھوپ بھی پرتوِ عارض سے گلابی ہوگی

مگر اب سے برسوں پہلے صہبا اختر دلّی کے لال قلعہ کی تعریف میں یہ مصرع

---

صفحہ ۸۰ سے آگے:

دوش تک آئی ہوئی زُلفِ معنبر بھی وہی
رُخ پہ بَل کھائے ہوئے بالوں کے گھونگر بھی وہی

جب چلے شیوۂ رفتارِ نبیؐ دکھلا کر
چونک اُٹھیں شہر کی گلیاں وہی آہٹ پاکر

(مرتّب)

کہہ چکے ہیں۔ ع

دھوپ دیوار کو چھو لے تو گلابی ہو جائے[1]

---

"یہاں مرثیہ رنگِ تغزل سے معمور ہو گیا اور احساسی (SENSUOUS) تاثرات کا ایک ایسا میدان کھلا کہ تمام مجلس ایک عالمِ کیف میں ڈوب گئی"۔

(صفحہ ۹)

---

[1] (نوٹ) مولانا ماہر القادری کی تحریر سے یہ گمان اُبھرتا ہے کہ ڈاکٹر صفدر حسین نے اپنا خیال شاید صبا اختر کے اس مصرع سے اخذ کیا ہے۔ مولانا کو اپنے ایک ہمعصر شاعر کے کلام پر تبصرے کے لئے بھی کچھ زیادہ کشادہ دِلی اور وسعتِ نظر سے کام لینا چاہیئے تھا۔ علاوہ ازیں ہمشکلِ پیغمبر کے حُسن و جمال کی ستائش کو سُن کر لال قلعہ کی سُرخی کا تصوّر بھی اُن کے ذہن میں نہیں آنا چاہیئے تھا۔ اب رہا مولانا کا یہ خیال کہ ڈاکٹر صفدر حسین نے صبا اختر کا مذکورہ بالا مصرع پڑھ کر یا سُن کر اپنا یہ بند تصنیف کیا ہے ایک ایسا اتہام ہے جو مولانا اپنے بدترین دشمن پر ہی لگا سکتے تھے۔ بہر حال ڈاکٹر صفدر حسین کا پورا بند یہاں نقل کیا جاتا ہے ؎

اے خوشا صلِّ علیٰ اکبرِ غازی کا شباب
جس کی پرچھائیاں دیں خوابِ زلیخا کا جواب
مہِ یثرب، مہِ کنعاں سے زیادہ شاداب
اللہ اللہ وہ کِھلتے ہوئے عارض کے گلاب
کیا تعجب کہ شفق اور شہابی ہو گی
دھوپ بھی پرتوِ عارض سے گلابی ہو گی

(مرتب)

---

ڈاکٹر فاروقی صاحب، نفسیات کی کسی کتاب کا ترجمہ نہیں فرما رہے تھے جو "احساسی تاثرات" لانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس خیال، اور کیفیت کو شگفتہ الفاظ میں ادا فرما سکتے تھے اور "میدان کھلا" اِن کانوں نے سُنا نہ ان آنکھوں نے پڑھا!

"پیدائشی اداکار کا محرّک اُن کے اندر کام کر رہا ہے" صفحہ ۱۳۔ یہ کیسی مصنوعی زبان ہے! سب سے زیادہ حیرت اِس پر ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے اس قسم کے کمزور مصرعے شاعری کی فنکاری کے ثبوت میں درج کئے ہیں:

ع عرش تک دونوں جہاں چُپ تھے بہ کیفِ تکبیر
ع وہ دراز حال یہ عادت ہی نہیں تھی اُن میں
ع سپریں پھینک کے سر تن پہ سنبھالے بھاگے[ل]

ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے:

"مرثیہ کی شاعری اور خواندگی" صفحہ ۱۸

"خواندگی" پر ہم چونکے، پھر خیال آیا کہ لکھنؤ میں یہ لفظ شاید بولا جاتا ہو مگر "نور اللغات" میں نہیں ملا۔

---

(نوٹ[ل]) ادبی ماحول اور تنقیدی نقطۂ خیال کا فرق ہے۔ مولانا نے دیسی مدرسوں اور مکتبوں میں تعلیم پائی ہے اور ڈاکٹر محمد احسن فاروقی انگریزی ادب و تنقید کے اُستاد رہے ہیں، مولانا ایک خاص سانچے میں ڈھلے ہوئے مصرعوں کو پسند کرتے ہیں اور ڈاکٹر صاحب موصوف کی نظر امیجری کی برجستگی، صوتی خوش آئندگی اور معنی خیزی پر رہی ہے۔ بہرحال دونوں تبصرہ نگاروں میں قدیم و جدید احساسات کا فرق نمایاں ہے (مرتب)

پروفیسر حامد حسن سید (ایم اے) کا مقالہ "مرثیہ، کربلا اور صفدر حسین" ادیبانہ اور عالمانہ ہے، جو اُن کے ذوقِ شعری کے بارے میں اچھا تاثر دیتا ہے مگر حیرت ہے کہ وہ فیض احمد فیض کی نظم ؎

ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے

سے متاثر ہیں!

ڈاکٹر اسد اریب کا مضمون خاصہ شگفتہ مضمون ہے مگر حیرت ہے اُنھوں نے

یعنی آراستہ باطن بھی ہو ظاہر کی طرح
سینے روشن ہوں حبیب ابنِ مظاہر کی طرح

جیسے بلند پایہ اور ولولہ انگیز شعر پر "ایطاء" کا اعتراض جڑ دیا، اِس شعر کے قافیوں میں "ایطاء" کا عیب سرے سے ہے ہی نہیں۔

مرثیہ کا آغاز "تہذیب" کی تعریف و ستائش سے ہوتا ہے، فرماتے ہیں:-

جلوہ افگن ہے زمانے میں ضیائے تہذیب
چہرۂ دہر کی زینت ہے صفائے تہذیب
نسلِ انساں کی ضمانت ہے بقائے تہذیب
حرفِ کُن پہلے ہوا پردہ کشائے تہذیب

کہنا یوں چاہیے تھا کہ "تہذیب" نسلِ انساں کی بقا کی ضمانت ہے۔

قلبِ فطرت میں خودی جب خلش انگیز ہوئی
یعنی شمعِ دلِ آدم کی جو لَو تیز ہوئی
سینۂ ظلمت کا پھٹا صبح جنوں خیز ہوئی
زندگی ابلقِ ایام کو مہمیز ہوئی

اِن اشعار کا جو نرم و رواں آہنگ ہے، اُس کے اعتبار سے "سینۂ ظلمت کا پھٹا

وجدان کو کھٹکتا ہے — پھر "صبح کا جنون خیز ہونا" یہ کیا بات ہوئی کیا صبح کے طلوع سے "جنوں" اور "وحشت" کا کوئی خاص تعلق ہے! اس بند کی ٹیپ بہت زوردار ہے ؎

کھا کے ٹھوکر قدمِ عزم کی جادے جاگے
سینۂ دہر میں خوابیدہ ارادے جاگے

مگر "قدمِ عزم" میں تکلف پایا جاتا ہے!

ان بندوں میں کتنی قوت، چمک دمک اور جوش و اثر پایا جاتا ہے ؎

سارے ذرّے تپشِ مہر کے حامل ہو جائیں
سب کے دل معرفتِ حُسن کے قابل ہو جائیں
قطرے گوہر ہوں ستارے مہِ کامل ہو جائیں
جلوۂ طور سے آنکھیں متوصل ہو جائیں
سیرتِ عبد میں معبود کی تنویریں ہوں
چہرے ایسے ہوں کہ والشّمس کی تفسیریں ہوں

انھیں آیاتِ منوّر نے اُجالی دُنیا
اسی پرتو کا نتیجہ ہے جمالی دُنیا
چاہتی ہے یہ بہر حال مثالی دُنیا
ہو مصفّا، عملی اور خیالی دُنیا
یعنی آراستہ باطن بھی ہو ظاہر کی طرح
سینے روشن ہوں حبیب ابنِ مظاہر کی طرح

ایک بند کی ٹیپ ہے ؎

ظلم ترسیدہ و لرزیدہ سیاہی جن سے
کربلا مہبطِ انوارِ الٰہی جن سے (صفحہ ۵۰)

مصرعِ ثانی جتنا بلند و پر جوش ہے مصرعِ اولیٰ اُتنا ہی پست اور سُست ہے!
"لرزیدہ سیاہی جن سے" یہ ٹکڑا ذوق پر گراں گزرتا ہے ع
اِنھیں جلوؤں سے خدائی بخدا روشن ہے
اتنے اچھے مصرع کے بعد فرماتے ہیں ع
قلبِ مہر و مہ و انجم کا دِیا روشن ہے
کیا مہر و مہ و انجم کا قلب مُشترک اور مِلا جُلا ہے ؟
ٹیپ بہت خوب ہے ؎
مشعلیں نُور کی جلتی ہیں اِنھیں جادوں پر
اور قائم ہے تمدّن اِنھیں بنیادوں پر
اِس کے بعد کے بند میں یہ شعر کس قدر غیر شاعرانہ ہے ؎
شبِ تاریک سے لڑتے ہیں نبوّت کے چراغ
شعلۂ قلبِ محمدؐ ہیں امامت کے چراغ [1]

(صفحہ ۵۱)

---

[1] (نوٹ) یہ شعر نہیں ہے بلکہ ایک بند کے ابتدائی چار مصرعوں میں سے آخری دو
مصرعے ہیں۔ پورا بند یہ ہے ؎

آج بھی ذہن میں روشن ہیں ہدایت کے چراغ
دردِ ملّت نے جلائے ہیں محبت کے چراغ
شبِ تاریک سے لڑتے ہیں نبوت کے چراغ
شعلۂ قلبِ محمدؐ ہیں امامت کے چراغ
جلوۂ حق نے بنا رکھا ہے طالب سب کو
نُور ملتا ہے علیٰ قدرِ مراتب سب کو

اِس مصرع؛

کس قدر مرحلۂ صبر و تحمّل ہے اَدَق

میں "اَدَق" پر وجدان کو غور و تامّل کرنا پڑا کہ کیا اُردو میں مرحلہ و جادہ کو اَدَق دشوار کے معنی میں بولتے ہیں!

کیوں نہ بچپن سے شجاعت کا اُسے پیار مِلے
شہسواری کو جسے دوشِ علمدار مِلے

"شجاعت کا پیار" کیا ہوتا ہے؛

جس کے سینے میں دھڑکتا ہو براہیم کا دِل
جس کا دل مستقلاً کوثر و تسنیم کا دل (صفحہ ۵۵)

اوّل تو "مستقلاً" ہی بھرتی کا لفظ ہے پھر کسی کے دل کو کوثر و تسنیم کا دل کہنا مہمل سی بات ہے!

یہی جذبہ لئے شبیرؑ مدینے سے چلے
فدیۂ حق کے لئے ساتھ ننھے گودی کے پلے
پیکرِ عزم و عمل نُور کے سانچے میں ڈھلے
جامہ زیب ایسے کہ ہتھیار بھی لگتے تھے بھلے

مہ جبیں ایسے کہ حُوروں کو بھی پیار آجائے
جس بیاباں میں چلیں اُس میں بہار آجائے

یہ بند ڈاکٹر صفدر حسین کی مرثیہ گوئی کا حسین ترین تعارف ہے۔

ذیل میں منتخب اشعار اور بند درج کیئے جاتے ہیں۔

جوش وہ تھا کہ زمانہ تہہ و بالا ہوتا مُسکرا کر جو نہ حضرت نے سنبھالا ہوتا

ہاں مُصلّے کو بچھایا صفِ ماتم کی جگہ　　　سجدۂ شکر کیا نالۂ پیہم کی جگہ

---

بازو پہلے ہی شکستہ ہیں کمر ٹوٹ نہ جائے　　　ہاتھ سے اُن کے ضعیفی کا عصا چھوٹ نہ جائے

---

حضرت علی اکبرؑ کس جرأتِ ایمانی اور خاندانی شجاعت کے ساتھ یزید کے لشکر کو للکارتے ہیں:

مجھ میں ہمت بھی ہے جرأت بھی ہے شوکت بھی ہے
باپ کا عزم بھی عمّو کی شجاعت بھی ہے
پُشت پر حمزہؑ و جعفرؑ کی روایت بھی ہے
اور میراث میں دادا کی جلالت بھی ہے

جن کو دعوائے شجاعت ہو بلاؤ اُن کو
بھاگنا جن کو نہ آتا ہو لڑاؤ اُن کو

---

کہہ دو نیزوں سے زباں اپنی نکالے کیا ہیں
یہ سناں کیا یہ کماں کیا ہے یہ بھالے کیا ہیں

سناں اور کماں ایک نہیں متعدد تھیں، اس لیے ع

یہ سنانیں یہ کمانیں ہیں، یہ بھالے کیا ہیں

کہنا چاہیے تھا

قدر اندازیں کیا برچھیوں والے کیا ہیں　　　سرحباوں کے ہم ہیں یہ رسالے کیا ہیں

شان اس آنکھ میں جچتی ہی نہیں شاہوں کی
شیر بھبکی میں نہیں آتے ہیں روباہوں کی

علی اکبرؑ کے گھوڑے کی تعریف:

جسم تیار، سُبک چال، جوانی کی اُمنگ — وہ کنوتی جو بدل دیتی تھی پیکا دکا رنگ
گھات ایسی تھی کہ شیرانِ نیستاں بھی ہوں دنگ — تیزگامی کے لئے دامنِ جنگاہ تھا تنگ

اگر "گھات" کے بجائے "جست" ہوتا تو زیادہ موزوں تھا۔

ناز یہ تھا کہ مجھے حاجتِ مہمیز نہیں
اِس پہ غصّہ کہ بیاباں کی ہوا تیز نہیں

حضرتِ علی اکبرؑ کے حُسن اور چہرے مہرے کی مدح میں یہ مصرع ایک قصیدے پر بھاری ہے:

غیظ میں بھی نہ بگڑتی تھی نبیؐ کی تصویر

—— اور ——

یہ شعر

کروٹیں نزع میں اکبرؑ کو بدلتے دیکھا
دمِ جواں شیر کا آنکھوں سے نکلتے دیکھا

تو اپنی جگہ المیہ شاعری کی معراج ہے —— جزاک اللہ

لاشِ فرزندِ جواں مرگ اُٹھائے تھے حسینؑ — چاند کو اپنے، کلیجے سے لگائے تھے حسینؑ
خون کو غازۂ رُخسار بنائے تھے حسینؑ — روحِ تہذیب کو پروان چڑھائے تھے حسینؑ

تینوں مصرعے قیامت کے ہیں مگر چوتھا مصرعہ بے جوڑ ہے!

شہِ ذی جاہ نے دُہرائی جو وہ حالتِ خواب
وجہِ حیرت ہوئی فرزند کو کیفیتِ خواب (صفحہ ۵۸)

ٹیپ اور آتنی سپاٹ!

صادق الوعد ہوں ٹیڑھا نہیں جادہ میرا
مرضیِ حق کے مطابق ہے ارادہ میرا

"پیڑھا نہیں جادہ" نے شعر کو کمزور کر دیا۔

جانِ آفاق گلے مل کے بہن سے نکلا
قافلہ بادِ بہاری کا چمن سے نکلا (صفحہ ۶۲)

"جانِ آفاق" مصرع پورا کرنے کے لئے بس جوڑ دیا گیا ہے۔

عرض کر لال ترا فخرِ اَب وجد ہو جائے
میری اُمّت کا یہ فدیہ نہ کہیں رَد ہو جائے

حضرتِ حسینؑ کی شہادت کی تقدیس، عظمت اور اہمیت اپنی جگہ مُسلّم، مگر اُمت کے لئے اُس کو "فدیہ" سمجھنا اسلامی عقیدہ نہیں ہے!

تجھ سے اکبرؑ کا طلب گار ہے ربِّ اکبر
جو خدا کی ہے امانت اُسے دے دے اُٹھ کر (صفحہ ۶۸)

مصرعۂ ثانی بے لُطف ہے۔

قصد رکھتا ہوں کہ یہ سدِ سکندر اُلٹوں
آستینوں کو اُلٹ کر صفِ لشکر اُلٹوں

کاش! پہلا مصرع، مصرعۂ ثانی جیسا ہوتا! مصرعِ اولیٰ میں "یہ" خاص طور سے کھٹکتا ہے۔

یا علیؑ کہہ کے مجاہد نے نکالی تلوار
سایۂ نیرِ اکبر میں ہلالی تلوار

دوسرے مصرعے میں تکلّف کے سوا اور کیا دھرا ہے! [۱] (صفحہ ۷۳)

---

(نوٹ) [۱] دوسرے مصرعے کا ربط تیسرے مصرعے سے تھا جو مولانا نے نہ ملحوظ رکھا اور نہ نقل فرمایا اس لئے مفہوم تشنہ رہ گیا اب پورا بند یہاں نقل کیا جاتا ہے تاکہ قارئین خود انصاف فرما سکیں ۔

؎ شیر نے توڑ دیا فوج کی نخوت کا خُمار

اس طرح کون بولتا ہے کہ فلاں شخص نے فلاں آدمی کی نخوت کا خمار توڑ دیا ![1]

---

بے جھجک چھاؤں میں تیغوں کی دَر آنا بھی رہا

زد پہ جو ہو اُسے ہنس ہنس کے رُلانا بھی رہا

مصرعۂ ثانی وضاحت طلب ہے۔[2]

---

گزشتہ صفحہ سے

یا علیؑ کہہ کے مجاہد نے نکالی تلوار

سایۂ نیّرِ اکبر میں ہلالی تلوار

بنی منجملۂ آیاتِ جلالی تلوار

غل ہوا، لو! علی اکبرؑ نے نکالی تلوار

لیلیٰ صاعقہ خُو، صاعقہ بار آتی ہے

پھول زخموں کے برستے ہیں بہار آتی ہے

---

(نوٹ[1]) شعر میں عموماً وہی باتیں بیان نہیں کی جاتیں جو بولنے میں آتی ہیں شعر میں کسی بات کو بیان کرنے کے لئے تشبیہ اور استعارے سے بھی کام لیا جاتا ہے اور اس لحاظ سے اندازِ بیان شاعرانہ ہو جاتا ہے۔ پیشِ نظر مصرعے میں اندازِ بیان کی یہی صورت ہے۔ (مُرتّب)

(نوٹ[2]) اِس پورے بند کا ربط گذشتہ بند کے آخری مصرعے سے تھا جو مولانا نے نظر انداز کر دیا ہے۔ وہ مصرعہ یہ ہے ؎

بن گئے حیدرِ کرّار کی جراَت کی مثال

آخر میں صرف ایک سلام ہے، جس کے یہ دُو شعر بہت خوب ہیں:

حسینؑ ابنِ علی چُن چُن کے لائے تھے شجاع ایسے
مورّخ دے رہا ہے دادِ حُسنِ انتخاب اب تک
ابھی تک ضربِ حیدرؑ کی دھمک سینے میں ہے اس کے
پُکار اُٹھتی ہے خیبر کی زمیں یا بوتراب! اب تک

اِس مرثیے میں بڑے درد انگیز اور ولولہ خیز اشعار بھی ہیں، شاعر کی عقیدت، خلوص کے پیکر میں ڈھل گئی ہے! بعض بند پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میر انیس بول رہے ہیں۔ مرثیہ میں جسے "چہرہ" کہتے ہیں، اُس میں انفرادیت پائی جاتی ہے۔ مگر "تہذیب و تمدن" سے حضرتِ علی اکبرؑ کی سیرت اور شہادت کا جوڑ ملانا عجیب سا لگتا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کراچی میں ایک مشہور خطیب نے "حسینؑ اور اقتصادیات" کے عنوان پر تقریر کر ڈالی!

مرثیوں اور تقریروں میں کربلا سے متعلق جو مکالمے بیان کئے جاتے ہیں وہ زیادہ تر خیالی یا یوں کہیے "زبانِ حال" ہوتے ہیں یعنی یہ کہ فلاں موقع پر

---

(گزشتہ صفحہ سے)

اور اب یہ بند ملاحظہ کیجیے ؎

بے جھجک چھاؤں میں تیغوں کی دَر آنا بھی وہی
زد پہ جو ہو اُسے ہنس ہنس کے رُلانا بھی وہی
جھومنا بھی وہی ہونٹوں کو چبانا بھی وہی
کوئی مانگے جو اَماں منہ کو پھرانا بھی وہی

بھاگتی فوج کا پیچھا کبھی منظور نہ تھا
کہ یہ مردانِ اولوالعزم کا دستور نہ تھا

(مرتب)

اس قسم کی گفتگو ہوئی ہوگی یا ہونی چاہیئے تھی مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں جو یہ کہا ہے :

ناگہاں آئی یہ آوازِ رسول الثقلینؐ
اے مری نورِ نظر! خواہرِ رنجورِ حسینؑ

اور پھر کئی بندوں میں نُطقِ رسالت مآب کا مکالمہ درج کیا ہے، مرثیہ کا یہ حصہ پڑھ کر ضمیر سوال کرتا ہے کہ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس قسم کے فرضی (افسانوی) مکالموں کی نسبت جائز ہے؟ — ہرگز نہیں، اس کے لئے شدید وعید آئی ہے۔[1]

ڈاکٹر صفدر حسین کی شاعری کا یہ دَورِ شباب ہے، اس مرثیہ میں اس کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ مثلاً اِس شعر میں :

زلفیں وہ جن پہ تصدّق شبِ معراج کا طُول
جن کی خوشبو سے مدینے کو ملی بوئے رسولؐ

میں کس قدر شگفتگی پائی جاتی ہے! ڈاکٹر صفدر حسین کا یہ مرثیہ یقین ہے کہ پسند کیا جائے گا۔

مطبوعہ : ماہنامہ "فاران"، کراچی
ماہ مئی ۱۹۷۳ء

---

(نوٹ) [1] یہ علمِ نفسیات کا نکتہ تھا جسے مولانا شریعت میں لے گھسے ہیں معلوم نہیں کہ مولانا خدا سے منسوب اِس قسم کی گفتگو کا کیا جواز رکھتے ہیں ؎

رُکے شہ تو پردے سے آواز آئی
کہ پردے میں آ تجھ سے پردہ نہیں ہے

(مُرتّب)

○

ڈاکٹر صفدر حسین پاکستان کے اُن مرثیہ نگاروں کی صف میں شامل ہیں جن میں آلِ رضا ایسی شخصیت بھی موجود ہے، جنہوں نے مرثیہ میں ہیئت اور مواد دونوں حیثیت سے بہت زیادہ اضافہ کیا ہے، اور اب تو پاکستان اُردو مرثیہ کا ایک منفرد مقام بن گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آلِ رضا کو یہ اعتراف کرنا پڑا۔

"کراچی میں مجالسِ تحت اللفظ خوانی کی گہما گہمی اور طرزِ خواندگی میں ممدوح تنوّع کی مختلف شکلیں ایسی ہیں کہ اُن کی مثال نہ کسی شہر میں ہے اور نہ کبھی تھی۔"

(نقشِ قدم صفحہ ۲۷۶)

اِس مثال کے بنانے میں ڈاکٹر صفدر حسین کی مرثیہ گوئی نے بھی اپنا موثر کردار ادا کیا ہے۔ زیرِ تبصرہ کتاب میں اُن کا وہ معروف مرثیہ شامل ہے جو اُنہوں نے ہمشکلِ پیغمبرؐ جنابِ علی اکبرؑ کی شہادت پر رقم کیا ہے ..... ڈاکٹر صفدر حسین نے اس صنف میں بہت کامیاب اجتہاد کیے ہیں اور یہی بات اُنھیں اپنے معاصرین میں ممتاز کرتی ہے، کیونکہ وہ مرثیہ کو اُس کی منزلِ مقصود کے قریب کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں، اور کسی فنکار یا قلم کار کے لئے یہی سب سے بڑا اعزاز ہے کہ وہ اپنے فن کو پورے خلوص کے ساتھ اُس کی معراج تک پہنچا دے۔ اِس مرثیہ کے چند اشعار کے مطالعہ سے متذکرہ بالا دعوے کو تسلیم

کرنا پڑتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں ؎

کیوں نہ ہو خون تھا وہ درد کا مارا ہوا خون
عرشِ اعظم کی بلندی سے اُتارا ہوا خون
تربیت گاہِ محمدؐ میں سنوارا ہوا خون
حیدری عزم کے جوہر سے نکھارا ہوا خون

جوہر اک معرکہ میں برق شرربار رہا
صادق الوعد رہا قائم الاقرار رہا

وہی خون آج بھی ہے رونق بازار حیات
عزم نے جس کے بنائی تھی کل انسان کی بات
آبرو چہرۂ کونین کی ہے جس کا ثبات
جس کے ہاتھوں میں سجا آئینۂ ذات وصفات

روحِ تہذیب کا ہر نقش سنوارا جس نے
زندگی ڈوبتی تھی پار اُتارا جس نے

اُردو مرثیہ میں ایک گراں بہا اضافہ ہے اور اُردو کے شیدائیوں کے لیے یہ ایک نیا تحفہ ہے، جس کی کتابت اور کاغذ دونوں معیاری ہیں قیمت مناسب ہے یقیناً اِسے ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔

روزنامہ "مساوات" لاہور
۱۱ر جون ۱۹۷۳ء

پروفیسر صفی حیدر دانش

اب سے تقریباً پچیس ۲۵ تیس ۳۰ سال پہلے اُردو میں مرثیہ نگاری کی صنف میں کچھ اہم تبدیلیاں شروع ہوئیں اور وہ اپنے ارتقاء کے ایک ایسے دَور میں داخل ہوئی جس کو مرثیہ نگاری کا جدید دَور کہہ سکتے ہیں۔ اس دَور میں ۲ دو قسم کے شعرا نمایاں ہیں۔ بعض تو ایسے ہیں جنھوں نے مرثیہ کے روائتی مضامین تقریباً ترک کر کے اس کو تعمیری، فکری اور تبلیغی موضوعات کے اظہار کا وسیلہ بنایا۔ اِن لوگوں نے فلسفۂ شہادت اور اُس کے دور رَس انقلابی اور افادی پہلو پیش کرنا شروع کئے، لیکن بعض شعرا ایسے ہیں جو جدید فکری میلانات کے ساتھ ساتھ مرثیہ کی روایتی خصوصیات کو اُس کے جلال و جمال اور اُس کی کلاسیکی دلکشی کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔

ڈاکٹر سید صفدر حسین صاحب اسی طبقے کے شعرا میں ایک ممتاز اور نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ اِن کے زیرِ نظر مرثیہ "جلوۂ تہذیب" میں جدید اندازِ فکر کے ساتھ ساتھ قدیم اسلوب کا پور نکھار، جاذبِ توجہ نظر آتا ہے۔

جناب صفدر حسین صاحب صرف مرثیہ گو شاعر نہیں ہیں بلکہ وہ غزل اور نظم میں بھی پختہ گو اور مشاق شاعر ہیں۔ غزل ایجاز و اختصار کا ہُنر اور بات کو بھرپُور قوت سے ادا کرنے کا گُر سکھنے کے لئے ایک بہت کارآمد صنف ہے۔ نظم سے شرح و بسط کرنے کی استعداد مضبوط ہوتی ہے۔ صفدر صاحب اِن دونوں راستوں میں کامیابی سے سفر کر چکے ہیں۔ اِس لئے

اُن کے مرثیہ میں غزل کی لطافت اور نظم کی قوّت دونوں بڑی خوبی سے ہم آہنگ نظر آتی ہیں۔ یہ مرثیہ جناب علی اکبرؑ کے حال میں ہے، جس میں فاضل مُصنّف نے اساتذۂ قدیم کی صحت مندانہ روایات کے ساتھ ساتھ ایجاد و اختراع کی ضرورتوں اور نئے ادبی تقاضوں کو بھی ملحوظِ خاطر رکھا ہے۔ قدیم و جدید امتزاج کا ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ یہ رنگ ہر مذاق کے سامعین میں مقبولیت کا ضامن ہے۔ اِس میں دلکشی اور افادیت شیر و شکر ہوگئی ہیں اور زبان و بیان کی لطافتوں نے اِس میں ایک خاص کشش پیدا کر دی ہے۔

فاضل مُصنّف نے اپنے مرثیہ کا جو نام رکھا ہے یعنی "جلوۂ تہذیب" وہ نئے اندازِ فکر کی طرف ایک دلکش اور بلیغ اشارہ ہے۔ اِس نام کے اعتبار سے مرثیے میں جو مضامین آئے ہیں اُن سے اِس میں وہ خوبی پیدا ہو گئی جس کو رمزیت یا معنویت کہا جا سکتا ہے۔ اس مرثیہ کے چہرے میں جلوۂ تہذیب سب سے پہلے لبِ قُدرت سے "حرفِ کُن" کی آواز بن کر ظاہر ہوتا ہے، اور پھر مراحلِ تخلیق طے کرتا ہوا، نوعِ انسان کے ہر خواب کی تعبیر بنتا ہوا اُس منزل تک پہنچتا ہے جہاں زمینِ کربلا، انھیں آیاتِ درخشاں کی دلیل بن جاتی ہے[۵]

کربلا کیا؟ انھیں آیاتِ درخشاں کی دلیل
ایک صدیوں کی روایات کی صبحِ تکمیل
جس پہ برپا ہوئی قربانیٔ موعودِ خلیلؑ
علی اکبرؑ تھے یہاں اور وہاں اسمٰعیلؑ

خُونِ کم مایہ اُدھر، خونِ نبی کے بدلے
لاکھ تلواریں اِدھر ایک چھُری کے بدلے

یہ بند مرثیہ کا تیرھواں بند ہے جس سے شاعر نے جناب علی اکبرؑ کی مدح و توصیف کی طرف بڑی چابکدستی اور خوبصورتی کے ساتھ گُریز کیا ہے۔ اِس طرح قاری کا ذہن کچھ دیر فکری ماحول میں رہنے کے بعد محبّت و عقیدت کی پُرکیف وادی میں داخل ہو جاتا ہے، جہاں

ممدوح کے سراپا کی تعریف سے طبیعت وَجد کرنے لگتی ہے۔ اس کے بعد جنابِ امامؑ کی مدینہ سے رُخصت، سفر کے مختصر حالات، اور کربلا میں ورود کے بعد روزِ عاشورا کا ذکر ہے، یہاں تک کہ جنابِ علی اکبرؑ کے میدانِ جنگ میں جانے کی نوبت آجاتی ہے پھر شہزادۂ کونین کی میدان میں آمد، رجز خوانی، جنگ اور شہادت کا بیان ہے آخر میں وہی جلوۂ تہذیب جس سے بات شروع ہوئی تھی اب خونِ جنابِ علی اکبرؑ کا رنگ اختیار کرکے جو عالم دکھاتا ہے وہ شاعر کے لفظوں میں سُننے کے قابل ہے ؎

وہی خون آج بھی ہے رونقِ بازارِ حیات
عزم نے جس کے بنائی تھی کل انسان کی بات
آبروِ چہرۂ کونین کی ہے جس کا ثبات
جس کے ہاتھوں میں سجا آئینۂ ذات وصفات

رُوئے تہذیب کا ہر نقش سنوارا جس نے
زندگی ڈوبتی تھی، پار اُتارا جس نے

اِس مرثیہ میں تہذیب کے جلووں نے ایک قسم کی وحدتِ تاثر پیدا کر دی ہے، جس سے مرثیے کے مختلف اجزاء ایک رشتۂ اِتحاد میں مُنسلک ہو گئے ہیں۔ صفدر صاحب نے قدیم طرز کی شان و شوکت برقرار رکھنے کے لئے بہت سخت میدان میں قدم رکھا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ بڑی کامیابی سے گزُرے ہیں۔ اُن کے ذہن نے ہر منزل پر مناسب مضامین کو بڑی خوبی سے تلاش کیا ہے۔ صفدر صاحب کا اسلوب پُختہ، پُرجوش اور متین ہے۔ الفاظ پسندیدہ، تراکیب چُست اور پُرمعنی، زبان شُستہ، ترکیبیں اور استعارے برجستہ جو قدم قدم پر فنی پختگی کا پتہ دیتے ہیں۔ مختصر یہ کہ "جلوۂ تہذیب" حُسنِ ادا اور قدرتِ بیان کا ایک دلکش ادب پارہ ہے اور ہمارے منظوم ادب میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہے۔

راولپنڈی
۲۹، اکتوبر ۱۹۷۳ء

علی حیدر ملک

○

مرثیہ ایک صنفِ سخن ہے جس کا تعلق ہماری تہذیبی زندگی سے بہت ہی گہرا اور قدیم ہے۔ ابتدا سے لے کر اب تک ہر دور میں مرثیے کہے اور پڑھے جاتے رہے ہیں۔ ماضی میں انیسؔ، دبیرؔ اور شادؔ نے اسے ایک معیار اور مرتبہ عطا کیا تھا۔ حال میں جوشؔ، جمیل مظہری اور رئیسؔ وغیرہم نے اِس صنف میں بعض کامیاب نمونے پیش کئے ہیں۔ ڈاکٹر سید صفدر حسین کو بھی دورِ حاضر کے اِن ہی لوگوں میں شامل سمجھنا چاہیے۔ اُن کا نام مرثیے کے ضمن میں خصوصی توجہ اور اہمیت کا مستحق اس لئے بھی ہے کہ اُنھوں نے خود کو مرثیہ کی تصنیف و تالیف اور ترویج و اشاعت کے لئے وقف کر دیا ہے۔

جولائی ۱۹۶۵ء میں ڈاکٹر صاحب موصوف نے رضویہ کالونی، کراچی، میں منعقد ایک مجلس میں ایک مرثیہ سُنایا تھا جسے حاضرین نے کافی سراہا۔ وہی مرثیہ اب "جلوۂ تہذیب" کے نام سے کتابی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ شاعر نے اِس مرثیے میں جس کے مرکزی کردار حضرتِ علی اکبرؑ ہیں، کربلا کے المیے کو تہذیب کی جلوہ نمائی قرار دیا ہے۔ شروع کے کئی بندوں میں یہ بتایا گیا ہے کہ تہذیب کیا ہے؛ اس سلسلے کا ایک بند ملاحظہ ہو ؎

نازِ تخلیق یہی، رازِ تجلّی بھی یہی
جلوۂ طور یہی، آتشِ سینا بھی یہی
سینۂ گوتم و زرتشت کا شعلہ بھی یہی
حُسنِ یوسفؑ بھی یہی ہے، یدِ بیضا بھی یہی

یہی ناگاہ دِل کوہِ صفا سے نکلا
مشعلِ نور لیئے غارِ حرا سے نکلا

تہذیب کے متعلق اظہارِ خیال کرنے کے بعد کربلا کے بارے میں شاعر کہتا ہے ؎

کربلا کیا؟ اِنھیں آیاتِ درخشاں کی دلیل
ایک، صَدیوں کی روایات کی صحیح تکمیل
جس پہ برپا ہوئی قربانیِ موعودِ خلیل ؑ
علی اکبرؓ تھے یہاں، اور وہاں اسمٰعیل ؑ

خونِ کم مایہ اُدھر، خونِ نبی کے بدلے
لاکھ تلواریں اِدھر ایک چُھری کے بدلے

اِس کے بعد حضرت علی اکبرؓ کی سیرت بیان کی گئی ہے۔ جنگ میں اُن کی شرکت کا حال اور آخر میں اُن کی شہادت کا دلدوز اور اثر انگیز منظر پیش کیا گیا ہے۔

اِس مرثیے کے تمام بند ایک دوسرے سے مربوط ہیں اور ان میں واقعاتی صداقت اور فنی حُسن پایا جاتا ہے۔ صفدر حسین نے جہاں مرثیہ کی قدیم روایات سے بھرپور استفادہ کیا ہے، وہاں بعض جگہ اس سے "بغاوت" بھی کی ہے، اور یہ بات بلاخوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ اُن کی یہ "بغاوت" مرثیے کے لیے مفید ثابت ہوئی ہے۔ تفصیلات کی گنجائش نہیں، مختصر صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ "جلوۂ تہذیب" جدید اُردو مرثیے میں ایک خوبصورت اضافہ ہے۔

مطبوعہ: ماہنامہ افکار کراچی
نومبر ۱۹۷۳ء

## سید انصار ناصری

"جلوۂ تہذیب" کے مُصنّف ڈاکٹر سید صفدر حسین صاحب ہیں، جو ایک ممتاز ماہرِ تعلیم اور محقق ہونے کے علاوہ اُردو ادب کے فاضل نقاد اور خود ایک قادر الکلام خوش گفتار شاعر کی حیثیت سے معروف ہیں۔ مرثیہ گوئی کے فن کی احیاء کے ضمن میں اُن کی خدمات خاص مقام رکھتی ہیں۔ صفدر صاحب مرثیے کی کلاسیکی ہیئت و ترکیب، اس کے ڈرامائی اوصاف، شوکتِ لفظی، زورِ بیان، بلند آہنگی، محاکات اور منظر کشی وغیرہ کے صرف قائل ہی نہیں بلکہ دلدادہ بھی ہیں، کیونکہ انہی اوصاف کے باعث مرثیہ گوئی کو ادب میں اپنا خصوصی مقام حاصل ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر صفدر مرثیے کی روایات میں جدید اقدار، حقیقت پسندی، اور انسانی اخلاق و کردار کی عظمت کے نئے تصوّرات کی ترویج بھی چاہتے ہیں اور اُردو مرثیے کی مسلّمہ ہیئتِ ترکیبی کو برقرار رکھتے ہوئے اس میں نئے نئے افکار اور جدید ترین اسالیب کا اضافہ کرنا چاہتے ہیں۔

"جلوۂ تہذیب" اُن کا تخلیقی اختراع اور ایجادِ معانی کا واضح ثبوت ہے جو دراصل حضرتِ علی اکبرؑ کی سیرتِ پاک اور اُن کی شہادت کے دلدوز واقعے کے بیان میں ایک مرثیہ ہے۔ مگر یکسر جُداگانہ طرز کا مرثیہ جو روایتی اندازِ بیان اور تکرار و توارد کی بجائے تجدد اور تفکّر سے مالا مال ہے۔ سراپے اور اسلحے کی طولانی تفصیل کی بجائے صفدر صاحب نے یہ راہ نکالی ہے کہ مرثیے کے چہرے یعنی دیباچے کو بامعنی اور فکر انگیز بنایا ہے چنانچہ

"جلوۂ تہذیب" میں مرثیے کا چہرہ، تہذیب کے موضوع پر جدید طرز کی نظم کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ اس مرثیے میں ڈاکٹر صفدر صاحب تہذیب سے کائنات کا حسن و تہذیب بھی مُراد لیتے ہیں اور متمدن دُنیا کا امن و شائستگی بھی جس پر نسلِ انسانی کی بقا اور نمود کا دارومدار ہے۔ اُن کے نزدیک، تہذیب ہی حیاتِ انسانی کی ابدی قدر اور اُس کی بقا کا اشد ترین لازمہ ہے۔ چنانچہ اس مرثیے کی ابتدا میں فرماتے ہیں ؎

جلوہ افگن ہے زمانے میں ضیائے تہذیب
چہرۂ دہر کی زینت ہے صفائے تہذیب
نسلِ انساں کی ضمانت ہے بقائے تہذیب
حرفِ کُن پہلے ہوا پردہ کشائے تہذیب
لبِ قدرت جو ہلے کون و مکاں خلق ہوئے
بدلی کروٹ جو زمیں نے تو زماں خلق ہوئے

تیسرا بند ہے ؎

شوق کی آنکھ کھلی ہیچ کا پردا سرکا
دیکھ کر آئنۂ وقت میں اپنا چہرا
لبِ قدرت پہ ہوا ایک تبسّم پیدا
اُس تبسّم کے جو عقدوں کو نظر نے کھولا
حُسن از پردہ برآمد بہ تجلّی دم زد
عشق پیدا شُد و آتش بہ ہمہ عالم زد

انوارِ تہذیب کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

یہی سرمایۂ انوارِ علومِ کونین
تھا سلونی بہ لبِ فاتحِ صِفّین و حُنین

یہی اسرارِ تجلّی بہ حدیثِ ثقلین
انھیں اسرارِ تجلّی کا امیں قلبِ حسینؑ

ظلم ترسیدہ و لرزیدہ سیاہی جن سے
کربلا مہبطِ انوارِ الٰہی جن سے

انھیں جلووں سے خدائی بخدا روشن ہے
قلبِ مہر و مہ و انجم کا دِیا روشن ہے
چشمِ عقل و دلِ اربابِ صفا روشن ہے
راہِ حق، راہِ عمل، راہِ وفا روشن ہے

مشعلیں نُور کی جلتی ہیں انھیں جادوں پر
اور قائم ہے تمدّن انھیں بنیادوں پر

غرض اِس طرح ڈاکٹر صفدر حسین کربلا کی غایت، جلوۂ تہذیب کی بقا اور روحِ تہذیب کا سرچشمہ حسینؑ کی ذاتِ گرامی کو قرار دیتے ہیں۔ ؏

روحِ تہذیب کو پروان چڑھائے تھے حسینؑ

صفدر صاحب نے "جلوۂ تہذیب" میں مرثیے کی جملہ روایات کو نہ صرف برقرار رکھا ہے بلکہ نئے اسالیب و معانی کے اضافے کے ساتھ اُسے ایک جدید اسلوب اور نیا آہنگ بخشا ہے۔ اُنھوں نے مرثیے سے محض بین و بُکا کا مقصد پورا نہیں کیا بلکہ کربلا کے سانحے کے تعمیری پہلو اور شہادتِ آلِ نبیؐ کے فلسفیانہ نکات واضح کر کے مرثیہ کو زیادہ گہرائی اور گیرائی دی ہے۔ "جلوۂ تہذیب" جدید طرز کا مرثیہ ہے جو اُردو میں ایپک (Epic) شاعری کی ایک اچھی مثال اور ادب میں یقیناً ممتاز مقام رکھتا ہے۔

تبصرہ

ریڈیو پاکستان۔ راولپنڈی

## قیوم شاکر

ڈاکٹر سید صفدر حسین تخلیق کے میدانِ شاداب و سرسبز کے وہ شہسوار ہیں جن کا رہوارِ قلم جذب و تفکّر کے نور آفریں و کیف آگیں کرشمے دکھاتا ہے۔ وہ شاعر بھی ہیں اور نثر نگار بھی۔ اُن کی شاعری میں تنوّع اور تازگی کا جمیل امتزاج ہے۔ غزل ہو یا مرثیہ، وہ ہر صنفِ سخن میں اپنے جمال آفریں فنّی شعور کا اظہار کرتے ہیں۔ مرثیہ گوئی کی کلاسیکی روایات کو انھوں نے فکر آمیز اشک فشانی کے نئے رُجحان سے آشنا کیا ہے۔ اِس سے قبل "آئینِ وفا" (جو حضرت ابو الفضل العباسؑ کے بیان میں فکر و جذبے سے معمور مرثیہ ہے) اربابِ ذوق و نظر سے خراجِ تحسین حاصل کر چکا ہے۔ زیرِ نظر کتاب 'حضرتِ علی اکبرؑ ہمشکلِ پیغمبرؐ کے احوال و سیرت کے بیان میں وہ مرثیہ ہے جسے ڈاکٹر صاحب نے ۱۱ جولائی ۱۹۶۵ء کی شام کو امام باڑہ رضویہ کالونی (کراچی) میں شائقینِ شعر و سخن کے سامنے پیش کیا تھا اور دادِ سخن حاصل کی تھی۔

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ شاعر، لوگوں کے بدلتے ہوئے شعور و احساس کا ساتھ دیتا ہے۔ میرے خیال میں اچھے شاعر کا طُغرائے امتیاز یہ ہے کہ وہ زندگی کی نئی نئی صداقتوں اور حقیقتوں کی فنّی توجیہ و تعبیر بھی کرتا ہے۔ "جلوۂ تہذیب" کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر سید صفدر حسین نے بھی سانحۂ کربلا کے وسیلے سے تہذیب و معاشرت کی فنّی توجیہ و تعبیر کی ہے۔ "جلوۂ تہذیب" کا مطلع اُن کے تہذیبی شعور کی داخلی شہادت پیش کرتا ہے ؎

جلوہ افگن ہے زمانے میں ضیائے تہذیب
چہرۂ دہر کی زینت ہے صفائے تہذیب

نسلِ انسان کی ضمانت ہے بقائے تہذیب
حرفِ کُن سے پہلے ہوا پردہ کشائے تہذیب

لبِ قدرت جو ہلے کون و مکاں خَلق ہوئے
بدلی گردش جو زمین نے تو زماں خَلق ہوئے

ڈاکٹر صاحب کا خیال بالکل بجا ہے کہ حضرتِ امام حسینؑ کے جواں مرگ فرزند کی لاش سے کربلا کی تپتی ہوئی ریت پر گرنے والے خون کے ہر قطرے نے ہر آن پروان چڑھتی ہوئی تہذیب کو جنم دیا اور معاشرت کی تجمیل و تکمیل کی۔

فنی لحاظ سے بھی "جلوۂ تہذیب" خاصے کی چیز ہے۔ مطلع، چہرہ، رُخصت، رجز کے اشعار، جنگ اور شہادت وغیرہ رسمی مرثیہ گوئی کے تمام اہم اجزا بکمالِ قدرت و شادابی موجود ہیں۔ خاص طور پر تشبیہات کی تازگی اور الفاظ کا انتخاب و استعمال قابلِ ذکر ہے۔ وہ اپنے خصوصی فن کے ذریعے سے، اپنے سامعین کو ایک ایسا تسکین آمیز سکون بخشتے ہیں جو یاس و شکست کے بجائے اُمید و رجا کا باعث بنتا ہے، مثلاً شہزادہ علی اکبرؑ کے شباب کا نقشہ ملاحظہ فرمایئے

اَے خوشا صلّ علی اکبرِ غازی کا شباب
جس کی پرچھائیاں دیں، خوابِ زلیخا کا جواب
مہِ یثرب، مہِ کنعاں سے زیادہ شاداب
اللہ اللہ وہ کِھلتے ہوئے عارض کے گلاب

کیا تعجب کہ شفق اور شہابی ہوگی
دھوپ بھی پرتوِ عارض سے گلابی ہوگی

مختصر یہ کہ "جلوۂ تہذیب" میں مرثیے اور غزل کے لطیف عناصر کا جمیل امتزاج ہے، اور یہ مرثیہ اُردو کے کلاسیکی مرثیے کی روایت میں ایک وقیع اضافہ ہے۔

مطبوعہ ماہنامہ "نیرنگِ خیال"
سالنامہ ۱۹۷۰ء

سید سعید مرتضیٰ زیدی

# "ڈاکٹر صفدر حسین کی مرثیہ گوئی"

"آئینِ وفا" اور "جلوۂ تہذیب" کی تصنیف سے پہلے علمی اور ادبی حلقوں میں ڈاکٹر سید صفدر حسین مرثیہ کے ایک معروف نقاد کی حیثیت سے جانے اور پہچانے جاتے تھے لیکن ان مرثیوں کی اشاعت کے بعد ڈاکٹر صاحب نے اپنے آپ کو ایک اچھا مرثیہ گو ثابت کر دیا ہے۔ یہاں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ آپ کے مرثیے اُردو ادب میں ایک امتیاز کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان مرثیوں کی بدولت ڈاکٹر صاحب موصوف کو اس دور کے بہترین اور قابل ترین مرثیہ نگاروں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

مرثیہ کی تعریف کرتے ہوئے سید عابد علی عابدؔ "اصولِ انتقادِ ادبیات" میں لکھتے ہیں کہ ادبی اصطلاح کے طور پر مرثیہ اُس صنفِ شعر کو کہتے ہیں جس میں سید الشہدا حضرت امام حسین علیہ السلام یا اُن کے رفیقوں کے سفرِ کربلا، مصائب، شجاعت اور شہادت کو بیان کیا جائے۔ امام حسین علیہ السلام کی ذات، تاریخِ عالم کے آئینے میں عظمتِ انسانی کے ہر دلعزیز مرقع کی حیثیت رکھتی ہے اور واقعۂ کربلا اور اس کی جزئیات کا انسانی زندگی میں تصرف اس قدر متنوع اور گوناگوں ہے کہ بلا خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے۔

نیا ہے جب بھی لیجے نام اُس کا
بہت وسعت ہے میری داستاں میں

چنانچہ دینی عقائد اور مذہبی جذبات سے قطع نظر بھی اُردو مرثیہ کی تفہیم کی مختلف سطحیں دریافت کی جا سکتی ہیں۔ مرثیے کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کی مجاہدانہ ذہنیت کی غمازی کرتا ہے، خدا اور انسان کے باہمی تعلق کی وضاحت کرتا ہے اور فطرت پر انسان کی قوتِ تسخیر کے عمل دخل کی گواہی دیتا ہے۔ مرثیہ ایک طرف تو موضوعاتی اعتبار سے برصغیر کی تہذیب کا نچوڑ ہے اور دوسری جانب ادبی اعتبار سے

اسے اُردو کی تمام تر شعری روایات کا سَت یا جوہر کہا جا سکتا ہے۔ قصیدہ، مثنوی، غزل اِن تمام اصنافِ سخن کی فنی خوبیوں کا عکس صنفِ مرثیہ میں جھلکتا ہے۔ جدّتِ بیان، تسلسلِ واقعات، جذبات نگاری، کردار نگاری، واقعہ نگاری، منظر کشی، پیغام، آفاقیت، فلسفۂ شہادت اور دیگر فنی قیود، مرثیہ نگاری کو انتہائی مشکل اور لطیف فن کی صورت دیتی ہیں اور زبان کا تخفیفی پیرایہ جملہ مشکلات پر مستزاد کی حیثیت رکھتا ہے۔

ڈاکٹر صفدر حسین کے مرثیے کی سب سے بڑی خصوصیت اُن کی شستہ زبان ہے۔ علم کے ساتھ ساتھ زبان و بیان کا حُسن، ماحول سے بھی پیدا ہوتا ہے۔ اگر کسی شاعر کو علم پرور اور بہترین اہلِ زبان کا ماحول نصیب ہو جائے تو یہ خصوصیت اس کی شاعرانہ مساعی میں بڑا حُسن پیدا کر دیتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب بھی اُن خوش نصیبوں میں سے ہیں جنھیں دولتِ علم کے ساتھ ساتھ ماحول نے بھی چار چاند لگائے ہیں۔ "آئینِ وفا" اور "جلوۂ تہذیب" علم پرور ماحول کی مُنہ بولتی تصویریں ہیں۔ "آئینِ وفا" میں لشکرِ امام حسینؑ کے علمدار حضرتِ عباسؑ کا بچپن سے جوانی کی طرف سفرِ زندگی بیان کرتے ہوئے شکوہِ الفاظ، تسلسلِ واقعات اور محاوروں کا بے نظیر استعمال جو ڈاکٹر صاحب نے کیا ہے وہ آپ بھی دیکھیے ؎

علم کا شوق تھا مائل بہ روانی کی طرف | ملتفت ذوقِ نظر حُسنِ معانی کی طرف
جب بڑھی عمر لڑکپن سے جوانی کی طرف | ہاتھ بڑھنے لگے تیغِ سفہانی کی طرف

کتنی بھرپور بھی کتنی طرحدار آئی
ہاتھ میں بیٹے کے جب باپ کی تلوار آئی

یوں ہی جب تیس برس عمر کی تکمیل ہوئی | اور حالات کی اس طور سے تشکیل ہوئی
شانِ دین، شوکتِ اورنگ میں تبدیل ہوئی | ہوسِ جاہ میں یہ سعی پہ تعجیل ہوئی

کہ محمدؐ کے گھرانے کو مٹایا جائے
اس چراغِ ابدیت کو بجھایا جائے

ہوئے عباس اُسی دورِ تلاطم میں جواں | دل میں تھے مشل علیؑ خدمتِ حق کے ارماں
وہی تیور، وہی قوت، وہی کس بل، وہی شان | ہر نظر جذبۂ اخلاص و صداقت کی زباں

دل سے آواز یہ آتی تھی اُجالا کیجیے
عزم کہتا تھا کہ دنیا تہہ و بالا کیجیے

جب کہ موصول ہوا شام سے یہ حکمِ یزید
امتحاں گاہِ شجاعت ہوا دربارِ ولید
اور نہ مانیں تو کیا جائے وہیں اُن کو شہید
جس میں تھی شاہ سے بیعت طلبی کی تاکید
کی جو حاکم نے ذرا تیز نظر سُوئے حسینؑ
آگیا تیغ بکف قوّتِ بازوئے حسینؑ

والیِ شام ہے کیا اَے سگِ ناپاک خموش!
کہا للکار کے اَو حاکمِ سفاک خموش!
مُنھ سے کیا کہہ گیا تو مُنھ میں ترے خاک خموش!
اُس کی بیعت کرے سبطِ شہِ لولاک خموش!
دیکھتا کیا ہے اِدھر آنکھ دکھانے والے
کس سے دبتے ہیں محمدؐ کے گھرانے والے

اِسی مرثیہ میں حُسنِ زبان و بیان کا ایک اور نمونہ ڈاکٹر صفدر حسین اُس وقت پیش کرتے ہیں جب امام حسینؑ کے خیمے نہرِ فرات سے اُٹھائے جاتے ہیں حضرتِ عباسؑ کے غیظ میں بھرے ہوئے تیور دیکھ کر امام عالی مقام اپنے اس شجاع بھائی کو کس محبت و شفقت سے سمجھاتے ہیں اور دریا سے بغیر جنگ کئے واپس آنے پر فرماتے ہیں ؎

اُمّتِ جد ہیں رہے اِن کو مبارک دریا
کیوں خفا ہوتے ہو شبیرؑ ہے راضی بہ رضا
جو فریضہ ہے ہمارا بہ سہولت ہو اَدا
اِن کی خواہش ہے تو ریتی ہی پہ خیمے ہوں بپا
مجھ پہ روشن ہے جو کچھ پردۂ تقدیر میں ہے
میرے غازی یہ ترائی تری جاگیر میں ہے

تم بسو گے اِسی دریا کے کنارے عباسؑ
دیکھتا ہوں میں مشیت کے اشارے عباسؑ
میرے پیارے مرے اللہ کے پیارے عباسؑ
مَوجیں دہرائیں گی افسانے تمہارے عباسؑ
سیرتِ جعفرِ طیّار دکھانا ہے تمہیں

ایک تاریخ یہاں آکے بنانا ہے تمھیں

امام حسینؑ کے نصیحت آمیز بیان کے جواب میں حضرتِ عباسؑ علمدار کا کیا حال ہوا اس کی تصویر اس بند میں ملاحظہ کیجئے ؎

لبِ اعجازِ امامت سے سُنے جب یہ سُخن
بر ہمی بھول گئی اپنی اداؤں کا چلن
خود سے شرما گئی آئی ہوئی ماتھے کی شکن
سُرخیِ غیظ نے چہرے سے سمیٹا دامن

پھر سے بیساختہ پن آگیا تو یروں میں
ولولے قید ہوئے حِلم کی زنجیروں میں

اور جب اجازتِ جنگ میں تاخیر ہوتی ہے تو حضرتِ عباسؑ کی زبانی امام حسینؑ سے گفتگوئے عباسؑ کتنی حسین اور کس قدر سلیس زبان میں پیش کرتے ہیں ؎

اب تو حضرت سُنی جاتی نہیں بچوں کی فغاں — کیا گلا کاٹ کے مر جاؤں میں یا شاہِ زماں
میرا مُنھ دیکھ کے رہ جاتے ہیں طفلِ ناداں — گاہ آآکے دکھاتے ہیں مجھے خشک زباں

دِل پہ گھِر کر اَلم وغم کا سحاب آتا ہے
پسرِ ساقیِ کوثر ہوں حجاب آتا ہے

وعدہ کرتا ہوں کہ تلوار نہ لے جاؤں گا — مشکیں خاموشی بھر لوں گا چلا آؤں گا
صبرِ حضرت کا نمونہ اُنھیں دکھلاؤں گا — سر جھکا کر تبرؔ و تیر و سناں کھاؤں گا۔

ایک نیزے کی اجازت ہو ضرورت کے لئے
وہ بھی اپنی نہیں مشکوں کی حفاظت کے لئے

سراپا، تلوار اور گھوڑا مرثیہ کے اہم جُزو ہیں۔ کلاسیکی مرثیہ ان میں سے کسی ایک کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتا۔ ڈاکٹر صفدر حسین کے یہاں یہ تینوں چیزیں بڑے حسین انداز میں ملتی ہیں۔ "جلوۂ تہذیب" میں امام حسینؑ

کے کڑیل جوان فرزند حضرت علی اکبرؑ کا سراپا کس خوبی سے کھینچا ہے آپ بھی ملاحظہ کیجیے۔

اے خوشا صلِ علیٰ اکبرِؑ غازی کا شباب    جس کی پرچھائیاں دیں خوابِ زلیخا کا جواب
مہِ یثرب، مہِ کنعاں سے زیادہ شاداب    اللہ اللہ وہ کھلتے ہوئے عارض کے گلاب

کیا تعجب کہ شفق اور شہابی ہو گی
دھوپ بھی پرتوِ عارض سے گلابی ہو گی

حبذا عارضِ شمشادِ گلستانِ بتولؑ    دیدۂ بلبلِ سدرہ ہو خنک جس سے وہ پھول
زلفیں وہ جن پہ تصدق شبِ معراج کا طول    جن کی خوشبو سے مدینے کو ملی بوئے رسولؐ

آنکھیں اصحاب کی روشن ہوئیں جلوہ دیکھا
اپنے محبوب پیمبرؐ کا سراپا دیکھا

رخِ روشن وہی، پیشانیِ انور بھی وہی    چشم و ابرو وہی، لہجہ وہی، تیور بھی وہی
دوش تک آئی ہوئی زلفِ معنبر بھی وہی    رخ پہ بل کھائے ہوئے بالوں کے گھونگر بھی وہی

جب چلے شیوۂ رفتارِ نبیؐ دکھلا کر
چونک اٹھیں شہر کی گلیاں وہی آہٹ پا کر

سیرۃً تام خدا اخلاقِ نبیؐ کی تصویر    ارث میں جوشِ شجاعت تھا علیؑ کی جاگیر
حلقۂ زلف میں بچپن سے جلالت تھی اسیر    تھے کھلونے تبر و تیغ و سنان و شمشیر

شانے بے ساختہ جھولے میں لچک جاتے تھے
سن کے تلوار کی جھنکار ٹھمک جاتے تھے

"جلوۂ تہذیب" ہی میں حضرت علی اکبرؑ کے گھوڑے کی تعریف اس طرح کرتے ہیں ؎

مرتجز، شیرِ خدا فاتحِ خیبرؑ کا فرس    ذوالجناح شہِ والا تھا پیمبرؐ کا فرس
علی اکبرؑ کا فرس تھا علی اکبرؑ کا فرس    باگیں ڈھیلی جو وہ کرتے تو دلاور کا فرس

عرش تک جا کے فرشتوں کی دعائیں لیتا

خود براقِ نبویؐ آکے بلائیں لیتا

جسم تیار، سُبک چال، جوانی کی اُمنگ — وہ کنوتی جو بدل دیتی تھی پیکار کا رنگ
گھات ایسی تھی کہ شیرانِ نیستاں بھی ہوں دنگ — تیز گامی کے لیے دامنِ جنگاہ تھا تنگ
ناز یہ تھا مجھے حاجتِ مہمیز نہیں
اس پہ غصہ کہ بیاباں کی ہوا تیز نہیں

تلوار کی تعریف کچھ اس طرح کرتے ہیں ؎

موت کہتی تھی غضب ہے یہ اکیلی تلوار — مجھ کو کافی ہے ابد تک یہ اکیلی تلوار
صدقے میں جاؤں ہے یہ مرے ساتھ کی کھیلی تلوار — میری مُنھ بولی بہن میری سہیلی تلوار
چشمِ بد دور جھجک جاتی ہے بجلی اس سے
ملک الموت کی آنکھوں میں ہے خنکی اس سے

ڈاکٹر صفدر حسین مرثیے کی کلاسیکی ترتیب، اس کے بیانیہ وصف، اور اس کی تمثیل کارانہ اہمیت کے ساتھ ساتھ اپنے مرثیے میں جدید اقدار کی عظمت، حقیقت پسندی، تاریخی شعور اور انسانی عظمت کے نئے تصورات کی ترویج بھی کرتے ہیں۔ وہ مرثیے میں سراپا اور منظرکشی کے ساتھ ساتھ، پیامِ عمل، جذبۂ ایمان، روحِ ایثار و قربانی اور آفاقی اصول بھی قلمبند کرنا ضروری سمجھتے ہیں کیونکہ آج اس جدید دور میں جبکہ آمدورفت کے ذرائع بہتر ہو چکے ہیں، ایک مُلک کی تہذیب و ادب کا دوسرے کی تہذیب و ادب پر خاصا اثر پڑ رہا ہے، دُنیا سمٹ رہی ہے، مختلف اقوام کے مابین دُنیا میں اشتراک و تعاون بڑھ رہا ہے۔ آفاقیت اب ایک شعوری تحریک بن کر ادیبوں اور شاعروں کو متاثر کر رہی ہے۔ آج کا فنکار علاقائی حدبندیوں سے بلند ہو کر اپنی تخلیقات پیش کر رہا ہے، جو دُنیا کے دیگر خطوں میں رہنے والے افراد کو بھی متاثر کر سکیں۔ ان میں اخوت اور انسانی دردمندی کے جذبات پیدا کر سکیں اور انسانی مسائل کے بارے میں ایک بین الاقوامی نقطۂ نظر کو ترویج دے سکیں۔

ڈاکٹر صفدر حسین بھی ان جدید تحریکوں سے متاثر نظر آتے ہیں۔ اُنھوں نے قومی تعصبات اور محدود سوچ سے بالاتر ہو کر اپنے مرثیوں میں ایک وسیع اور انسانی نقطۂ نظر پیش کیا ہے۔ "جلوۂ تہذیب" کی ابتدا

میں وہ ایک آفاقی نظریہ پیش کرتے ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ "تہذیب سے مذہب ہے اور مذہب سے تہذیب" اور اس حقیقت سے کسی کو انکار بھی نہیں کہ تخلیقِ کون و مکاں، انسان کے لئے ہے اور مقصدِ انسانیت بقائے تہذیب ہے۔ تہذیب زندہ ہے تو نسلِ انسانی زندہ ہے، بلکہ نسلِ انسانی کی بقا کا ضامن شیوۂ تہذیب ہے۔ اِس آفاقی نظریے کو ڈاکٹر صاحب کے الفاظ میں آپ بھی ملاحظہ کیجئے ؂

جلوہ افگن ہے زمانے میں ضیائے تہذیب　　چہرۂ دہر کی زینت ہے صفائے تہذیب
نسلِ انساں کی ضمانت ہے بقائے تہذیب　　حرفِ کُن پہلے ہوا پردہ کشائے تہذیب
لبِ قُدرت جو ہلے کون و مکاں خلق ہوئے
بدلی کروٹ جو زمیں نے تو زماں خلق ہوئے

ہے یہی حُسن کا ادراک بنائے تہذیب　　یہی احساس ہوا جلوہ نمائے تہذیب
یہی تزکیۂ باطن ہے صفائے تہذیب　　شُستگی کا یہی جذبہ ہے غذائے تہذیب
یہی تطہیر ہے مقدر یہی تنویر بھی ہے
یہی انسان کے ہر خواب کی تعبیر بھی ہے

یہی ادراک بنا آدمیت کا جوہر　　اسی جوہر سے تجلّی ہے بہ آغوشِ نظر
ہے یہی حُسنِ ادا، حُسنِ تکلّف یکسر　　اور اِسی حُسنِ تکلّف سے سلاسل زیور
شرطِ پابندیِ احساس لگائی اس نے
ہر جنوں کے لئے زنجیر بنائی اس نے

بحیثیتِ مسلمان ہم اسلام کا مفہوم یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام عملی زندگی میں ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ ہمارے فکر و احساس کو حرکت میں لاتا ہے اور زندگی کے زندہ مسائل پر سوچنے، سمجھنے اور فیصلہ کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ اسی لئے آج کا شاعر اور ادیب یہ سوچنے پر مجبور ہے کہ ہمارے بزرگوں، روحانی رہنماؤں اور پیغمبروں کے کارنامے ہمیں زندگی کا صحت مند شعور بخشتے ہیں کہ نہیں، زندگی کے اہم مسائل میں ہماری رہنمائی کرتے ہیں کہ نہیں اور وہ اسی انداز میں واقعاتِ کربلا کا تجزیہ کرنے پر بھی مجبور ہیں۔ آج کا ہر باشعور

انسان یہ سوچتا ہے کہ میدانِ کربلا میں جو حق و باطل کا معرکہ ہوا آج اس کا اصلی مفہوم ہمارے لئے کیا ہے اور ہم اپنی زندگی کے مسائل کا سامنا کرتے ہوئے اس معرکے سے کس طرح کسبِ نور کر سکتے ہیں۔ اگر بہ نظرِ غائر مطالعہ کیا جائے تو میدانِ کربلا میں باطل کی قوتیں، ملوکیت کی قوتیں تھیں جو ظلم و جبر کی علامت تھیں اور حق کی قوت ایک صحیح فیصلے، صحیح فکر اور انصاف پسندی کا نشان تھی۔

حسینیت اور یزیدیت دو متضاد قوتوں کا نام ہے۔ حسینیت مکمل صدق و صفا، اور یزیدیت بھرپور کفر و منافقت تھی۔ یہ قوتیں کربلا کی جنگ کے بعد عالمِ شعور سے ابھریں۔ کربلا کی جنگ سے پہلے یہ قوتیں رحمانیت اور ابلیسیت، مصطفائیت اور بولہبیت کے نام سے مشہور تھیں۔ ان ہی دو قوتوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ڈاکٹر صفدر حسین اپنے مرثیوں میں جگہ بہ جگہ فلسفۂ شہادت پیش کرتے ہیں۔

ڈاکٹر صفدر حسین نے ماضی و حال میں تسلسل قائم کر کے مستقبل کے لئے نئے تجربے کئے۔ ان تجربوں میں نمایاں حیثیت اُن کی تمثالیت (IMAGERIES) کی ہے۔ مرثیہ گوئی میں تمثالیت کا تجربہ بہت محدود ہے۔ جدید مرثیہ گو شعراء میں اس کی اچھی مثالیں جوشؔ، آلِ رضاؔ اور قیصرؔ بارہوی کے یہاں ملتی ہیں۔ دوسرے شعراء تمثالات میں جن علائم، استعارات یا تلمیحات سے کام لیتے ہیں اُن کا دائرۂ ابلاغ اتنا محدود ہوتا ہے کہ تصوّر میں حسیات کی کائنات مختصر کر رہ جاتی ہے۔ ڈاکٹر صفدر حسین نے اپنے مرثیوں میں تمثالوں کو بڑی فراوانی کے ساتھ استعمال کیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اُن کے یہاں ایک ڈرامائی فضا پیدا ہو جاتی ہے جو قاری کو اپنی طرف قدم قدم پر متوجہ کر لیتی ہے۔

ڈاکٹر صفدر حسین کی مرثیہ گوئی کے اِس مختصر جائزے کے بعد ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ طرزِ فکر، طرزِ احساس اور طرزِ تجدید کے لحاظ سے موصوف کا شمار اُن مرثیہ گویوں میں ہوتا ہے جنھوں نے اندازِ مرثیہ اور جدید ادبی رُجحانات کو تنقیدی نگاہ سے دیکھتے ہوئے مرثیہ نگاری کے فن کو آگے بڑھایا ہے۔ وہ ایک رُباعی میں فرماتے ہیں ؎

ذہنوں کی روش بدلنے والے ہم ہیں
کانٹوں کی زباں مَسلنے والے ہم ہیں

سَو بار حریفوں نے ہمیں دیکھ لیا
تلوار کی طرح چلنے والے ہم ہیں

مندرجہ بالا رُباعی ڈاکٹر صاحب کے فن کے بارے میں اُن کے صحت مندانہ اور ترقی پسند رویّے کی غمازی کرتی ہے کیونکہ جب ایک شاعر یا فنکار اِقدامائی رویّہ اختیار کرتا ہے تو وہ دراصل اُن خیالات وجذبات کی شدّت کا اظہار کرتا ہے جنہیں وہ حرزِ جاں بنائے رکھتا ہے یا بنانا چاہتا ہے۔ اور ہر دَور میں ایسے ادیب اور شاعر نظر آتے ہیں جو ادب اور زندگی کی نئی قدروں اور ضرورتوں کا شدّت سے احساس کرتے ہیں کیونکہ وہ فن کی ترقی و ترویج کے لئے حرکی نقطۂ نظر اپنانا ناگزیر سمجھتے ہیں۔ ڈاکٹر صفدر حسین کا شمار بھی اسی قسم کے ادیبوں اور شاعروں میں ہوتا ہے اور وہ مرثیہ جیسی صنفِ سخن میں بھی حرکی نقطۂ نظر اپنائے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

# چراغِ مُصطفوی

مولانا غلام اعظم

پروفیسر کرار حسین

ڈاکٹر سید ناظر حسن زیدی

روزنامہ امروز، لاہور

ہفت روزہ پاک جمہوریت

روزنامہ مساوات، لاہور

ناصر زیدی

پروفیسر آغا سہیل

زاہدہ صدیقی

سیارہ ڈائجسٹ

ہفت روزہ رضاکار، لاہور

مرزا رضا حسین

سید فیضی

مولانا غلام اعظم

# نذرِ خلوص

دی شب چو بادِ لطف ز راہِ سخن وزید　　در دل دمِ بہارِ خلوص از لبت رسید
آں راز کر قنوطِ بصیرت رہا نہ گشت　　گوشِ نظر ز گفتۂ تابِ رُخت شنید
آں مے کہ گوشِ ہوش کشید از کلامِ تو　　آورد مستیش بہ درِ ہوش دیں کلید
حمد و سلام و مرثیہ و نوحہ زِ تو　　دم ہائے دیں بیافت از آں نفخۂ جدید
ذکرِ حسینؑ مثلِ یمِ آبِ ذوالفقار　　آمد برائے غرقِ دمِ شوکتِ یزید
گیر از دلِ فقیر دُعائے قرارِ جاں　　دارم نہ بہرِ نذر دِگر نکتۂ فقید

آخر حضورِ تو بکنم نذر، حرفِ شوق
اعظمؔ فقط گدائے دمِ جاں نوازِ ذوق

جہلم۔ ۲۶ مارچ ۱۹۷۰ء

پروفیسر کرار حسین
وائس چانسلر بلوچستان یونیورسٹی
کوئٹہ

# تاثّرات

مرثیہ کی وہ شکل جس کو ہم کمال کے درجے پر میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کے کلام میں دیکھتے ہیں، تہذیب کے ایک مخصوص دور سے متعلق ہے۔ اودھ کی یہ تہذیب، اپنے دائرے میں بہت تنگ لیکن اپنے حدود کے اندر مکمل تھی۔ اسی تہذیب کے گرم و مرطوب ماحول میں مرثیہ ایک مذہبی تقریب سے پھوٹ کر عظیم ادب کی صورت میں نمودار ہوا، اور ان روایات نے جو مرثیہ کی تعمیری ساخت کے لئے خام مواد کے طور استعمال ہوتی تھیں، اس تہذیب کی مرکزی ..... (HYTH) کا مقام حاصل کرلیا۔ اور ان ہی کے ذریعے مرثیہ اس تہذیب کی معاشرت، اقدار، اور نظریۂ حیات اور اس کی تقدیر کا آئینہ دار بن گیا۔

سوقیانہ اور عامیانہ زبان سے اپنا دامن بچائے ہوئے، شرفا کے روزمرّہ اور محاورے پر مبنی (اور شرفا ہی اس تہذیب کا فعال اور غالب عنصر تھے) مرثیہ کی زبان ایک ایسا مہذّب اور پختہ ذریعۂ اظہار ہے جس میں زندگی کے مختلف مواقع کا ساتھ دینے کی صلاحیت بھی ہے، اور ایک طرف ثقالت اور بھونڈے پن سے اور دوسری طرف سفاہت اور ہلکے پن سے بچ کر ایک متین اور سنجیدہ روانی بھی ہے۔ ہیئت کے اعتبار سے مرثیہ کا ایک مخصوص سانچہ مقرر ہوگیا تھا جس میں فضائل اور مصائب کے بظاہر متضاد لیکن درحقیقت مربوط اجزا مل کر ایک مخصوص واحد کیفیت پیدا کرتے ہیں اور اسی زبان اور ہیئت کے ذریعے سے مرثیہ گو شاعروں نے روایات کے ذخیرے سے سینکڑوں بلکہ ہزاروں مُرقعے ڈھال لیے۔

کلاسیکل مرثیہ کی ایک چلتی ہوئی تعریف اس طرح کی جا سکتی ہے کہ مرثیہ واقعۂ کربلا اور اُس سے متعلقہ روایات سے تراشیدہ اور تعمیر کردہ، مناسب ہیئت اور مہذب شاعرانہ زبان میں ایک عمل یا واقعے کا وہ مکمل اور مربوط مرقع ہے جس میں انسانیت اور بہیمیت کا تقابل اور تصادم اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ انسانی شرافت کے کرداروں سے فضائل کے ذریعے عقیدت و عظمت کے جذبات اور مصائب کے ذریعے اُن سے یگانگت اور شرکت کے جذبات برانگیختہ ہو کر ایک مخصوص انبساط کی کیفیت پیدا کرتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ وہ ماحول جس میں کلاسیکل مرثیہ پروان چڑھا تھا، تاریخی اعتبار سے ہم سے دُور اور طرزِ احساس کے اعتبار سے بہت ہی دُور ہو گیا۔ پھر کلاسیکل مرثیہ ایک گرم خانے میں پلے ہوئے پودے کی طرح بہت جلد اپنی ارتقائی منازل طے کر کے اپنے درجۂ کمال تک پہنچ گیا۔ ہم جس چیز کو کمال کہتے ہیں، اُس کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اُس کا ماضی تو ہوتا ہے مستقبل نہیں ہوتا۔ جب ایک صنف کے تمام ممکنات بروئے کار آ چکتے ہیں تو اس میں تردد سے کچھ زیادہ حاصل ہونے کی اُمید نہیں رکھنی چاہیے۔ جب ایک خطۂ زمین پر ایک سدا بہار گھنا درخت کھڑا ہو جاتا ہے تو اُس کے سائے میں کسی اور تناور درخت کا پنپنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ میر انیس کے بعد مرثیہ کی تاریخ، کچھ جدتیں پیدا کر کے، میر انیس کے سائے سے بھاگنے کی کوشش اور اس کوشش میں ناکامی یا جزوی کامیابی کی داستان ہے۔

یہ موقع اِن جدتوں کا جائزہ لینے کا نہیں ہے، نہ مجھے اِس موضوع سے کوئی دلچسپی ہے۔ کبھی جدت کی صورت یہ ہوئی کہ مرثیہ میں "ساقی نامہ" یا "غزلیت" کے مضامین شامل کر دیئے جائیں لیکن ایک ادبی صنف میں وسعت کچھ نئے مضامین داخل کر دینے سے نہیں بلکہ زندگی کے کسی پہلو پر روشنی ڈالنے سے ہوتی ہے۔ کبھی یہ کوشش کی گئی کہ مرثیہ کی ٹکسالی زبان میں مشق کر کے اُس پر قدرت حاصل کر لی جائے۔ یہ حقیقت ہے کہ زبان کا جادو کچھ ایسا جادو ہے، اور لفظ اور معنی کا تعلق کچھ ایسا راز ہے، اور میر انیس کی زبان میں کچھ ایسا اعجاز ہے کہ اُس کے ماہرانہ استعمال کی

داد نہ دینا کفرانِ نعمت معلوم ہوتا ہے۔ پھر بھی زبان کا ماہرانہ استعمال اور ہے، شاعرانہ استعمال اور ہے۔ کہیں مرثیہ میں صحتِ روایات کا زور جدت کے دعوے پر دیا گیا، لیکن شاعری منظوم تاریخ نہیں ہوتی۔ کہیں ایسا بھی ہوا کہ اسباب وعلل کا سلسلہ بنا کر واقعۂ کربلا کی توجیہ اور امام حسینؑ کے فیصلوں کی توضیح کی گئی۔

کلاسیکل مرثیہ میں کہیں اِس قسم کی بحث نہیں ملتی کہ واقعۂ کربلا کیوں ہوا؟ امام حسین نے کوئی فیصلہ کیوں کیا؟ اس واقعے سے کیا نتائج برآمد ہوئے؟ بس اِتنا ہے کہ ایک طفل کا وعدہ ہے جس کو پورا کیا گیا۔ ایک امانت ادا کی گئی۔ اور اس کا صلہ یہ ملا کہ امام حسینؑ، اللہ کے نزدیک، اپنے محبت کرنے والوں کے شفیع ہو گئے۔ بیشک اس سے بلند اور کیا مقام ہوگا کہ ایک بندہ انسانوں اور اللہ کے مابین شفاعت کے مقام پر فائز ہو جائے۔ ان مرثیوں میں امام حسینؑ کی مصلحتوں کو جاننے کا دعویٰ کہیں نہیں کیا گیا۔

کہیں مرثیہ میں بطورِ جدت "فلسفیانہ" مضامین نظم کئے جانے لگے، اور اسی مناسبت سے مرثیوں کے عنوان قائم کیے گئے۔ میر انیسؔ کے مرثیہ کا عنوان یا تو مرثیے کا پہلا مصرع ہوتا ہے، یا یہ کہ مرثیہ کس شہید کے حال میں ہے۔ شعر کی ساخت اور اُس کے تار و پود میں فکر کا ایک منظر ہوتا ہے۔ زندگی کے ہر ویژن (VISION) میں فلسفہ کا ایک پہلو ہوتا ہے۔ ہر بڑا شاعر فلسفی ہوتا ہے لیکن فلسفیانہ مضامین نظم کر کے کوئی شاعر، بڑا شاعر نہیں ہوا۔ فلسفیانہ مضامین کو اپنی نظم کا سرمایہ بنانا، اس امر کی دلیل ہے کہ شاعر اپنی نظر کی کمزوری اور کوتاہی کی وجہ سے زندگی کو براہِ راست دیکھنے کی سکت نہیں رکھتا، اور اُس کو سمجھنے کے لئے کچھ خیالات کا سہارا ٹٹول رہا ہے۔ اس کے برخلاف میر انیسؔ ہمیں زندگی کے میدان میں لے جا کر کھڑا کر دیتے ہیں۔ بڑا شاعر زندگی کا مشاہدہ اور تجربہ کرواتا ہے، زندگی کے متعلق بحثیں نہیں کرتا۔

کبھی مرثیہ میں تبلیغ کا رنگ دیا جاتا ہے۔ یا تو یہ معذرت ہوتی ہے کہ امام حسین بڑے سمجھ دار آدمی تھے، یا یہ پراپیگنڈا ہوتا ہے کہ امام حسین کا کسی انسان سے مقابلہ نہیں ہے۔ مثلاً

کو کسی وکیل کی ضرورت ہے نہ پی آر اَو (P.R.O.) کی۔

کبھی مرثیہ کا موضوع اصلاحی اور انقلابی ہوتا ہے۔ اور اس بات کی تلقین ہوتی ہے کہ ہر شخص حسینؑ ابنِ علیؑ بن جائے۔ اگر ہر شخص حسینؑ ابنِ علیؑ ہو جائے تو وہ حسینؑ ابنِ علیؑ ہی کیا ہوئے۔ کلاسیکل مرثیہ کے امام حسینؑ کی خصوصیت ہی اُن کی انفرادیت بلکہ احدیت (ONE-NESS) ہے۔ انسانی شرافت کا عین یا آئیڈیا (IDEA) تو ہر آئیڈیے کی طرح واحد ہی ہوتا ہے۔

ظاہر ہے کہ ان تمام جدتوں سے مرثیہ کی صنف میں کوئی نامیاتی تبدیلی یا زندہ روایت کی ترقی ممکن نہیں فلسفیانہ مضامین اختیار کرنے سے زبان کی لطافت اور متانت کی بجائے نام نہاد عالمانہ یبوست اور ثقالت آجاتی ہے۔ اور جہاں کہیں شاعر ان جھمیلوں سے پلٹ کر پھر مرثیہ کی شاہراہ کی طرف رجوع کرتا ہے تو میر انیسؔ کی آواز کی بازگشت آنے لگتی ہے۔ اور مصائب کا حصہ تو باقی حصّوں سے بالکل ہی میل نہیں کھاتا، بلکہ الگ سے چپکا ہوا نظر آتا ہے۔

یہ باتیں میں نے کسی تنقیص کی نیت سے نہیں کیں۔ خدا گواہ ہے کہ میرے دل میں جدید مرثیہ گویوں کا بڑا احترام ہے۔ مقصد محض اُن مُشکلات کا ذکر کرنا ہے، جن سے آج کل کا مرثیہ گو، لازمی طور پر دوچار ہوتا ہے۔ بلا شک اس زمانے میں مرثیہ لکھنا بڑے حوصلے کا کام ہے۔ اور جو شخص خوش اسلوبی کے ساتھ اس کڑی منزل سے گزُر جائے وہ صرف ہماری داد ہی کا مستحق نہیں ہے بلکہ اُس کا ہمارے اوپر ایک طرح کا احسان بھی ہے۔

ڈاکٹر سیّد صفدر حسین نے جب اپنے نو تصنیف مرثیہ "چراغِ مصطفوی" کا مسودہ میرے پاس بھیجا اور مجھ سے اس پر مقدمہ لکھنے کی فرمائش کی تو میں نے اُسے بڑے شوق سے پڑھا۔ میں نے محسوس کیا کہ چونکہ موصوف مرثیہ کی تمام تاریخ پر بڑی گہری نظر رکھتے ہیں اس لیے محولۂ بالا تمام مشکلات سے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ عہدہ برآ ہونے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ اُنھوں نے اپنے مرثیہ کے لئے ایک سیدھا سچا راستہ اختیار کیا ہے۔ مختصراً یہ کہ فنکار ازل کے نوادراتِ وجود کی طرف اشارہ کرکے، تخلیقِ آدم اور آدمی کے صاحبِ ایقان ہو کر انسانیت

کی منزل تک ارتقا کی تمہید باندھی ہے:

غازۂ چہرۂ تخلیق ہے انساں کا ظہور
رونقِ صحنِ چمن سنبل و ریحاں کا ظہور
وجہِ بالیدگیٔ رُوح ہے ایماں کا ظہور
مگر آسان نہیں صاحبِ ایقاں کا ظہور

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں اِنساں ہونا

انسانی فطرت میں نار و نور اور ظلم و کرم کی متضاد صفات کا ذکر کر کے انبیاء کے نورانی سلسلے کو باعثِ تخلیقِ محمد مصطفےٰ تک لے آئے ہیں:

خطِّ پیشانیٔ آدمؑ میں جو محفوظ تھا نور
چہرۂ ختمِ رسالتؐ میں ہوا اُس کا ظہور
جگمگانے لگا بطحا کا شبستانِ شعور
وادیٔ جہل سے ہونے لگی ظُلمت کافور

حوصلے خاکِ قدم کے حدِ امکاں سے بلند
شعلۂ طُور ہوا سینۂ فاراں سے بلند

اور اس کے بعد چراغِ مصطفوی کے نُور کو آگے بڑھایا ہے، اور پھر زمانے کے انقلاب اور ظلمت کے پھیلنے کا ذکر چند بندوں میں کیا ہے:

جب نہ اعمال میں کچھ فرقِ بد و نیک رہا
کھُل کے ہونے لگے احکامِ الٰہی رسوا
گھونٹا جانے لگا انصاف و شرافت کا گلا
زورِ اسلام گھٹا، جذبۂ الحاد بڑھا

رُوحِ اسلام میں شاہی کی جو لعنت آئی
جانشینِ شہِ لولاک کو غیرت آئی

اِسی ظلمت سے "چراغِ مصطفوی" کا مقابلہ، اس مرثیہ کا اصل موضوع ہے۔

اب ایک طرف امام حسینؑ کا مدینہ سے سفر اور جنابِ مسلمؑ کی کوفہ کو روانگی اور دوسری طرف ظُلمت کی طاقتوں کا مزید شدّت اختیار کرنا۔ مدینہ کی سازشوں اور کوفہ میں سیاست کے رنگ کے متغیّر ہونے کا سلسلہ چلتا ہے اور امام حسینؑ وقت کو بدلنے والے عزم کو لے کر اپنا سفر شروع کرتے ہیں:

عشق کے ہاتھ میں ہے جن کے اِرادوں کی زمام
گوشۂ امن میں ملتا نہیں اُن کو آرام
بڑھے رَد کر کے طرمّاح کی دعوت کو اِمام
لے کے موت آئی حیاتِ اَبدی کا پیغام

جادۂ عزم مُڑا، کرب و بلا کی جانب
سَر بکف عشق چلا کُوئے وفا کی جانب

یہاں تک کہ سلسلۂ کلام، ظُلمت و نُور کی رزمگاہ تک پہنچ جاتا ہے۔ اِس مقام پر جنابِ اِمامؑ حضرت عباسؑ کو آنے والے واقعات کی اطلاع دیتے ہیں، اور یہیں شاعر ہدیۂ عقیدت پیش کرتا ہے:

تیرے دامن کی ہَوا، ضامنِ تطہیرِ حیات
تیرے چہرے کی ضیا آئینۂ ذات و صفات
تیرے اَنفاس میں ہے نکہتِ گلزارِ نجات
مُنحصر تیرے اشارے پہ ہے عالم کا ثبات

خاک اور خون میں، ہاں، قافلہ غلطاں ہو جائے
بخشش اُمّتِ مرحوم کا ساماں ہو جائے

پھر امام حسینؑ کے اصحاب و انصار کا ذکر ہے، شبِ عاشورا کی عبادتیں ہیں، صبح ہوتے جنگ سے پہلے امام حسینؑ کی دُعا ہے۔ فوجِ حسینی کے پہلے شہید اور آخری شہید کا ذکر کر کے شاعر فوج کا معرکہ ختم کرتا ہے، اور پھر امام حسینؑ کا پُر ہدایت رجز اور جہاد اور جنگِ حُجت کے بعد شہادت کی طرف رجوع۔ کا عجیب و غریب بند ہے!

دیکھ کر تیغ یداللہ سے آباد نیام
پھر سے آندھی کی طرح ٹوٹ پڑا لشکرِ شام
گھر گئے فوج کے زرغے میں شہنشاہِ انام
ہاتھ اُٹھا کر کیا کُفار کے نیزوں نے سلام
سائے میں لے لیا فولاد کی دیواروں نے
جسمِ معصوم پہ سجدے کئے تلواروں نے

اس کے بعد شاعر کا سلام ہے:

فدیۂ راہِ ہدایت، تری عظمت کو سلام
تیرے ایمان و عقیدت، تری طاعت کو سلام
عابدؑ و زینبؑ و کلثوم کی ہمّت کو سلام
مختصر یہ ہے کہ اُس گھر کی قیادت کو سلام
جس میں قائم ہوا اِک سلسلہ قربانی کا
ماحصل جس کو کہیں عظمتِ انسانی کا

اور اُمّت کے لئے دُعا، اور اسی پر مرثیہ ختم ہو جاتا ہے۔

قابلِ توجہ ایک بڑے سلیقے کی بات یہ ہے کہ شاعر نے ہر جزو کو ایسا مناسب طول دیا ہے اور اس طرح مربوط کیا ہے کہ مرثیہ کی کُلّیت اور تناسب، بجائے دبنے کے اُبھر کر سامنے آجاتے ہیں۔ مثلاً بہت مختصر تمہید کے بعد شاعر اپنے مرکزی موضوع یعنی چراغِ مصطفویؐ تک

آجاتا ہے۔ تمام دن کے جہاد میں محض حضرتِ حُر اور حضرتِ علی اصغر کی شہادت کا ذکر کرکے تمام معرکے کی ابتدا اور انتہا کر دی ہے، کیونکہ شاعر کو بہت جلد امامِ حسینؑ کے جہاد اور اُن کی شہادت تک پہنچنا تھا۔ کسی مقام پر بھی توجہ مرکزی موضوع سے بھٹکنے نہیں پاتی۔

ایک اور قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ چونکہ مرثیہ میں نورِ ہدایت کا ذکر ہے، اِس لئے مصائب کے حصّے میں پھیلاؤ نہیں ہے بلکہ بیجا طول دینے کے بجائے مرثیہ کو دُعا پر ختم کر دیا ہے، اور یہی خاتمہ اس مرثیہ کے لئے مناسب بھی تھا۔

زبان بھی موضوع کی مناسبت کا حق ادا کرتی ہے۔ نہ اس میں بیجا صنعت کاری ہے، نہ ثقالت ہے، نہ کسی کی نقّالی کی کوشش کی گئی ہے، نہ صنعتوں سے بوجھل ہے، نہ حُسن اور لوچ سے عاری!

آخری بند کے آخری شعر میں صفدر صاحب نے دُعا مانگی ہے:

خاتمِ شعر کا ہر لفظ نگین بن جائے
فرشِ قرطاس مرا عرشِ بریں بن جائے

میں اِس دُعا پر آمین کہتا ہوں!

۱۴۔ نومبر ۱۹۷۳ء

ڈاکٹر سید ناظر حسن زیدی
پنجاب یونیورسٹی
لاہور

# لمعات

خیر و شر کی آویزش، ظلمت و نور کی کشمکش اور حق و باطل کی ستیز اُسی وقت سے ہے جب سے یہ کائنات خلق ہوئی۔ اُس لمحے سے آج تک یہ مُتصادِم قوتیں ایک دوسرے کے خلاف صف بستہ ہیں۔ اگرچہ بعض دیدہ وروں نے جو کثرت میں وحدت اور تضاد میں اتحاد کا جلوہ دیکھتے ہیں۔ ان دونوں قوتوں کو ذاتِ واحد کی کرشمہ سازی سے تعبیر کیا لیکن جو لوگ تصوّف اور فلسفے کی مُوشگافیوں سے قطع نظر کر کے شرع و آئین کو مدارِ کار سمجھتے ہیں وُہ فکر و نظر کی ان بھول بُھلیّوں میں داخل نہیں ہوتے اور حق و باطل کو دو مختلف و مُتحارب چیزیں سمجھ کر پہلی سے تمسّک کرتے ہیں اور دوسری سے اجتناب۔ ان دونوں گرُوہوں میں کبھی مفاہمت نہیں ہوتی۔ یہ ایک دوسرے سے الگ رہتے ہیں اور صرف اُس وقت قریب آتے ہیں جب ایک دوسرے کے اِستیصال کا فیصلہ کر لیتے اور اسے تباہ کرنے پر تُل جاتے ہیں۔ بدلتے ہوئے حالات کے تحت ان قوّتوں کے پلّے اُٹھتے جُھکتے رہتے ہیں۔ بلکہ اکثر یوں ہوتا ہے کہ سازو سامان اور تعداد کے عناصر باطل کی طرف جمع ہو کر حق کے پہلو کو دبانا چاہتے ہیں لیکن مردانِ حق جن کا شوق ہمیشہ "رقیبِ سروساماں" رہتا ہے، بے برگی و قلّت کے باوصف باطل کے خلاف صف آرا ہو کر حقیقت و مجاز کا فرق دکھا دیتے ہیں۔ آدمؑ و ابلیس، موسیٰؑ و فرعون، ابراہیمؑ و نمرود، محمدؐ و بوجہل انہی قوّتوں کے مظاہر ہیں جو اپنے اپنے زمانے میں اِن مُتضاد عناصر کی نمائندگی کر گئے دونوں کے پَیرو ہر زمانے میں ایک دوسرے سے اُلجھتے رہے اور یوں ہی اُلجھے جائیں گے کیونکہ لطافت کثافت کے بغیر

جلوہ پیدا کر نہیں سکتی" اور حق کا چراغ باطل کی ظلمت کے بغیر پوری ضو نہیں دے سکتا۔ شاید مشیت کا اشارہ بھی ہے کہ خیر کی خوبی نمایاں کرنے کے لئے شر کا وجود قائم رکھا جائے۔ اسی لئے ظلم و جور کی گھٹا ٹوپ تاریکی میں عدل و احسان کی شمعیں اور زیادہ فروزاں ہوتی ہیں نخوت و پندار کے گنبد میں غیرت و خودداری کا ہمہمہ اور زیادہ گونجتا ہے اور کفر و عصیاں کی سیاہی میں چراغ حرم کی تابانی اور زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے۔ یہ تصادم یوں ہی جاری ہے، یوں ہی قائم رہے گا، بقول حکیم امت ؎

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی
حیات شعلہ مزاج و غیور و شور انگیز
سرشت اس کی ہے مشکل کشی، جفا طلبی

گویا حکیم الامۃ کی نظر میں غیرتِ حق، سرگرمیٔ حیات کی بلکہ حیاتِ دوام کی علامت ہے اور باطل اُن کے نزدیک جمود و فتور اور مرگِ دوام کا آئینہ دار ہے۔ باطل کے ہاتھ میں دار و رسن، زہرِ ہلاہل اور خنجرِ خونریز جیسے بہت سے ہتھیار ہیں لیکن حق اُن کے مقابلے کے لئے غیرت و ہمت، جانبازی و جرأت اور شوقِ شہادت سے مسلح ہو کر بے خوف آتا ہے۔ ادھر مکر و دغا ہوتے ہیں اُدھر وفا و دعا ادھر سلطنت کا طمطراق، اُدھر فقیرِ غیور کی شانِ بے نیازی۔ یہاں شرارِ بولہبی، وہاں چراغِ مصطفوی۔

شرار اور چراغ کی یہ آویزش بہت پرانی ہے۔ تاریخِ مذاہب لکھنے والے اس کی ہزاروں داستانیں سناتے ہیں لیکن سب سے زیادہ صبر آزما اور ہمت آموز داستان وہ ہے جسے زمانے نے محمدؐ عربی کی زبان سے سنا اور جسے اُس صاحبِ معراج کے اہل بیتِ اطہار نے آزمائش و ابتلا کی خطرناک ساعتوں میں بہ آوازِ بلند سنایا۔ اس آواز کو دبانے کے لئے حکومتوں نے تمام تدبیریں کیں۔ جاہ و منصب کے سنہرے فرمان، زہرِ ہلاہل کے شیشے، سیم و زر کی تھیلیاں، مُلک و مال کے پروانے اور سب سے آخر میں خنجرِ خونخوار کی دھار لیکن ان تمام آزمائشوں میں اہلبیتؑ اطہار پورے اُترے۔

نہایت سخت اور بے انتہا ہولناک وہ امتحان تھا جسے حیدرِ کرّار کے شجیع دلیر بیٹے امام حسین علیہ السلام نے کربلا میں دے کر غیرتِ انسانیت کی لاج رکھ لی اور جریدۂ عالم پر خون کی مُہریں لگا کر حیاتِ دوام اور رضائے معبود کی سند حاصل کی۔ مورخوں نے اس واقعے کو شرح و بسط سے لکھا ہے لیکن عرب، ایران اور پاکستان و ہند کے مرثیہ نویسوں نے بھی اپنے فن سے کام لے کر اس واقعے کی تصویریں کھینچی ہے کہ ایمان کی روح تازہ ہوگئی۔ اس سلسلے میں فرزدق، دعبلِ خزاعی، محتشم کاشی، ہاشم، کاظم، ضمیر، خلیق، مونس، انیس، دبیر، فصیح وغیرہ کے نام بڑے اعتماد سے لئے جا سکتے ہیں۔ شمالی ہند کے یہ آخری چھ بزرگ اٹھارویں اور اُنیسویں صدی کا تبرک تھے جن کا کلام آج بھی زبانوں پر بلکہ دلوں کی لوح پر نقش ہے۔

بیسویں صدی میں بھی مرثیے کی روایت برابر قائم رہی۔ نجم آفندی، آلِ رضا، نسیم، زیبا وغیرہ نے اس صنف کے ساتھ پورا انصاف کیا۔ جوش ملیح آبادی نے مرثیے میں انقلاب کا رنگ اس شدت سے بھرا کہ ادبی خوبیوں کے باوجود اور پورے شاعرانہ محاسن کے باوصف اُس میں مقصدیت کا شائبہ داخل ہوگیا۔ یہ بات اس لحاظ سے قابلِ گرفت نہیں کہ زورِ بیان اور جوشِ کلام میں یہ صورت بالعموم پیدا ہو جاتی ہے۔ جوش کے دوش بدوش جس باکمال کے کلام سے عزائیہ ادب کا چراغ روشن ہے وہ ڈاکٹر سید مقدر حسین ہیں جو گذشتہ پندرہ سال سے اپنی تخلیقات اہلِ نظر کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ زیرِ نظر مرثیہ "چراغِ مصطفوی" اُنہی کا شاہکار ہے جس میں مرثیت کے علاوہ بیانیہ شاعری، توصیف نگاری اور منظر کشی کا حق ادا ہوا ہے۔ زیادہ قابلِ توجہ یہ امر ہے کہ اُنھوں نے تاریخی واقعات اور اُن کے منطقی نتائج کا تجزیہ کر کے واضح کیا ہے کہ جنابِ رسالتمآبؐ کی رحلت کے بعد اہلِ بیتِ اطہار جن مشکلات و مصائب سے دوچار ہوئے وہ حالات کی رفتار کا قدرتی نتیجہ تھے۔ اہلبیتؑ کی عظمت یہی ہے کہ وہ اُن صبر آزما حالات میں ثابت قدم رہ کر اُسوۂ رسولؐ پر قائم رہے اور اپنی جانیں تک قربان کرنے سے دریغ نہ کیا۔ اُن کی انہی قربانیوں کی بدولت دینِ مصطفویؐ کا چراغ روشن رہا ورنہ ملوکیت کی آندھی اُسے گُل کر دیتی۔ رسولِ مقبول کی رحلت کے بعد اربابِ زمانہ

نے زر و جاہ کی ہوس میں جس طرح فقرِ محمدیؐ کو ترک کر کے شاہی کی لعنت اختیار کی اور امامِ حسینؑ نے منصبِ امامت کے تقاضے سے بنی ہاشم کی سُنّت کو جس شان سے قائم رکھا اُس کا بیان صفدر صاحب نے بڑی وضاحت سے یوں کیا ہے ؎

آلِ ہاشم سے جو تھا کُفر نہادوں کو عناد
چاہتے تھے کہ زمانے میں ہو برپا وہ فساد
جس سے کمزور ہو تعلیمِ نبیؐ کی بنیاد
کر دیں اسلام کے معمار کی محنت برباد

اِسی جذبے نے کیا برسرِ پیکار انھیں
نہ رہا رسمِ شرافت سے سروکار انھیں

وہ زمانے کا تزلزل وہ سیاست کا فتور
عقلِ کوتاہ کا وہ جہل، وہ ذہنوں کا قصور
حق کُشی عام، شریفانہ خصائص سے نفور
رجسِ اعمال کا اک پردہ امارت کا غرور

موجزن تھی ہوسِ تاج نگیں سجدے میں
ذہن بُت خانہ عقائد کا، جبیں سجدے میں

تاریخی اور سیاسی تجزیے کی ایسی مثالیں اس مرثیے میں جا بجا موجود ہیں۔ اس قسم کے سیاسی تجزیے ہمارے بعض مؤرخوں نے بھی کیے ہیں۔ ابنِ خلدون اس کی مثال ہے لیکن جنابِ رسالتمآبؐ کی وفات کے بعد امامِ حسین کی شہادت تک سیاست نے جو پہلو بدلے اور جو انداز اختیار کیے، اُن کا تذکرہ مؤرخوں نے کھُل کر نہیں کیا۔ لالچ، احتیاط، عداوت اور عصبیت نے مؤرخوں کے قلم اور خطیبوں کے مُنھ پر مُہریں لگا دی تھیں حق گوئی خال خال تھی۔ پچھلی صدی کے مرثیہ نگاروں نے بھی اس طرف توجہ نہ کی۔ لیکن عہدِ حاضر کا انسان محض واقعات سُننے پر قناعت نہیں کرتا۔ وہ واقعات

کی زنجیر کی تمام کڑیاں شمار کرتا اور اُن کے سلسلے کو بہ نظرِ غور دیکھتا ہے۔ یہ زمانہ استدلال، تفکر اور تعقل کا ہے، یہی تفکر اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ تخریب کے بعد تعمیر کی اور فساد کے بعد اصلاح کی تدبیر کی جائے۔ جدید مرثیہ نگاروں نے اس مطالبے کی تسکین کے لئے تعمیری و اصلاحی عناصر کو مرثیے میں بڑی ہنرمندی سے شامل کیا ہے۔ یہاں صفدر صاحب کے زیرِ نظر مرثیے کا اقتباس پیش کیا جاتا ہے جس سے روشن ہوگا کہ انھوں نے اصلاح و تعمیر کا یہ فریضہ کس خوبی سے ادا کیا ہے:-

جب نہ اعمال میں کچھ فرقِ بد و نیک رہا
کھل کے ہونے لگے احکامِ الٰہی رسوا
گھونٹا جانے لگا انصاف و شرافت کا گلا
زورِ اسلام گھٹا، جذبۂ الحاد بڑھا

روحِ اسلام میں شاہی کی جو لعنت آئی
جانشینِ شہِ لولاک کو غیرت آئی

قابلِ غور تھی اسلام کی یہ صورتِ حال
قوم کی خیرہ سری، وقت کی بگڑی ہوئی چال
دلِ شبیرؑ میں آیا جو ہدایت کا خیال
اپنے خالق سے کیا جذبۂ صادق نے سوال

تو ہو خوشنود تو اصلاح کی تدبیر کروں
خون سے دامنِ آفاق کی تطہیر کروں

مجھ سے توہینِ شریعت نہیں دیکھی جاتی
بیکسیِ بشریت نہیں دیکھی جاتی
نور پر یورشِ ظلمت نہیں دیکھی جاتی
حق پہ باطل کی حکومت نہیں دیکھی جاتی

اپنا حق مانگتا ہے مجھ سے اب وجد کالہو
مضطرب ہے مری رگ رگ میں محمدؐ کا لہو

بیسویں صدی کا ایک رجحان جو قریب قریب ہر فن پر چھا رہا ہے یہ ہے کہ فنکار سے نزاکت و لطافت کے بجائے صلابت کا اور تجرید کے بجائے مقرونیت کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ پچھلی صدی کی تحریکِ افادیت (UTILITARIANISM) اب محض بحث کا موضوع نہیں بلکہ عمل کا میدان بنی ہوئی ہے۔ فن برائے فن کی جگہ فن برائے حیات کا مطالبہ عام ہے۔ اسی لئے دورِ جدید کا مرثیہ گو واقعہ نگاری کرتے وقت صداقت، خلوص اور حقیقت کو کبھی پس منظر کے بطور بیان کرتا ہے اور کبھی پیش منظر میں لے آتا ہے۔ پچھلی صدی کے مرثیہ نگار بھی اس ضرورت سے بے خبر نہ تھے۔ دبیرؔ نے کم لیکن انیسؔ نے اس اصول کو ملحوظ رکھا ہے اور اُس جذبۂ بیتاب کو جو امامؑ عالی مقام کے دل میں فروزاں تھا، استعاروں کے ذریعے مجسم صورت میں پیش کیا ہے۔ عاشور کی صبح کو تیاری نبرد کے موقع پر جو امام حسینؑ اور اُن کے وفادار رفیقوں کے لئے مقامِ امتحان بلکہ معراجِ کمال تھا، انیسؔ نے اِن جانبازوں کے شوقِ شہادت کو یوں ظاہر کیا ہے:۔

ہاں غازیو یہ دن ہے جدال و قتال کا
یاں خوں بہے گا آج محمدؐ کی آل کا
چہرہ خوشی سے سُرخ ہے حیدرؑ کے لال کا
گزری شبِ فراق، دن آیا وصال کا

ہم وہ ہیں غم کریں گے مَلک جن کے واسطے
راتیں تڑپ کے کاٹی ہیں اس دن کے واسطے

لیکن جدید مرثیہ لکھنے والوں نے اِس جذبے کو نمایاں کرنا اپنا فرض بنا لیا ہے۔ قوم کے حق میں یہ نیک فال ہے۔ دَورِ حاضر کا انسان اگرچہ تامّل و تفکّر کو شعار بنا رہا ہے اور جذبات کی حکومت سے آزاد رہنے کو بہتر سمجھتا ہے لیکن جذباتیت کی گرفت سے ہرگز آزاد نہیں۔ جذباتی شیفتگی اور شدّت اُس پر غلبہ پا ہی جاتی

ہے۔ انسان کے اس فطری میلان کی تسکین کے لئے دوسرے فن کاروں کی طرح جدید مرثیہ گو شعرا بھی واقعات بیان کرتے وقت جذباتیت کا رنگ گہرا کر رہے ہیں پچھلی صدی میں انیسؔ کے مراثی کی بدولت اور دورِ حاضر میں علامہ اقبالؔ کے اشعار کے سہارے بعض الفاظ کو شاعری میں نہایت محترم مقام حاصل ہوا ہے اب عشق، وفا، حق، یقین، مردِ خدا، موت، اِمتحان، قافلہ، فقر وغیرہ کے معانی پہلے سے بہت زیادہ معزز محترم ہیں۔ جذباتیت نے واقعات پر ہی نہیں بلکہ اس قبیل کے الفاظ پر بھی احترام اور تقدس کی سنہری جلی ڈال دی ہے جس میں سے اِن چیزوں کا جمال چھن چھن کر اور زیادہ دلفریب نظر آتا ہے۔ جدید مرثیہ نگاروں نے اس میلان کی جس طرح تسکین کی ہے اُسے سمجھنے کے لئے "چراغِ مصطفویؐ" کے یہ بند ملاحظہ کیجئے:-

عشق کے ہاتھ میں ہو جن کے ارادوں کی زمام
گوشۂ امن میں ملتا نہیں اُن کو آرام
بڑھے رَد کر کے طرّاح کی دعوت کو امامؑ
لے کے مَوت آئی حیاتِ ابدی کا پیغام
جادۂ عزم مُڑا کرب و بلا کی جانب
سَر بکف عشق چلا کوئے وفا کی جانب

دوسری ماہِ محرّم کو ہوا ختم سفر
چلتے چلتے ہوئی اک دشتِ پُرآفت میں سحر
علقمہ پر جو گئی سیدِ والا کی نظر
آپ نے چہرۂ عبّاسؑ کو دیکھا مُڑ کر
ہنس کے فرمایا کہ لو! آ گئی منزل بھائی
امتحاں گاہِ وفا ہے یہی ساحل بھائی

ہاں سُنو! چرخ سے آواز یہ آتی ہے
گریۂ بنتِ پیمبرؐ کی صدا آتی ہے

خُلد سے کان میں نانا کی دُعا آتی ہے
دشت میں گلشنِ جنّت کی ہَوا آتی ہے

اپنا حق بہرِ نمو، مانگ رہی ہے مجھ سے
یہ زمیں، میرا لہو مانگ رہی ہے مجھ سے"

آپ نے اندازہ کیا کہ جذباتیت نے واقعات کے حُسن کو کتنا بڑھا دیا ہے۔ جذباتیت کا یہ ندّیں نقاب مرثیے کے چہرے پر "زلف سے بڑھ کر کُھلا" کے معنی روشن کرتا ہے ـــ یہاں تجرید کے بجائے تجسُّم (PERSONIFICATION) ہے جو ادراک و احساس کی نازک شاخوں کو تناور درخت بنا کر نگاہ کے سامنے لاتا ہے۔ فارسی شاعری میں تجسُّم کا دستور فغانی نے قائم کیا تھا جسے نظیری اور عرفی نے خصوصیت سے فروغ دیا اور استعاروں کی مدد سے جذبات و احساسات کے نہایت نازک پہلوؤں کو محسوس و مجسّم بنا کر پیش کیا۔ اُن کا یہ شیوہ بے حد مقبول ہوا۔ بیسویں صدی کے اُردو شعرا بالخصوص مرثیہ گو شعرا فارسی کی اس روایت سے فائدہ اُٹھا کر تجسُّم کو خوب برت رہے ہیں۔ انسان کی نظر ہمیشہ سے "خوگرِ پیکرِ محسوس" رہی ہے۔ فن کار کو بھی اجازت ہے کہ وہ محسوسیت و مقرونیت کے اس شوق سے فائدہ اُٹھا کر اپنے فن کو چمکائے۔ ڈاکٹر صفدر نے اسی حربے سے کام لے کر احساسات کو بلکہ تفکّر و تخیّل کو محسوس پیکر اور کہیں کہیں انسانی پیکر بخشا ہے۔ ذیل کا بند پڑھیے جس میں امامِ عالی مقام اپنے وفادار بھائی عباسؑ علمدار کو آنے والے واقعات سے باخبر کرتے ہیں:۔

یہ خبر دی ہے شہِ عُقدہ کُشا نے عباسؑ
ہوں گے تاریخِ وفا تیرے فسانے عباسؑ
تجھ کو بخشا ہے عَلم اپنا خدا نے عباسؑ
لنگرِ کشتیِ دیں ہیں ترے شانے عباسؑ

نُصرتِ حق میں ہے تعجیل ابھی سے اِن کو
چومتے رہتے ہیں جبریلؑ ابھی سے اِن کو

جدید مرثیے کی ایک اور خصوصیت اس کی صلابت اور کرارا پن ہے۔ یہ صنفِ شاعری اب محض گریۂ بکا کا سامان نہیں بلکہ شہامت و شجاعت اور ذوقِ شہادت کا پیغام بنتی جا رہی ہے۔ یہی وہ خصوصیت ہے جس کی بدولت اُن مسلمانوں کو جنہیں "پیغامِ محمدؐ کا پاس نہیں" دوبارہ روحِ اسلام اور شریعتِ خیرالانامؐ سے آشنا کر سکتے ہیں۔ ان مرثیہ نگاروں کو یہ احساس ہو چلا ہے کہ محض رونا رلانا مآلِ مجلس نہیں خطیب یا مرثیہ گو کا صحیح منصب یہی ہے کہ سُننے والے جب مجلس سے اُٹھیں تو اُن کے کانوں میں پیغامِ محمدؐ گونجتا ہو اور دل میں شوقِ شہادت رقصاں ہو۔ بے روح گریہ و زاری اور افسردگی سے بھری ہوئی اشک فشانی نہ جنّت میں لے جا سکتی ہے، نہ دُنیا میں باعزّت مقام دے سکتی ہے۔ حضرت جوشؔ ملیح آبادی نے یہ بات بڑی لطافت سے کہی تھی ؎

اشک بے سوزِ دروں پانی ہے ایماں کی قسم
قلبِ شبنم پر شعاعِ مہرِ تاباں کی قسم

ڈاکٹر صفدر نے بھی یہ نکتہ تشبیہ کی مدد سے سمجھایا ہے:

ہیچ آنسو ہیں نہ ہو برقِ شہادت جن میں
وہ نگینے ہیں نہیں پرتوِ عظمت جن میں

مُختصر یہ کہ جب تک شہدائے کربلا کے مزاج اور شوقِ شہادت سے آشنا نہ کیا جائے، گریہ و بکا ایک بے روح عمل کی حیثیت رکھتا ہے۔ واقعاتِ کربلا کا بیان اگر شجاعت و شہامت سے محروم ہو اور فقط رونے پیٹنے کی چیز بن جائے تو قوم کے جذبۂ قربانی و مردانگی کے حق میں زہر ہے۔ گذشتہ ڈیڑھ سو سال کی بے معنی سینہ کوبی اور بے روح گریہ و زاری نے ہمیں جراُت و تہوّر سے بے بہرہ کر دیا ہے۔ وہی قوم جس کے امامؑ کا یہ قول تھا کہ قتل کرنا اور قتل ہو جانا ہماری میراث ہے، مُجادلہ و مقاتلہ سے ناآشنا ہو گئی ہے۔ البتہ ہمارے جدید مرثیہ گو شعرا نے صورتِ حال کا احساس کر کے اپنے کلام میں شجاعت و شہادت کو نمایاں مقام دیا ہے معمولی واقعات کے بیان میں بھی یہ حضرات مردانگی، غیرت اور جانبازی کا رنگ بھرتے ہیں جن باتوں کا ذکر انیسؔ یا دبیرؔ نے سرسری کیا ہے اُنھیں اس گروہ نے جراُت و تہوّر کے ساتھ بیان کیا۔ اِن کے الفاظ میں

محکمی اور صلابت ہے۔ اُن کا لہجہ بلند آہنگ ہے۔ یہاں صرف شاعری کا تقابلی مطالعہ مقصود نہیں بلکہ قدیم اور جدید مرثیہ گو کے مزاجوں کا تقابلی مطالعہ بھی ضروری ہے۔ انیس نے عاشور کی صبح کا واقعہ نظم کیا ہے جب امام حسینؑ اپنے فرزند جناب علی اکبرؑ کو اذان دینے کے لئے اُٹھاتے ہیں۔ بیت یہ ہے ؎

فرمایا سحر قتل کی ظاہر ہوئی بیٹا

اُب اُٹھ کے اذاں دو کہ شب آخر ہوئی بیٹا

اسی مقام کو ڈاکٹر صفدر نے یوں نظم کیا ہے ؎

مسکرا کر کہا اکبرؑ سے اذاں دو بیٹا

عالمِ پیر کو آہنگِ جواں دو بیٹا

ظاہر ہے انیس کے یہاں حُزن وغم کی فضا ہے۔ صفدر نے جوشِ کردار اور نشاطِ کار کی فضا تیار کی ہے اور اذان کو "آہنگِ جواں" کہہ کر اُس کی اہمیت کا احساس دلایا ہے۔ جذبے کی اس بیباکی اور شوقِ شہادت کی اس شدّت نے کلام میں پیغام کا رنگ پیدا کر کے تبلیغ کی شکل اختیار کی ہے۔ ڈاکٹر صفدر کے اکثر مرثیوں میں، بالخصوص "آئینِ وفا" میں تبلیغ کی یہ بالواسطہ لیکن نہایت پُرتاثیر صورت کارفرما ہے۔ "چراغِ مصطفویؐ" میں بھی ایسی مثالیں بہ کثرت ہیں۔ یہاں دو بند درج کئے جاتے ہیں جن میں امام علیہ السلام اپنے بھائی حضرتِ عباسؑ سے ہم کلام اور یقینیٔ موت کے باوجود کمالِ طمانیت سے فرما رہے ہیں کہ موت کی طرف بڑھو تاکہ ہماری شہادت سے پیغامِ محمدؐ زندہ ہو جائے۔ یہاں اس شعلۂ شوق کی لپک دیدنی ہے جو اِن بزرگوں کے دل میں تھا ؎

خیر ہر مرحلہ آسان گذر جائے گا

غم نہیں حفظِ شریعت میں جو سَر جائے گا

خوں بہے گا تو یہ طوفان ٹھہر جائے گا

چہرۂ دینِ نبیؐ اور نکھر جائے گا

روئے اسلام کو گلرنگ بنانے کے لئے

ہاں بڑھو! خون کے دریا میں نہانے کے لئے

سروری ہم سے ہے دُنیا میں، سیادت ہم سے
آج قائم ہے تو معیارِ شرافت ہم سے
سُرخرو کیوں نہ ہو میدانِ شہادت ہم سے
تا ابد جائے گا فیضانِ رسالت ہم سے

خلق میں رازِ مشیّت کے امیں ہیں ہم لوگ
وجہِ تخلیقِ جہاں، نُورِ یقیں ہیں ہم لوگ

حضرتِ عبّاسؑ کے علاوہ اور بہت سے دلاور تھے جو مرنے مارنے کا فیصلہ کرکے امامؑ عالی مقام کے ہمراہ کربلا میں آئے تھے۔ صفدر صاحب نے اُن دلیروں کی تصویریں اس خوبی سے کھینچی ہیں کہ اُن کا جوشِ وفاداری کو اپنے خون میں منتقل ہوتا نظر آتا ہے۔ ذیل کے اشعار سے اندازہ کیجئے کہ شاعر اپنے خیال کے ابلاغ میں بلکہ عقیدے کی تبلیغ میں کتنا کامیاب ہے

ترجمانِ دلِ عبّاسؑ تھا یہ عزمِ جلیل
ہر طرف سے ہوئی اقرارِ وفا میں تعجیل
بہرِ تائید وہ اُٹھے کہ نہ جن کا تھا عدیل
جذبۂ شوق سے سرشار تھی اولادِ عقیلؑ

سب کی خواہش تھی کہ قربان شہِ دیں ہو جائیں
ریش و ملبوس و کفن خون سے رنگیں ہو جائیں

کیسے جانباز تھے کیا شوق تھا کیسا آقا
پَیر جائیں ہو اگر آگ کا حائل دریا
ٹھان لیں دل میں تو دُنیا کا بدل دیں نقشا
عزم و ہمت کے دھنی، پیکرِ تسلیم و رضا

موت سی چیز کو خطرے میں نہ لانے والے
دے کے سر، نازِ مشیّت کے اُٹھانے والے

سب کے سب محوِ عبادت رہے عاشور کی رات
جگمگاتا رہا تقدیس سے ایوانِ حیات
بیچ کر اپنی خوشی مرضیٔ معبود کے ہات
دے گئے تیغ کے سائے میں عبادت کو ثبات
مستعد ہو گئے سب جان سے جانے کے لئے
موت کو بڑھ کے کلیجے سے لگانے کے لئے

شاعر کی نظر میں یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے جانیں دے دے کر انسانیت اور شرافت کی لاج رکھی۔ یہ لوگ اسلام کی روح اور ایمان کا عطر تھے۔ نور و ظلمت اور حق و باطل کی کشمکش میں انہی بہادروں نے موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ایمان و اصول کو قائم رکھا۔ یہ آدمیت کی معراج تھے اور ان سے عظمتِ آدم آشکارا ہوئی۔ ایسے اشخاص صدیوں بعد پیدا ہوتے ہیں اور اگر مرشدِ رومی کی بات تسلیم کی جائے تو چراغ لے کر ڈھونڈھنے پر بھی نہیں ملتے ؎

دی شیخ با چراغ ہمے گشت گردِ شہر — کز دام و دد ملولم و انسانم آرزوست
زیں ہمرہانِ سست عناصر دلم گرفت — شیرِ خدا و رستمِ دستانم آرزوست
گفتم کہ یافت می نشود جستہ ایم ما — گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست

رومی سے پانچ سو سال بعد جرمنی کے مفکر نطشے نے "فوق البشر" کی اصطلاح میں اسی آرزو کا اظہار کیا۔ یہی تمنا مرزا غالبؔ نے اپنے ایک مطلع میں ظاہر کی جسے صفدر صاحب نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ مرثیے کے ایک بند میں تضمین کر دیا ہے۔ وہ آدمیت جسے حالیؔ نے "فرشتے سے بہتر ہے انسان ہونا" ٹھہرایا اور جس کی تفسیر حکیم الامتہ اقبالؔ نے "باخبر شو از مقامِ آدمی" کہہ کر پیش کی، سب انسانِ کامل کے معنی بیان کرتے ہیں۔ دورِ حاضر کا انسان بالخصوص صاحبِ فکر و نظر انسان اب اتنا خود شناس و خود نگر ہو چکا ہے کہ خدا کا اقرار تو کرے یا نہ کرے لیکن عظمتِ آدم کا اعتراف ضرور کرتا ہے۔ مرثیہ گو شاعر کو یہ شرف حاصل ہے کہ وہ انسانِ کامل کا نمونہ پیش کرتے وقت شہدائے کربلا کو معیارِ انسانیت

قرار دیتا ہے اور اُن کو ایمان و عرفان کی صفت سے متصف کرتا ہے۔ اسی ذریعے سے وہ اُن مقدس ہستیوں کو انسانیت کبریٰ کا پیکر ٹھہرا کر اپنا رشتہ پروردگارِ عالم، رسولِ مقبول اور اہلبیتِ اطہار سے جوڑتا ہے۔ انسان کی عظمت کو صفدر صاحب نے نہایت توضیح و تفصیل سے مرثیے کے آغاز میں بیان کیا ہے۔ ذیل کے بند پڑھیے اور اندازہ کیجئے کہ انسانیت کا مرتبہ کتنا بلند ہے۔ ساتھ ساتھ یہ بھی خیال رکھیئے کہ یہی انسان جو ایمان و ایقان کی بدولت خلافت و نیابتِ الٰہیہ کے منصب پر سرفراز ہے جب شیطنت کی طرف مائل ہوتا ہے تو "اسفل السافلین" کے تحت الثریٰ میں جا گرتا ہے کیونکہ مشیّتِ الٰہی نے اس میں خیر و شر کی متضاد صفات ودیعت کر دی ہیں ؎

غازۂ چہرۂ تخلیق ہے انساں کا ظہور
رونقِ صحنِ چمن سنبل و ریحاں کا ظہور
وجہِ بالیدگیِ روح ہے ایماں کا ظہور
لیکن آسان نہیں صاحبِ ایقاں کا ظہور

"بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا"

آدمی لختِ دلِ نار و جگر پارۂ نور
فطرتِ اہرمن و قدرتِ یزداں کا ظہور
خلوتِ رازِ ازل انجمنستانِ شعور
پیکرِ ظلم و کرم، آئینۂ عجز و غرور

پھر بھی ہوتے ہیں فرشتے اسی انسانوں میں
کعبہ جس طرح کئی لاکھ صنم خانوں میں

چھان مارا نگہِ غور نے وشتِ امکاں
صبح کاذب کے دھندلکوں پہ نظر ہے حیراں

راہِ مستقبلِ تاریک میں پھیلا ہے دھواں
صرف ماضی میں ہیں کچھ لوگوں کے چہرے تاباں
ہمہ تن صدق کی قندیل صفا کی قندیل!
یہ جبینیں ہیں کہ ہیں عرشِ خدا کی قندیل!

دوش پر ان کے ہے گو بارِ امانت بھاری
ایک اک خون کے قطرے میں ہے دریا جاری
ان کی جانب نگراں خود ہے جنابِ باری
ان کی قلت سے ہے کثرت پہ وہ ہیبت طاری
کہ انھیں دیکھ کے دل سب کے ہلے جاتے ہیں
حوصلے خاک میں اعدا کے ملے جاتے ہیں

ڈاکٹر صفدر نے ان عظیم انسانوں کے فضائل کو ایک ایک کر کے گنایا ہے۔ کہیں تفصیل و توصیف کے ساتھ اور کہیں فقط ایک مصرعے یا ایک دو لفظوں میں۔ ان کے صدق و ثبات کا یہ عالم تھا کہ شبِ عاشور کو جب امام نے ان سبھوں کو جمع کر کے سمجھایا کہ میں تمہیں اپنی بیعت سے آزاد کرتا ہوں۔ فوجِ مخالف صرف میری جان لینے کی خواہاں ہے لہٰذا تم لوگ میرے ساتھ جان نہ گنواؤ، تو ان بے نظیر سورماؤں نے بیتاب ہو کر بیک زبان کہا کہ ہم آپ کے ساتھ مریں گے۔ بے وفائی کا ارتکاب نہیں کر سکتے۔ ان دلاوروں نے جس طرح رات بھر خشوع و خضوع میں گذار کر صبح کی نماز ادا کی اور پھر جنگ کے لئے تیار ہوئے اُس کا بیان مرثیے میں بڑی تمکین کے ساتھ ہوا ہے ؎

شبنم افشاں جو ہوئی باغِ حسینی میں نسیم
چار سو پھیل گئی عطرِ عقیدت کی شمیم
طاعتِ صبح میں یکجا ہوئے حضرتِ کنیم
بہ جگرداریِ انصارِ رسولانِ قدیم

مطمئن ہو کے مقتلوں سے وہ دیندار اُٹھے
خندہ رو، اپنی شہادت کے طلبگار اُٹھے

اس شوقِ شہادت کی کس زبان سے تعریف کی جائے۔ زندگی میں انسان کو جو دل شکن اور جاں گسل مصائب پیش آتے ہیں اُن میں سب سے روح فرسا مصیبت یہ ہے کہ سن رسیدہ آدمی اپنے جوان بیٹے کو دُنیا سے گزرتے ہوئے دیکھے۔ امامؑ عالی مقام کو بھی ہولناک مرحلہ پیش آیا لیکن اُس دانائے رازِ حیات نے جو دنیا کو "ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی" کا درس دینے آیا تھا، پوری طمانیت کے ساتھ بیٹے کو میدانِ جنگ کی طرف رُخصت کیا۔ اس سلسلے کا ایک بند سُننے کے قابل ہے۔

اِس تلاطم میں برآمد جو ہوا وہ گُلفام
منتظر تھے درِ خیمہ پہ شہِ عرش مقام
کس بشاشت سے لیا آپ نے بیٹے کا سلام
فدیۂ راہِ محبّت کو دیا یہ اِنعام

جسم پر اسلحۂ جنگ سجایا خود ہی
پُشتِ مرکب پہ مجاہد کو بٹھایا خود ہی

(جلوۂ تہذیب۔ مرثیۂ علی اکبرؑ از ڈاکٹر صفدرؔ)

اس دل گداز واقعے کے بعد اُس نفسِ مطمئنہ کو وہ مرحلہ پیش آیا کہ اپنے اہلِ حرم سے بادلِ محزوں رخصت ہو کر میدانِ جنگ میں آیا جہاں اُس کے جگر گوشوں کے لاشے جابجا پڑے تھے۔ ظلم و ستم سے بھری ہوئی اس دنیا میں دل ہلا دینے والے واقعات بہت ہوئے ہیں لیکن جس شقاوت سے امام حسینؑ کو دوچار ہونا پڑا اُس کی نظیر تاریخِ عالم میں نہیں ہے۔ تاریخِ عالم میں کوئی ایسا جری اور جی دار سورما بھی نظر نہیں آتا جو مصائب کے طوفان میں اس ہوش و حواس کے ساتھ اپنے موقف پر قائم رہا ہو یا دشمن سے لڑا ہو۔ سکندر، جولیس سیزر، چنگیز، جلال الدین خوارزم شاہ وغیرہ کی بہادری کے افسانے تاریخوں میں محفوظ ہیں۔ سب کا حال یہ ہے کہ فتح مندی و کامیابی کے وقت تو ہوش و حواس دُرست ہیں اور حوصلہ قائم ہے لیکن

جہاں دو چار شکستوں سے دوچار ہوئے حباب کی مانند ٹوٹ کر رہ جاتے ہیں۔ تاریخِ اسلام میں مولا علیؑ مرتضیٰ کی بہادری مثالی ہے لیکن اگر مقابلہ و موازنہ کیا جائے تو شجاعتِ حسینی کے سامنے شجاعتِ حیدری کوئی حقیقت نہیں رکھتی، یہ سچ ہے کہ علیؑ ابنِ ابی طالبؑ کو بھی بہت سے معرکے پیش آئے۔ بالخصوص جنابِ رسالتؐ مآب کی رحلت کے بعد انھیں بہت صبر آزما مشکلات سے گزرنا پڑا لیکن یہ مشکلات اُن مصائب کا عُشرِ عشیر بھی نہیں جو امامؑ کو پیش آئیں۔ ساٹھ ستر ساتھیوں کا صبح سے دوپہر تک شہید ہو جانا پھر اٹھارہ عزیزوں کا یکے بعد دیگرے آنکھوں کے سامنے خاک و خون میں مِل جانا ایسا صدمہ ہے کہ پہاڑ کی کمر کو بھی توڑ ڈالے لیکن وہ کوہِ استقامت ایسے صدموں کو سہنے کے بعد بھی حواس قائم رکھتا ہے۔ یہاں عقلِ انسانی حیران رہ جاتی ہے اور جذبۂ شجاعت تحسین و آفریں کہتا ہے۔ امامؑ اور ان کے رفیقوں نے طوفانِ حوادث میں سفینۂ اسلام کی ناخدائی جس شان سے کی وہ یقیناً قابلِ ستائش ہے بلکہ جریدۂ عالم پر ہمیشہ کے لئے ثبت ہو چکی ہے لیکن مرثیہ نگاروں نے بھی اِس واقعے کو خونِ جگر سے لکھ کر معجزۂ فن کے بے مثال شاہکار پیش کئے ہیں۔ یہاں مختلف شعرا کے اشعار جستہ جستہ درج کئے جاتے ہیں کہ تفصیل کی گنجائش نہیں ؎

حسینؑ کہتے ہیں قوت دکھاوے اے پیرو
کہ لاشۂ پسرِ نوجواں اُٹھاتے ہیں

(مونس)

---

تڑپتے تھے پسر جب خون میں زینبؑ یہ کہتی تھی
کہ دریائے شہادت کے شناور ایسے ہوتے ہیں

(عشق)

---

ذبح کا مشتاق ہوگا کون ایسا جز حسینؑ
ہنس کے جو بندِ گریباں زیرِ خنجر کھول دے

(مونس)

---

اصغر کو لٹا کے قبر میں شہ نے کہا
آرام کرو اب یہی گہوارہ ہے

(انیس)

---

طائرِ روح نے پرواز کی طوبیٰ کی طرف
پتلیاں رہ گئیں پھر کر شہِ والا کی طرف

(انیس)

---

ڈٹ کر رجز پڑھنے لگا غازی بہ آوازِ جلی
میں ہوں دلاور صف شکن فرزندِ مولا علی
ہے ابنِ عبدالمطلبؑ دادا ابوطالبؑ ولی
تلوار میرے باپ سے اور عمر و عنتر سے چلی

فصیح (ماخوذ از مرثیہ حضرت عباسؑ)

---

بر چھا لیا، سمند کو زانو میں داب کے
لو دو ہلال بن گئے حلقے رکاب کے

(انیس)

---

یہ مثالیں سو ڈیڑھ سو سال پہلے کی ہیں۔ جدید مرثیہ لکھنے والوں نے بھی "عرضِ ہنر" میں کمی نہیں کی اور جوشِ عقیدت میں کربلائی مجاہدوں کو خوب نمایاں کیا ہے۔ یہاں "چراغِ مصطفوی" کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو جس میں ڈاکٹر صفدر نے امامِ عالی مقام کی حوصلہ مندی، استقامت، اطمینانِ قلب، جذبۂ شہادت اور شوقِ بے تاب کی تصویر کھینچ دی ہے۔ تخیل کی رنگ آمیزی اس پر مستزاد ہے ؎

چہرۂ پاک میں تھا شوقِ عبادت کا جمال
رعب آنکھوں سے تو چتون سے ٹپکتا تھا جلال
قوتِ قلب کا اللہ نے بخشا تھا کمال
پشت پر روحِ علیؑ محوِ دعائے افضال

اپنے نانا سے شجاعت کی سند پائے ہوئے
حفظِ دیں کے لئے مرنے کی قسم کھائے ہوئے

عشق تھا دین سے اور ربط تھا ایمان کے ساتھ
تیغ پہلو میں، نظر فوج پہ، غم جان کے ساتھ
عشق ایثار کو نکلا تھا بڑی شان کے ساتھ
جو قدم اُٹھتا تھا، اُٹھتا تھا وہ ایقان کے ساتھ

قُربِ حق کہتا تھا اَب فاصلہ کم باقی ہے
مطمئن دل تھا کہ بس ایک قدم باقی ہے

ظلمتیں کانپ کے کہتی تھیں حسینؑ آتے ہیں
یا پیمبرؐ پئے تسخیرِ حُسَین آتے ہیں
بجلیاں گرتی ہیں باشوکت وزین آتے ہیں
طُور تک غُل ہے کہ نورِ حَرَمین آتے ہیں

چار سو چہرۂ انور کی ضیا پھیلی ہے
سامنے جس کے شعاعوں کی ردا مَیلی ہے!

مذکورہ بالا اقتباس کے یہ تین بند مُسلسل ہیں جو امام علیہ السّلام کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو واضح کرتے ہیں لیکن صفدر صاحب کے مرثیوں میں ایسی مثالیں متعدد ہیں جہاں ایک مصرع سے پوری تصویر نظر کے سامنے آجاتی ہے۔ اختصار بجائے خود ایک وصف ہے بشرطیکہ فن کار نے اُس میں تصویر کے تمام خطوط کو باریک بینی کے ساتھ مِلایا ہو۔ ذیل کے مصرعے اِسی فنکاری کا سُراغ دیتے ہیں:۔

ع کھل اُٹھا چہرۂ زیبا پہ شجاعت کا چمن
ع ہاتھ نیزے پہ گیا، گھوڑے کو مہمیز کیا
ع تیغ پہلو میں، نظر فوج پہ، غم جان کے ساتھ

ع چمکے، کی فوج کے اُٹھے گھٹے بادل پہ گھٹا

ع اپنے جسموں سے زرہ پھینک کے نکلے جانباز

اِن مصرعوں کی محاکات، بلاغت، محکمی اور شاندار اسلوب کے متعلق کیا کہا جائے۔ بالخصوص آخری مصرعے میں جرأت و جلاوت کا جو شعلہ رقصاں ہے اُس کی تشریح و توضیح کون کرے۔ فنکاری کے یہی معجزے اور شیوے ہیں جن کے متعلق فغانی نے "نام نیست" کہہ کر بات ختم کر دی کہ نقاد کا قلم اس سے زیادہ لکھنے سے قاصر ہے۔

صفدر صاحب نے مرثیے کے آہنگِ جدید کو قائم رکھا ہے لیکن ساتھ ساتھ وہ اوصاف جو کلاسیکی ادب کی روحِ رواں ہیں، اُنھیں کہیں ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ استعدادِ علمی کے سبب وہ لفظوں کے صحیح محلِ استعمال اور اُن کی معنوی دلالتوں سے باخبر ہیں۔ فارسی تراکیب سے وسیع مفہوم کو دو لفظوں میں ادا کر دینا اُن کے لئے سہل ہے۔ لفظ و معنی کی ہم آہنگی اور فنی رکھ رکھاؤ سے وہ کبھی غافل نہیں ہوتے جدید فنکاری کے باوجود کلاسیکی تہ داری اور متانت و وقار اُن کا معمول ہے۔ وہ اظہارِ مطالب کے لئے اصولِ فن سے بال بھر نہیں ہٹتے اور الفاظ کے دروبست سے اپنے اسلوب کو اُستوار و محکم بناتے ہیں۔ اُن کا ذخیرۂ الفاظ اتنا وسیع ہے کہ اُن کے مصرعوں میں بھرتی کے الفاظ بہت کم ملیں گے۔ کلاسیکی فن کاری پر جو بے لچک ٹھوس پن اور ایک نوع کی "یبوست" کا الزام لگایا جاتا ہے اُسے صفدر صاحب نے کہیں خوبصورت تشبیہوں سے اور کہیں خوش نما استعاروں سے دور کر دیا ہے۔ پھر جہاں یہ کلاسیکی رکھ رکھاؤ اور جدید رنگ شیر و شکر ہو جاتے ہیں وہاں قدیم و جدید کا بہت دل نشین انداز پیدا ہوتا ہے۔ صفدر صاحب نے مرثیے کے روایتی اوصاف کو بڑے سلیقے سے اپنی فنکاری میں شامل کیا ہے۔ بزرگوں کے ورثے سے انھیں اتنی الفت ہے کہ وہ الفاظ جن کے معنی ایک صدی پہلے بالکل صحیح یعنی لغوی تھے اور اب کسی قدر بدل گئے ہیں، انھیں بدستور صحیح لغوی مفہوم پر قائم رکھتے ہیں مثلاً مُہیائے جہاد یعنی جہاد کے لئے ہتھیار بند "دُور ازحال" یعنی ہمیشہ سے۔ وغیرہ۔ ذیل کے اشعار سے اس ابہام کی توضیح شاید ہو سکے:-

سُرمہ کش گردِ سفر سے ہوئی چشمِ اقبال

دامنِ شوق کو پھیلانے لگے دشت و جبال (سفرِ مکّہ)

شانے بیساختہ جھوٹے ہیں لچک جاتے تھے
سُن کے تلوار کی جھنکار ٹھمک جاتے تھے

(علی اکبرؑ کی طفلی)

---

وقت وہ تھا شہِ والا کا چمن تھا آباد
سب عزاؤں سے شہِ دیں کا مُختن تھا آباد

---

سب کو سمجھا کے ولی ابنِ ولی نے روکا
اپنے ضیغم کو حسینؑ ابنِ علیؑ نے روکا

---

قافلہ عمر کا منزل کی طرف جاتا ہے
یہ غلام آپ کا ساحل کی طرف جاتا ہے

(جنابِ عباسؑ کی رخصت)

---

دل شگفتہ تھے دلیروں کے چمن کی صورت
دستِ فولاد میں نیزے تھے کرن کی صورت

(رفیقانِ امامؑ)

---

روشنی چاند کی پھیکی سی میانِ میداں
سحرِ نور کا جیسے ہو دھندلکے میں سماں

---

کلاسیکی روایت سے مصنف کو اتنا لگاؤ ہے کہ گھوڑے اور تلوار کی روایتی تعریف سے مرثیے کی نوک پلک کو جابجا سنوارا ہے۔ حضرت عباسؑ، امام علیہ السلام اور حضرت علی اکبرؑ کا سراپا لکھنے میں بھی قدیم روایت برقرار رکھی ہے۔ اسے تقلید ہرگز نہیں کہہ سکتے یہ وہ پاسِ وضع ہے جسے کلاسیکی رجحان ایک لمحے کے

لئے نہیں چھوڑ سکتا۔ چھوڑنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ ابن رشیق نے "العمدۃ" میں اور نظامی عروضی نے چہار مقالہ میں شاعر کے لئے یہ شرط لازمی قرار دی ہے کہ اُسے اساتذہ کا کلام ازبر ہو۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں کلامِ اساتذہ سے متاثر ہونا بھی لازمی ہے۔ صفدر صاحب کا کوئی مرثیہ اُٹھا کر دیکھ لیجئے صاف اندازہ ہو جائے گا کہ وہ انیسؔ کے روحانی شاگرد ہیں اور اُس خدائے سخن کی شریعت کو بہرحال قائم رکھتے ہیں۔ حق یہ ہے کہ بیانیہ شاعری اور عقائد و افکار کے ذکر میں انیسؔ نے جو معیار مقرر کیا تھا اُسے مذہبی اور عقائدی شاعری کے سلسلے میں اکثر شعرا نے اپنے لئے شمعِ راہ بنایا۔ حالیؔ کا مسدس، چکبستؔ کی رامائن، علامہ اقبالؔ کی نظمیں بالخصوص شکوہ، جوابِ شکوہ وغیرہ سب میں مسدس کی وہی ہیئت اور زبان و بیان کا وہی اسلوب ملتا ہے جس کا سکّہ انیسؔ نے چلایا تھا۔ اس صورت میں مرثیہ گو شعرا اُسے کس طرح فراموش کر سکتے ہیں۔ مختلف مراثی کے انتخاب سے صفدر صاحب کی اس خصوصیت پر روشنی پڑتی ہے۔

علم کا شوق تھا مائل ہمہ دانی کی طرف
ملتفت ذوقِ نظر حسنِ معانی کی طرف
جب بڑھی عمر لڑکپن سے جوانی کی طرف
ہاتھ بڑھنے لگے تیغِ صفہانی کی طرف

کتنی بھرپور سجی کتنی طرحدار آئی
ہاتھ میں بیٹے کے جب باپ کی تلوار آئی

(حضرت عباسؑ کا ذکر)

---

عزم کہتا تھا کہ کیا چیز ہے آہن کا حصار
چاٹ جائے گی اُسے دم میں یہ ناگن تلوار
جس کا سونگھا ہوا میداں میں نہ پانی مانگے
رونمائی میں جو زخموں کی نشانی مانگے

(علی اکبرؑ کی تلوار)

---

تیسرے مصرعے کا لطف وہی لوگ خوب سمجھ سکتے ہیں جو استعارہ بالکنایہ کی بلاغت سے آشنا ہوں۔ استعارہ بالکنایہ کی اس سے بہتر مثال اُردو یا فارسی ادب میں نہیں مل سکتی۔

صفدر صاحب کے کلام میں کہیں کہیں دبستانِ لکھنؤ کی وہ خصوصیت بھی نظر آتی ہے جو آرائشِ لفظ کو شاعری کا لازمہ قرار دیتی ہے اور صنائع بدائع کے استعمال کو، بشرطیکہ بے ساختگی کے ساتھ ہو، زینتِ شعر قرار دیتی ہے۔ ذیل کے دو شعروں میں معنوی رابطوں اور حُسنِ تعلیل کی لطافت قابلِ ستائش ہے ؎

لبِ دریا قدمِ سیّدِ اکرم ٹھہرے
خَم تھا مجرے کے لئے ماہِ مُحرّم ٹھہرے
ناخدا کشتیِ اُمّت کا لبِ جُو اُترا
تھام کر اپنے علمدار کا بازو، اُترا

لبِ دریا، ناخدا اور کشتیِ اُمّت کے معنوی رابطے قابلِ توجہ ہیں۔ آخری مصرعے میں بازو کا لفظ بہت برمحل آیا ہے کہ جناب عباسؑ امام حسینؑ کے بھائی تھے جسے مجازاً بازو کہتے ہیں۔ مصرعے میں یہ لفظ اپنے حقیقی معنی (ہاتھ) کے لئے استعمال ہوا ہے۔

اس کے باوجود صفدر صاحب کے مختلف مرثیوں بالخصوص 'چراغِ مصطفویؐ' میں ایسے اشعار بکثرت ملیں گے جن میں آہنگِ جدید بھی پورے حُسن کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ میری مُراد اس آہنگ سے وہ اسلوب ہے جو انگریزی ادب کے اثر سے اُردو میں آیا ہے۔ اس کے دو پہلو ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ انگریزی اندازِ بیان کا تحت اللفظ اُردو ترجمہ کر کے پیش کر دیجئے۔ یہ طریقہ ہمیشہ غیر مستحسن رہے گا۔ لیکن دوسرا پہلو جو ایک حد تک دلکشی بھی رکھتا ہے اور کہیں کہیں اِبلاغ و اظہار کی بڑھی ہوئی صلاحیت کا بھی ضامن ہے، بہت پسندیدہ ہے۔ اس پر انگریزی اثر کی چھاپ تو موجود ہے لیکن فارسی تراکیب' مانوس استعاروں اور وضاحتِ بیان کے سبب ہماری اپنی چیز کہلائے گا۔ پھر جب مُسلّمہ عقائد اور مروجہ روایتیں بھی اس میں شامل ہو جائیں تو غیریت باقی نہیں رہتی اور ہمارا ذہن اُسے "مے خانہ ساز" سمجھ کر بخوشی قبول کرتا ہے۔ اس آہنگ میں اگر غرابت کا شائبہ رہ بھی جائے تو شدّتِ اظہار اور کمالِ ابلاغ کے سبب غرابت دب جاتی ہے اور صلابت و قوت

اپنا اثر دکھانے لگتی ہے۔ ذیل کی مثالوں سے اہلِ ذوق "آں مے کہ دہقاں پرورد" کی کیفیت کو سمجھ سکتے ہیں:۔

فرض نے عہدِ شہادت ہمہ تن باندھ لیا
چھوڑ کر جامۂ احرام کفن باندھ لیا (امامؑ کا حج کو ملتوی کرنا)

---

پہرے تھے کوچہ و بازار میں سنگینوں کے
اہلِ سرمایہ ہم آواز تھے بے دینوں کے (کوفے میں حضرتِ مسلمؑ)

---

عزم وہ فاتحِ طوفاں ہو سفینہ جس سے
عارضِ شام و سحر پر ہو پسینہ جس سے

---

ہر وہ عقدہ کہ جو تشویش فزا ہوتا تھا
ناخنِ جرأتِ عباسؑ سے وا ہوتا تھا

---

دل سے آواز یہ آتی تھی اُجالا کیجے
عزم کہتا تھا کہ دُنیا تہ و بالا کیجے (جنابِ عباسؑ کا شباب)

---

سر بہ سجدہ ہوئی ہر شاخِ شجر جھک جھک کر
نفسِ سرد بھرا بادِ صبا نے رُک کر (اذان کی تاثیر)

---

اِس کی نصرت میں تامّل تجھے کیا ہے زینبؑ!
مسلکِ حق ترا منہ دیکھ رہا ہے زینبؑ!

---

آبرو فرض کو، توقیر وفا کو بخشی
تپشِ نو، دلِ اربابِ ولا کو بخشی (حضرت عباسؑ کی وفاداری)

چُستیِ بندش اور برجستگی کے علاوہ جو اس بیت میں ہے، دوسرے مصرعے میں جدید آہنگ کی جھنکار صاف سنائی دیتی ہے!

انگریزی ادب کے اثر سے جو معائب اُردو شاعری میں دَر آئے اُن میں سب سے ناپسندیدہ یہ ہے کہ گرامر کے آرٹیکل 'A' کو جو انگریزی میں تقریباً ہر اسمِ نکرہ کے ساتھ لگایا جاتا ہے اور 'ایک' کا ہم معنی ہے، ہم نے بھی غیر شعوری طور پر اُردو اُسما کے ساتھ چپکا دیا ہے۔ ذیل کے مصرعے اس کی مثالیں ہیں جن کے جواز یا عدمِ جواز کا فیصلہ اہلِ نظر کر سکتے ہیں:-

ع ایک تاریخ ہے ہر نقشِ کفِ پا جن کا
ع لے کے اِک جذبۂ تحصیلِ سعادت اُٹھا
ع دلِ عباسؑ میں اک جوشِ فراواں جاگا

اپنے اکثر مرثیوں کی طرح صفدر صاحب نے "چراغِ مصطفویؐ" کا اختتام بھی دُعا پر کیا ہے۔ ان کے اختتامی بند بالعموم التجا و دُعا کے جدید انداز کے حامل ہوتے ہیں اور اُن میں اصلاح و تعمیر کا جذبہ صاف جھلکتا ہے جو جدید رُجحانات کا آئینہ دار ہے۔ ذیل کے اشعار میں قوم کے موجودہ انحطاط، بے روح گریہ و زاری اور افسردگی کا بیان کر کے اُنھوں نے بہت دردمندی سے دُعا مانگی ہے، اور امام علیہ السلام کی روحِ پُرفتوح سے رجوع کیا ہے:-

میری ملّت میں ابھی اشکوں کی ارزانی ہے
نہ شجاعت نہ حرارت نہ جہاں بانی ہے
درس دے ہم کو کہ دُنیا کو ہلا دیں ہم لوگ
آگ بہتے ہوئے پانی میں لگا دیں ہم لوگ

• قوم کے اس برف آلود انحطاط اور یکسانہ افسردگی کی طرف صفدر صاحب جا بجا اشارہ کرتے ہیں لیکن

اُن کے یہ اشارے اور اختتامی دُعائیں رسمی نہیں ہیں۔ وہ اصلاحی و تعمیری رُجحان کے علم بردار ہیں ماہ
اُن کی یہ رُباعی اُن کے مقاصد و عزائم کا سُراغ دیتی ہے ؎

ذہنوں کی روش بدلنے والے ہم ہیں
کانٹوں کی زباں مَسلنے والے ہم ہیں
سَو بار حریفوں نے ہمیں دیکھ لیا
تلوار کی طرح چلنے والے ہم ہیں

۱۲۔ نومبر ۱۹۷۳ء

——※——

○

ڈاکٹر صفدر حسین کی زیرِ تبصرہ تصنیف "سیرت و احوالِ حضرت امام حسینؑ کے بیان پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر صاحب مرثیہ کی تاریخ پر گہری نظر رکھتے ہیں اور خود بھی ایک پختہ مشق مرثیہ نگار ہیں۔ اس صنفِ سخن میں چند دیگر تصانیف کے علاوہ متعدد تاریخی، تہذیبی اور ادبی جائزے بھی اُن کی تصانیف میں شامل ہیں۔ "چراغِ مصطفویؐ" فکرِ بلند اور زورِ بیان کا ایک دلکش مجموعہ ہے، جس میں شاعر نے واقعۂ کربلا کے ہر جزو سے انصاف کرتے ہوئے مرکزی موضوع یعنی سید الشہدا حضرت امام حسینؑ کے جہاد اور اُن کی شہادت کی اہمیت کو کسی بھی مقام پر کم نہیں ہونے دیا۔

مطبوعہ: روزنامہ "امروز" لاہور

۱۹؍ جنوری ۱۹۷۵ء

○

ڈاکٹر سید صفدر حسین کا نو تصنیف مرثیہ "چراغِ مصطفویؐ" بڑا کامیاب مرثیہ ہے۔ یوں تو یہ "بیانِ سیرت و احوالِ سید الشہدا" یعنی جگر گوشۂ رسول صلعم ہے، مگر ابتدا میں خیر و شر، نور و نار کا تضاد اور چراغِ مصطفویؐ کے نور کی شرارِ بولہبی پر برتری، پھر امام حسینؑ کا مدینے سے سفر، جنابِ مسلمؑ کی کوفے کو روانگی، کوفے میں سیاست کا رنگ، امامِ حسینؑ کے اصحاب و انصار کا ذکر، شبِ عاشور کی عبادتیں، جنگ سے پہلے امام حسینؑ کی دعا، پہلے اور آخری شہدا کا حال، امام کا رجز اور جہاد اور آخر میں شاعر کی دعا۔

ڈاکٹر سید صفدر حسین پچھلے پندرہ سال سے مرثیہ گوئی کر رہے ہیں۔ مرثیہ پر و رتاریخ پر اُن کی گہری نظر ہے۔ وہ مرثیہ نگاری کے تمام پہلوؤں سے پوری طرح واقف ہیں، اور تمام نزاکتوں کا اُنھوں نے پورا خیال رکھا ہے۔ اس سے قبل بھی اُن کے قلم سے "آئینِ وفا" "جلوۂ تہذیب" "مرثیہ بعد انیس" "شاہکارِ انیس" "رزم نگارانِ کربلا" "شاداتِ باہر" "لکھنؤ کی تہذیبی میراث" "رقصِ خیال" اور "نگارِ غزل" جیسی تخلیقات منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔

ہفت روزہ "پاک جمہوریت"، لاہور

۲۵ / تا ۳۱ / جنوری ۱۹۷۵ء

○

"چراغِ مصطفویؐ" سے مصنف کی مراد حضرتِ امامِ حسین علیہ السّلام ہیں۔ ڈاکٹر سیّد صفدر حسین نے اِس کتاب میں امامِ حسینؑ اور اُن کے رُفقائے کربلا کی خدمت میں منظوم نذرانۂ عقیدت بشکلِ مرثیہ رقم کیا ہے۔

مرثیہ کی وہ شکل جسے ہم میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کے کلام میں کمال کے درجے پر دیکھتے ہیں، تہذیب کے ایک مخصوص دَور سے متعلق ہے۔ اودھ کی یہ تہذیب اپنے دائرے میں بہت تنگ لیکن اپنی حدود کے اندر مکمل تھی۔ اس تہذیب کے گرم اور مرطوب ماحول میں مرثیہ ایک مذہبی تقریب سے پھوٹ کر عظیم ادب کی صورت میں نمودار ہوا اور جو روایات مرثیہ کی تعمیری ساخت کے لئے خام مواد کے طور پر استعمال ہوتی تھیں انہی کے ذریعہ سے مرثیہ اس دَور کی معاشرتی اقدار اور نظریۂ حیات کا آئینہ دار بن گیا۔ سوقیانہ اور عامیانہ زبان سے اپنا دامن بچائے ہوئے، شرفا کے روزمرّہ اور محاورے پر مبنی، مرثیہ کی زبان ایک ایسا مہذب اور پختہ ذریعۂ اظہار ہے، جس میں زندگی کے مختلف مواقع کا ساتھ دینے کی بھرپور صلاحیت موجود ہے۔

ہئیت کے اعتبار سے مرثیہ کا ایک مخصوص ڈھانچہ مقرر ہو گیا تھا، جس میں فضائل اور مصائب کے بظاہر متضاد لیکن درحقیقت مربوط اجزا مل کر ایک مخصوص واحد کیفیت پیدا کرتے ہیں اور اسی زبان و ہئیت کے ذریعہ سے مرثیہ گو شعرا نے روایات کے ذخیرے

سے سیکڑوں بلکہ ہزاروں مرقعے ڈھال دیئے۔ تعریف کے اعتبار سے مرثیہ واقعۂ کربلا اور اُس سے متعلقہ روایات سے تراشیدہ و تعمیر کردہ مناسب ہیئت اور مُہذّب شاعرانہ زبان میں ایک عمل یا واقعے کا وہ مُکمّل اور مربوط مرقّع ہے، جس میں انسانیت اور بہیمیت کا تقابل اور تصادم اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ انسانی شرافت کے کرداروں سے فضائل کے ذریعے عقیدت و عظمت کے جذبات اور مصائب کے ذریعے اُن کی یگانگت اور شرکت کے جذبات برانگیختہ ہو کر ایک مخصوص کیفیت پیدا کرتے ہیں۔

ڈاکٹر سیّد صفدر حسین، مرثیہ کی مکمّل تاریخ اور تمام اَدوار پر گہری نظر رکھتے ہیں، اس لئے وہ مرثیہ کی جملہ رعنائیوں اور کیفیتوں سے پوری طرح آگاہ ہیں۔ "چراغِ مصطفوی" میں مصنّف، شاعرانہ مُشکلات سے بڑی خوش اسلوبی سے عمدہ برآ ہونے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ اُنھوں نے اپنے مرثیہ کے لئے ایک سیدھا اور سچّا راستہ اختیار کیا ہے۔ ہر جزو کو ایسا مناسب طول دیا ہے اور اس طرح مربوط کیا ہے کہ مرثیہ کُلّیت اور تناسب بجائے دَبنے کے اُبھر کر سامنے آجاتے ہیں۔ ایک اور قابلِ توجّہ بات یہ ہے کہ چونکہ مصنّف نے "چراغِ مصطفوی" میں نورِ ہدایت کا ذکر کیا ہے، اس لئے اس تصنیف کے مصائب والے حصّے میں پھیلاؤ نہیں ہے بلکہ بیجا طول دینے کے بجائے مرثیہ کو دُعا پر ختم کر دیا ہے اور یہی خاتمہ اس کے لئے مناسب بھی تھا۔

زبان بھی موضوع کی مناسبت کا حق ادا کرتی ہے۔ نہ اس میں بے جا صنعت کاری ہے، نہ ثقالت ہے اور نہ کسی کی نقالی کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ شاعری فنّی چابکدستی اور اعلیٰ محاسنِ اسلوب کی آئینہ دار ہے۔ اس مرثیہ کا ایک سو پانچواں بند ملاحظہ فرمایئے۔ ۵

دیکھ کر تیغ یداللہ سے آباد نیام
پھر سے آندھی کی طرح ٹوٹ پڑا لشکرِ شام

گھر گئے فوج کے نرغے میں شہنشاہِ انام
ہاتھ اُٹھا کر کیا کُفّار کے نیزوں نے سلام

سائے میں لے لیا فولاد کی دیواروں نے
جسمِ معصوم پہ سجدے کیے تلواروں نے

مطبوعہ: روزنامہ "مساوات" لاہور
۹ر فروری ۱۹۷۵ء

ناصر زیدی

○

ڈاکٹر سید صفدر حسین ایک ماہرِ تعلیم، مشہور و معروف نقاد اور نظم و غزل کے نہ صرف یہ کہ ایک اچھے شاعر ہیں بلکہ ایک عمدہ مرثیہ گو بھی ہیں۔ وہ جو کہا جاتا ہے کہ بگڑا ادیب نقاد اور بگڑا شاعر مرثیہ گو ہو جاتا ہے، وہ بات ڈاکٹر صاحب موصوف پر صادق نہیں آتی، کیونکہ وہ بیک وقت غزل کے اور پابند و معرّیٰ نظم کے بھی اچھے اور صاحب دیوان شاعر ہیں۔ اُن کی نظموں اور غزلوں کے مجموعوں کے علاوہ، مرثیے کے دو[۲] مجموعے زیرِ تبصرہ کتاب سے پہلے "آئینِ وفا" اور "جلوۂ تہذیب" کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ "آئینِ وفا" حضرت عباسؑ کے حال میں اور "جلوۂ تہذیب" شہزادہ علی اکبرؑ کی سیرت و احوال پر مبنی مرثیہ تھا۔ اور اب "چراغِ مصطفویؐ" بیانِ سیرت و احوالِ سیّد الشہدا یعنی جگر گوشۂ رسول صلعم پر مبنی ہے جو ایک سو سترہ[۱۱۷] بندوں پر مشتمل ہے۔

ڈاکٹر صفدر قدیم مرثیے کی تاریخ پر بھی نظر رکھتے ہیں اور جدید فنِ مرثیہ پر بھی اُن کی نظر گہری ہے۔ میر انیس اور مرزا دبیر کے بعد مرثیے کو آگے بڑھانا یا محض اُس معیار تک زندہ ہی رکھنا کوئی آسان کام نہ تھا، مگر موجودہ دور میں ہم دیکھتے ہیں کہ صنفِ مرثیہ پھر زندہ ہے، اور اُس کی زندگی کے سلسلے ہیں جہاں حضرتِ جوشؔ ملیح آبادی اور آلِ رضا کے نام آتے ہیں وہاں ڈاکٹر صفدر حسین کا نام بھی لیا جاتا ہے۔

زیرِ تبصرہ مرثیے میں ڈاکٹر صاحب، تخلیقِ آدم سے لے کر معراجِ آدمؑ تک کے مراحل

کو نظم کرتے اور نور و ظلمت کے تضادات کو اُبھارتے ہوئے انبیاءِ کرام کے سلسلے کو تخلیقِ مصطفیٰ تک لاتے ہیں، اور پھر شرارِ بولہبی کے مقابل چراغِ مصطفوی کی لَو کو آگے تک بڑھاتے ہیں ؎

جب نہ اعمال میں کچھ فرقِ بد و نیک رہا
یعنی ہونے لگے احکامِ الٰہی رُسوا
گھونٹا جانے لگا انصاف و شرافت کا گلا
زورِ اسلام گھٹا، جذبۂ الحاد بڑھا
رُوحِ اسلام پہ شاہی کی جو لعنت آئی
جانشینِ شہِ لولاک کو غیرت آئی

پھر ظلمت کے تھپیڑوں سے دینِ مصطفیٰ کو بچانے کے لئے نواسۂ مصطفیٰ یعنی حضرتِ امامِ حسینؑ کی جو حالت ہوتی ہے اُس کو یوں نظم کرتے ہیں ؎

گھِر کے باطل کی جو یلغار میں تھے شاہِ انام
نہ مدینے میں سکوں تھا، نہ حرم میں آرام
چیرہ دستوں کی طرف فوجِ رے و کوفہ و شام
مطمئن حق و صداقت کے بھروسے پہ امام
اپنے موقف کو بدل دیں یہ گوارا ہی نہ تھا
عزمِ محکم کے بغیر اب کوئی چارا ہی نہ تھا

جدید مرثیہ محض آہ و بکا ہی نہیں بلکہ شجاعت اور ذوقِ شہادت کا بھی پیغام ہے، اور صفدر نے اپنے مرثیوں میں جدید مرثیہ نگاری کے تقاضوں کو بھی پورا کیا ہے۔ چراغِ مصطفوی کو شرارِ بولہبی سے بچا لینے پر آخر میں حضرتِ امام حسینؑ کی ریاضت کو شاعر اس طرح داد دیتا ہے ؎

مرحبا! مرتبۂ منزلِ ایثارِ حسینؑ
حشر تک پھیل گیا حلقۂ پرکارِ حسینؑ

کربلا سلسلۂ پرتوِ کردارِ حسینؑ
دینِ اسلام ہے اب جلوۂ دیدارِ حسینؑ

اِن سے بیگانگی، ایمان سے محرومی ہے
یہ نہ تسلیم کرے جو، وہی بس شومی ہے

مطبوعہ: ماہنامہ "کتاب" لاہور
مارچ ۱۹۷۵ء

آغا سہیل

○

جدید مرثیہ گویوں میں ڈاکٹر سیّد صفدر حسین ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ میں نے اُن کے متعدد مراثی سے فیض اُٹھایا ہے۔ "چراغِ مصطفوی" اُن کے جملہ مراثی میں اس لحاظ سے وقیع ہے کہ یہ بجائے خود مرثیہ بھی ہے اور ایک با مقصد نظم بھی۔ مقصدیت سے میری مُراد یہ ہے کہ جو روایت حالیؔ، اقبالؔ اور چکبستؔ نے فن کے پردے میں مقصدیت کو چُھپا کر پیش کرنے کی قائم کی تھی، اُسے اس دَور میں مرثیے کی صورت میں صرف جوشؔ اور آلِ رضاؔ ہی اپنے طریق پر استعمال نہیں کر رہے ہیں بلکہ ڈاکٹر سیّد صفدر حسین بھی اِس صف میں شامل ہیں۔ ظاہر ہے کہ مرثیہ نگاری کے معاملے میں یہ ایک نسبتاً ترقی پسند رُجحان ہے۔

جدید مرثیہ بھی ہیئت کے لحاظ سے قدیم مرثیے کی ڈگر پر چل رہا ہے۔ البتّہ مواد جو اپنی واقعیت کے لحاظ سے ایک مستقل شے ہے اُسے پیش کرنے کی صورتیں بجا طور پر بدلتی رہتی ہیں، اور شاید ہمیشہ بدلتی رہیں۔ مجھے یہ واقعہ بخوبی یاد ہے کہ ایک جدید مرثیہ گو[1] اپنا تازہ مرثیہ پڑھ کر منبر سے اُترے تو ایک قدیم مرثیہ گو[2] نے بطورِ تبصرہ یہ کہا کہ "کیا واسوخت ارشاد ہوئی ہے۔" گویا قدیم مرثیہ گو نے جدید مرثیہ نگار کے مرثیے کو بحیثیت صنف کے مرثیہ تسلیم نہیں کیا۔ یہ واقعہ بجائے خود اس واقعے کا ثبوت ہے کہ مواد کو پیش کرنے کا ڈھنگ جو جدید مرثیے

---

[1] سیّد آلِ رضا بحوالہ "جدید فنِ مرثیہ نگاری" صفحہ ۲۲۵

[2] سیّد علی نواب قدیم لکھنوی نبیرہ انیس بحوالہ "عظمتِ انسان" صفحہ ۲۲۵

نے زمانے کے اقتضا سے دریافت کیا تھا بالکل فطری عمل کے ماتحت تھا' جسے قدیم مرثیہ نگار تسلیم نہیں کرتا۔ ڈاکٹر صفدر حسین کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے ہئیت کے معاملے میں کوئی جدید ترمیم قبول نہیں کی' بلکہ قدما کے نقشِ قدم پر چلے ہیں لیکن مواد کو پیش کرنے کے لئے اپنا ایک منفرد اسلوب بھی دریافت کیا ہے۔ اور اس مواد سے وہ مقصدیت بھی حاصل کی ہے جو ترقی پسند شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔ اور صنفِ مرثیہ میں "روحِ عصر" کو جھلکایا ہے۔

دبستانِ لکھنؤ سے جو مرثیے کو ربط ہے وہ اظہر من الشمس ہے لیکن وہاں بھی آل رضا نے جدید مرثیے کی جس وقت داغ بیل ڈالی[1] تو رنگِ مجلس بدل چکا تھا۔ علم کی روشنی پھیل رہی تھی' ترقی پسند قدریں مستحکم ہو رہی تھیں اور بقولِ احتشام حسین مرحوم کہ "علامہ سبطِ حسین نے ذاکری کا رنگ ڈھنگ بھی بدل دیا تھا۔ لہٰذا معاشرے کے تقاضوں سے کسی صنفِ سخن کو ہم آہنگ کر دینا ایسا ترقی پسندانہ عمل ہے جس سے ادب کو تقویت پہنچتی ہے اور جس سے صرفِ نظر کر کے فن کار ترقی پسند قدروں کے فطری ارتقا کے تسلسل سے کٹ کر کہیں پیچھے رہ جاتا ہے۔ چنانچہ میرے نزدیک اس مرثیے میں بند نمبر ۱۰۸ کے بعد سے یہ عمل شروع ہوتا ہے"

مرحبا! مرتبۂ منزلِ ایثارِ حسینؑ
حشر تک پھیل گیا حلقۂ پرکارِ حسینؑ
کربلا سلسلۂ پرتوِ کردارِ حسینؑ
دینِ اسلام ہے اب جلوۂ دیدارِ حسینؑ

---

[1] مُراد یہ کہ ۱۳ اپریل ۱۹۲۹ء جب جناب آل رضا نے اپنا پہلا مرثیہ لکھنؤ میں پڑھا تھا۔ لیکن اس مقام پر مقالہ نگار کے علم میں اضافے کے لئے عرض کیا جا سکتا ہے کہ ان کی نظر سے ناظم الہند سید ناظر حسین ناظم کے درجنوں مراثی محو ہو گئے ہیں جن میں سے ہم نے آٹھ مرثیے "بزمِ ناظم" کے نام سے ترتیب دے دیئے ہیں۔ یہ سب مراثی جدید ہونے کے ساتھ ساتھ ۱۹۱۶ء سے پہلے کی تصنیف ہیں۔ اسی طرح دِلّو رام کوثری کے مشہور مرثیہ "قرآن اور حسینؑ" کا تذکرہ بھی جو آل رضا کے آغازِ مرثیہ نگاری سے تقریباً دس بارہ سال قبل لکھا جا چکا تھا ــــــ صاحبانِ لکھنؤ عموماً نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اور محترمہ دو شیزہ کنواری سلطنہ کا مرثیہ "بادۂ عرفان" بھی جو ۱۹۲۳ء کی تصنیف ہے اس کا بھی شاید اسی لئے تذکرہ نہیں کیا جاتا تاکہ جدید مرثیہ نگاری کا عمامہ جنابِ آل رضا کے سر باندھا جا سکے (مرتب)

اِن سے بیگانگی ایمان سے محرومی ہے
یہ نہ تسلیم کرے جو، ذہنی بس شومی ہے

فدیۂ راہِ ہدایت تری عظمت کو سلام
تیرے ایمان و عقیدت، تری طاعت کو سلام
عابدؑ و زینبؑ و کلثومؑ کی ہمت کو سلام
مختصر یہ ہے کہ اُس گھر کی قیادت کو سلام

جس میں قائم ہوا اِک سلسلہ قربانی کا
ماحصل جس کو کہیں عظمتِ انسانی کا

اور اب اس کے بعد صفدر حسین کے بیان کے تیور بدلنا شروع ہوتے ہیں. ملاحظہ ہو۔

اپنی اُمت کو بھی کچھ عظمتِ انسانی دے
زنگ کھائی ہوئی تلوار کو تابانی دے
اِس ستارے کو بھی توفیقِ درخشانی دے
ناتواں قوم کو پھر قوتِ ایمانی دے

دے کے سَر، دین کی تقدیر بنانے والے
عَلَمِ عظمتِ اخلاق اُٹھانے والے

حتٰی کہ بند نمبر ۱۱ تک قوم کی زبوں حالی کے ذکر کے ساتھ ساتھ اسے ازسرِ نو اعلٰی اقدار کے اسلحہ سے مسلّح کر دینے کا عزم صمیم موجود ہے۔

مطبوعۂ آہنگ، کراچی

۲۴ مارچ ۱۹۷۵ء

زاہدہ صدیقی

ڈاکٹر سید صفدر حسین کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ آپ کے متعدد شعری مجموعے اب تک منظرِ عام پر آچکے ہیں اور پڑھنے والوں سے دادِ سخن حاصل کر چکے ہیں اُنہوں نے مرثیے کے سلسلے میں جو خصوصی کام کیا ہے اُس کا اعتراف اُن کے ہر قاری کو کرنا پڑتا ہے۔ مرثیے سے رونے رُلانے کا کام تو بہت لیا جاتا رہا ہے لیکن اصل کام رونا رُلانا نہیں ہے بلکہ واقعاتِ کربلا کو اس انداز میں پیش کرنا ہے کہ پڑھنے یا سُننے والوں کے دلوں میں شجاعت و شہادت کے جذبات بیدار ہوں۔ اگر مرثیہ نگار اس انداز میں کچھ پیش کرتا ہے تو یہ ایک ملّی خدمت ہے۔ "چراغِ مصطفوی" بلاشبہ مرثیے کے اس معیار پر پورا اُترتا ہے اور بلاشبہ شجاعت و شہادت کے جذبات پیدا کر کے ملّی خدمت انجام دیتا ہے۔

۱۷۱ بندوں پر مشتمل مرثیے کی ابتدا عام مرثیوں سے ہٹ کر نہایت خوبصورتی سے کی ہے۔ رسول اکرم صلعم کی ذات سے اِس کا آغاز کیا گیا ہے اور پھر مختصر تعارف کے بعد سیرت و احوالِ امام حسینؑ اور واقعاتِ کربلا پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ڈاکٹر صاحب فنِ شعر، تاریخِ اسلام اور تاریخِ مرثیہ گوئی پر کامل عبور رکھتے ہیں۔ اور تینوں ہی عناصر کی نشاندہی ہمیں اُن کے زیرِ نظر مرثیہ میں ملتی ہے۔ "چراغِ مصطفوی" کی زبان بھی مرثیے کے لئے عین موزوں اور شعری تقاضوں کے لحاظ سے مناسب ترین ہے۔ شروع سے آخر تک زورِ بیان نمایاں ہے جس کا پڑھتے ہوئے بجا طور پر احساس ہوتا ہے۔ واقعات اور اوصاف کے تذکرے میں کہیں بھی حدِ انصاف سے آگے بڑھنے کی کوشش نہیں

کی گئی۔ تمام تر جزئیات کو اتنا ہی پھیلایا گیا ہے جتنا کہ ضروری تھا۔
امامِ حسینؑ سے عقیدت رکھنے والوں اور تاریخِ اسلام سے دلچسپی رکھنے والوں کو "چراغِ مصطفویؐ" کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیئے۔

مطبوعہ: ماہنامہ تحریریں
ماہ جون ۱۹۷۵ء

"چراغِ مصطفویؐ"، ڈاکٹر سید صفدر حسین کا تازہ مرثیہ ہے۔ اُردو اَدب میں مرثیہ کی صنفِ سخن، ایک ایسی صنف ہے جس پر اساتذہ نے یادگار اور لافانی کام کیا ہے۔ میر انیس کے مراثی کو دُنیا کی بڑی سے بڑی شاعری کے مقابلہ میں رکھا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر سید صفدر حسین اُردو ادب کی اس عظیم صنفِ سخن پر سند کی حیثیت رکھتے ہیں اور اس پر جامع اور بھرپور تاریخی اور تنقیدی کام بھی کر چکے ہیں۔ اس سلسلے میں اُن کی کچھ تصانیف "مرثیہ بعدِ انیس" "شاہکارِ انیس" "رزم نگارانِ کربلا" اُردو ادب میں نمایاں حیثیت رکھتی ہیں۔ ڈاکٹر سید صفدر حسین بہت اچھے شاعر بھی ہیں اور انہوں نے مرثیہ گوئی کے فن میں طرحِ نو ڈالی ہے۔ آج کے دَور میں مرثیہ گو کو جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، وہ اس سے نہ صرف آگاہ ہیں، بلکہ ان مشکلات سے عہدہ برآ ہو کر اُنہوں نے ایک ایسا مرثیہ تخلیق کیا ہے جسے اُردو ادب میں ایک نمایاں مقام حاصل رہے گا۔ "چراغِ مصطفویؐ" شعری تاثر اور جذبہ کے سوز سے بھرا ہوا ایک ایسا مرثیہ ہے جو دل پر اثر کرتا ہے اور اُس روایت کو بھی زندہ کر دیتا ہے جو مرثیہ کے ساتھ وابستہ ہے۔

مطبوعہ "سیارہ ڈائجسٹ"

جون ۱۹۷۵ء

کسریٰ منہاس

○

جناب ڈاکٹر سیّد صفدر حسین ایم اے، پی ایچ ڈی، کے متعدد مرثیوں پر رضا کار کے مختلف نمبروں میں تبصرے شائع ہو چکے ہیں۔ "چراغِ مصطفویؐ" اُن کا تازہ مرثیہ ہے۔ پروفیسر کرار حسین (وائس چانسلر بلوچستان یونیورسٹی) اور ڈاکٹر سید ناظر حسن زیدی (پروفیسر اورینٹل کالج لاہور) نے اس مرثیے پر اپنے تاثرات کا اظہار فرمایا ہے۔ جو ۲۵ صفحات تک پھیلا ہوا ہے۔ دونوں نقادوں نے مصنف کی مساعیِ جمیلہ کی تعریف کی ہے اور مرثیے کے بہت سے پہلوؤں کو اُجاگر کر کے قدیم اور جدید مرثیے کے متعلق بہت سے نکات پیش کئے ہیں جو پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔

خیر و شر اور ظلمت و نور کی آویزش، حق و باطل کی کش مکش، کائنات میں متحارب قوتیں ہیں۔ جن کی نمائندگی روزِ اوّل سے ہوتی چلی آئی ہے۔ آدمؑ و ابلیس، موسیٰؑ و فرعون، ابراہیمؑ و نمرود، محمدؐ و ابوجہل انہیں قوتوں کے مظاہر رہے ہیں۔ بقول ڈاکٹر اقبالؒ ؎

ستیزہ کار رہا ہے اَزل سے تا امروز
چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی

ڈاکٹر صفدر نے زیرِ نظر مرثیے میں انسانی فطرت میں نور و نار کا تذکرہ کر کے ان متضاد کیفیات پر روشنی ڈالی ہے۔ اور پھر نورانی سلسلے کو حضرتِ آدمؑ سے حضرتِ محمدؐ مصطفےٰ تک لا کر چراغِ مصطفویؐ کے نور کا ذکر کیا ہے۔ یہ نور وقت کی ظلمت کے ساتھ کس طرح نبرد آزما رہا، اور اس کی روشنی کس طرح پھیلی، اس مرثیے کا یہی موضوع ہے۔

حضرتِ امامِ مظلوم کا مدینے سے کربلا کا سفر، مدینہ کوفہ اور شام میں نت نئی سازشوں

کی خبریں، سیاسی اور موقع پرست قوتوں کا اجتماع، ظلمت و نور کا آخر ایک فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہونا، امامِ عالی مقام کا اِن واقعات کی اطلاع اپنے شیر دل بھائی حضرت عباسؑ کو دینا، اصحاب و انصارِ امامِ حسینؑ کی فداکاری، ان کی عظمت اور ان کے زہد و ورع، تسبیح و تحمید کا تذکرہ اور فوجِ حسینی کے پہلے اور آخری شہید کی معرکہ آرائی اور جانسپاری اور اس کے بعد امامِ مظلومؑ کا جہاد اور شہادت۔

صفدر صاحب ایک ذہین اور طبّاع مرثیہ نگار ہیں۔ قدیم بُنیادوں پر جدید دیواریں کھڑی کرنے کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں۔ خیالات کے اظہار کے لئے نئے نئے راستے تلاش کرتے ہیں، لیکن اُن کا یہ ذوقِ تعمیر و جستجو ادبی میراث اور ماحول کے تابع ہوا کرتا ہے۔ اس مرثیہ کے آخر میں اُنہوں نے چند دُعائیہ بند بھی لکھے ہیں۔ یہ دُعا سات بندوں تک محیط ہے اور شاعر نے اپنے مافی الضمیر کو نہایت واضح الفاظ میں بیان کیا ہے۔ آخری بند کی ٹیپ یہ ہے ؎

خاتمِ شعر کا ہر لفظ نگین بن جائے
فرشِ قرطاس مرا عرشِ بریں بن جائے

جو شاعر کی دِلی تمنّا کا والہانہ اظہار ہے اور اسی دُعا پر اُنھوں نے یہ مرثیہ ختم کیا ہے۔

مطبوعہ: رضاکار، لاہور

۱۶۔ جولائی ۱۹۷۵ء

مرزا رضا حسین

"چراغِ مصطفویؐ" شاعرِ انقلاب جوشؔ ملیح آبادی کے طرز پر امام حسینؑ کے حال کا ۱۷۰ بند کا ایک مرثیہ ہے جو انیسؔ و دبیرؔ کے شاہکار کلاسیکل مراثی کی شکل اور ہئیت سے اس حد تک جُدا ہے کہ نہ اس میں تلوار اور گھوڑے کی تعریف اور نہ جنگ کا بیان تفصیل کے ساتھ اور نہ مصائب وبین کی شدّت ہے۔

مرثیہ کی تاریخ بہت پُرانی ہے۔ مرنے والے کے اوصاف کے متعلق تاثرات اور اُس کی دائمی مفارقت پر جذباتِ غم اندوہ کا فطری اظہار کسی نہ کسی صورت میں ہر دَور میں ہوتا رہا ہے۔ خدایانِ سخن انیسؔ و دبیرؔ نے اس میں جدّتیں پیدا کیں اور اپنی ٹکسالی زبان سے ماہرانہ انداز میں وہ جادو بھرا اور اسے ایسے کمال کو پہنچا دیا جسے اگر ادبی معجزہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ اُن کا کلام آج صرف زبانوں ہی پر نہیں دِلوں پر نقش ہے۔

صفدر رضا صاحب، جو گذشتہ پندرہ سال سے مرثیہ گو ہیں اپنے مرثیہ کی ابتدا وجودِ باری تعالیٰ کے اظہار سے کی ہے:۔

بزمِ ہستی کے چراغوں میں ہے تنویرِ وجود　　جلوۂ کون و مکاں گردشِ تصویرِ وجود
اللہ اللہ یہ گلکاریِ تقدیرِ وجود　　از ازل تا بہ ابد شوخیِ تحریرِ وجود
عرش سے فرش تک اُس کے ہیں مظاہر لاکھوں
ایک فنکارِ ازل کے ہیں نوادر لاکھوں

دوسرے بند میں تخلیقِ آدمؑ اور اُس کے آگے وجودِ انسان اور اس کی فطرت میں نار و نور

اور ظلم وستم کا تذکرہ کرنے کے بعد انبیاء کے نورانی سلسلے کو باعث تخلیق محمد مصطفےٰ بتایا گیا ہے۔ اور اُن کے چراغ کی وسعت کا ذکر کر کے چند بند زمانے کے انقلاب اور ظلمت کے متعلق ہیں جو مرثیہ کا اصل موضوع ہے۔ پہلا بند یہ ہے ؎

جب نہ اعمال میں کچھ فرقِ بد و نیک رہا　　کھُل کے ہونے لگے احکامِ الٰہی رُسوا
گھونٹا جانے لگا انصاف و شرافت کا گلا　　زورِ اسلام گھٹا۔ جذبۂ الحاد بڑھا
روحِ اسلام میں شاہی کی جو لعنت آئی
جانشینِ شہِ لولاک کو غیرت آئی

اس کے بعد امامِ عالی مقام کے مدینہ سے سفر، جناب مسلم کی کوفہ کی جانب روانگی وغیرہ کا مختصر حال ہے۔ اصحاب و انصار اور شبِ عاشورا کی عبادتوں کا تذکرہ ہے۔ فوجِ حسینی کے پہلے شہید (جناب حُر) اور آخری شہید (جنابِ علی اصغرؑ) کا اشارتاً ذکر ہے۔ آخر میں فوج کا معرکہ دکھانے کے بعد مرثیہ سات پُرخلوص بند اور تاثرات سے بھرے ہوئے دعائیہ بندوں پر تمام کر دیا جاتا ہے۔ دُعا کے تین شاہکار بند یہ ہیں۔

اے چراغِ نبویؐ، صَولتِ فکرِ بشری　　قابلِ غور ہے آفاق کی یہ فتنہ گری
کہ ہے صرصر کے تھپیڑوں میں چراغِ خضری　　شعلۂ دل نہ بجھا دے کہیں آنکھوں کی تری
ریگِ آوارہ کی جھولی میں ستارے بھر دے
میرے بہتے ہوئے اشکوں کو شرارے کر دے

بے عمل قوم میں حسرت کی فراوانی ہے　　نہ شجاعت۔ نہ حرارت نہ جہاں بانی ہے
حوصلے پر ترے تاریخ کو حیرانی ہے　　ہم کو بھی دیکھ کہ کیا کربِ گراں جانی ہے
درس دے ہم کو کہ دُنیا کو ہلا دیں ہم لوگ
آگ بہتے ہوئے پانی میں لگا دیں ہم لوگ

توڑ دیں بُتکدۂ نخوت و پندار و غرور　　جوڑ دیں شیشۂ بشکستۂ احساس و شعور
چھوڑ دیں عادتِ فتنہ گری و بغض و فتور　　ڈال دیں گنبدِ دوراں پہ کمندیں تا دور

عَلَمِ عظمتِ کردار اُٹھا کر نکلیں
تیرے پیغام کو تحریک بنا کر نکلیں

ایک ایک مصرع میں شاعر کے دل کا درد، سوز اور کرب کوٹ کوٹ کے بھرا ہوا ہے۔ شاعر کا یہ خیال صحیح ہے کہ صرف بے معنی سینہ کوبی اور بے روح گریہ و زاری سے مقصدِ شہادتِ حسینؑ پورا نہیں ہوتا۔ بعض دُعائیہ مصرعے مثلاً۔

(۱)　شُعلۂ دل نہ بُجھا دے کہیں آنکھوں کی تری
(۲)　میرے بہتے ہوئے اشکوں کو شرارے کر دے
(۳)　بے عمل قوم میں حسرت کی فراوانی ہے
(۴)　تیرے پیغام کو تحریک بنا کر نکلیں

ایسے ہیں جو اصلاحی اور تعمیری مقالوں کے لئے مواد فراہم کرتے ہیں۔ صرف یہی چار مصرعے نہیں زیرِ نظر مرثیہ میں کئی اور ایسے ٹھوس اور جاندار مضامین ہیں جن کے متعلق سرِ قرآنہ کے کالموں میں تبصرہ کرنے کے لئے گنجائش نہیں ہے۔ ممکن ہے بعض تنگ نظر اور خوردہ بیں حضرات ایسے مصرعوں پر جیسے

"شعلۂ دِل نہ بُجھا دے کہیں آنکھوں کی تری"

یہ اعتراض فرما دیں کہ مرثیہ گو گریہ کے خلاف ہے دراں حالیکہ گریہ بھی ایک فطری جذبہ ہے، اسے کوئی روک نہیں سکتا لیکن شاعر کا مقصد یہ ہے کہ صرف گریہ ہی کافی نہیں ہے 'شعلۂ دل' اور اشکوں کا شرارہ' ہونا بھی ضروری ہے۔ ان خیالات کو اگر پھیلایا جائے تو ایک طولانی مقالہ سپردِ قلم کیا جا سکتا ہے۔

صفدرؔ صاحب کے کلام میں زورِ بیان، استدلال، تفکر، تعمیری اور اصلاحی عناصر

جذباتیت، محاکات، بلاغت، شان دار اسلوب، سلاست، روانی، شگفتگی، سوز و گداز ــــ غرضکہ سب ہی خوبیاں موجود ہیں۔

رسالت مآبؐ کی وفات کے بعد امام حسینؑ کی شہادت تک سیاست نے جو پہلو بدلے ہیں اُن کو مرثیہ میں اُجاگر کیا گیا ہے۔ شاعر نے امام حسینؑ اور اُن کے اعزا اور انصار کی غیرت، جانبازی، شجاعت، مردانگی، آدمیت، عظمت، صدق و ثبات، عزم..... کو نمایاں مقام دیا ہے تیز تاریخی واقعات اور اُن کے منطقی نتائج کا تجزیہ کر کے یہ واضح کیا ہے کہ جناب رسالتمآبؐ کی رحلت کے بعد اہلِ بیتِ اطہارؑ جن مشکلات و مصائب سے دوچار ہوئے وہ حالات کی رفتار کا قدرتی نتیجہ تھے۔ لطف یہ ہے کہ ہر عنوان نہایت ہی مختصر لیکن مربوط ہے اور ایک ایک مصرع سے پوری پوری تصویر نظر کے سامنے آجاتی ہے۔ صفدر صاحب اپنی اس تخلیق کے لئے مستحق مبارکباد ہیں۔

مطبوعہ: سرفراز لکھنو

۱۷، اگست ۱۹۷۵ء

سید فیضی

○

چراغِ مصطفویؐ کے ابتدائی صفحات میں پروفیسر کرّار حسین نے تاثرات کے عنوان سے مرثیہ اور اُس کے لوازمات پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اس کے بعد ڈاکٹر سید ناظر حسن زیدی نے 'لمعات' کے تحت خیر و شر کی آویزش پر تفصیل کے ساتھ خیال آرائی کر کے زیرِ تبصرہ مرثیہ کا جائزہ لیا ہے پھر اصل مرثیہ شروع ہوتا ہے۔

مرثیہ کے متعلق عام طور پر یہ مشہور ہے کہ انیسؔ و دبیرؔ نے اس صنفِ شعر کو جن بلندیوں پر پہنچا دیا تھا وہاں تک اب کسی کی رسائی ممکن نہیں، اور بقول پروفیسر کرّار حسین "میر انیس کے بعد مرثیہ کی تاریخ کچھ جدتیں پیدا کر کے میر انیس کے سائے سے بھاگنے کی کوشش اور اس کوشش میں ناکامی یا جزوی کامیابی کی داستان ہے۔" دوسرے لفظوں میں یہ کہنا مناسب نہ ہوگا کہ انیسؔ کے بعد مرثیہ نگار شعراء نے جو کاوشیں کی ہیں، وہ سب کی سب رائیگاں نہیں گئیں۔ کم از کم اتنا تو ہوا کہ بعد میں آنے والوں نے کوئی نہ کوئی جدت پیدا کر کے یا کسی طرفگی کا سہارا لے کر مرثیے کے خد و خال کو سنوارنے اور اس کے جذب و اثر میں اضافہ کرنے کی کوشش ضرور کی ہے۔ انیسؔ کے طفیل مرثیہ کی مجلس اب ادبی مجلس کا رنگ اختیار کر چکی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ انیسؔ نے مرثیے کو خیال کی گہرائی، طرزِ بیان کا حسن اور منظر آفرینی کا بانکپن عطا کیا، اور اس طرح اپنے بعد آنے والوں کے لئے مرثیے کا دروازہ بند نہیں کیا بلکہ اُس کے دامن کو اپنے اندر مزید وسعتیں سمو لینے کی صلاحیت سے بھی نوازا ہے۔

ڈاکٹر سید صفدر حسین نے "چراغِ مصطفویؐ" لکھ کر مرثیہ کی اسی صلاحیت کو اُجاگر کرنے کی

کوشش کی ہے۔ یہ مرثیہ کلاسیکی انداز سے ذرا ہٹ کر جذبات و کردار نگاری کے ساتھ واقعہ نگاری کا ایک اچھا امتزاج ہے، جسے ایک عمدہ تسلسل و تنظیم کے رشتے میں پرو کر دلکش اندازِ بیان کے ساتھ پیش کر دیا ہے۔ ڈاکٹر صفدر حسین کو تاریخ نگاری کا سلیقہ آتا ہے۔ مرثیے کی محدود تکنیک میں رہ کر انھوں نے جس انداز سے دورِ جاہلیت سے لے کر واقعۂ ہائلۂ کربلا کے حالات بیان کئے ہیں، اُن کی تنظیم و ترتیب کا لحاظ رکھا ہے اور کرداروں کی بشری و روحانی خصوصیات کو جس چابکدستی سے پیش کیا ہے، یہ سب باتیں اس حقیقت کی غماز ہیں کہ تاریخِ اسلام پر صفدر صاحب کی نظر ہے اور وہ اسلام کی روحانی قوتوں سے بھی واقف ہے۔

مرثیے کی موجودہ ہیئت کو دیکھ کر عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ آج کل مرثیے میں وہ عناصر شامل ہو گئے ہیں جن کی وجہ سے مرثیے کا اصل مقصد یعنی غم انگیزی ختم ہوتا جا رہا ہے، حالانکہ بات اس کے بالکل برعکس ہے۔ مصائب سے زیادہ مرثیے کا اصل مقصد جذبۂ ولائے آلِ محمدؐ کو تحریک میں لانا ہے، یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر صفدر کے ہاں حُزن و ملال کی سخت ضربات موجود نہیں، بلکہ نرم الفاظ میں دل کی رگوں پر وہ اس طرح نشتر لگا جاتے ہیں کہ خراش تو محسوس نہیں ہوتی لیکن آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑتے ہیں۔

ریڈیو پاکستان
راولپنڈی

ڈاکٹر سید صفدر حسین

۱۹۶۳ء




ہمارا ذوقِ سخن اِک جہاد ہے صفدر

ہماری تیغِ زباں بے نیام آج بھی ہے

# مقامِ شبیرؑ

پروفیسر مجتبیٰ احسین

ڈاکٹر نیر مسعود

مولانا مرتضیٰ حسین فاضل

# مرثیہ اور جمالیات

جس طرح نماز با جماعت کے امام کے انتخاب میں علم و فضل کے ساتھ حسن و جمال کو بھی معیار سمجھا گیا ہے، اسی طرح ادب و شعر بالخصوص مرثیہ میں جمالیات کو فضیلت حاصل ہے۔ مرثیہ غم اور جمال دونوں کا آمیزہ ہوتا ہے۔ اگر اُس سے جمال کی نفی کردی جائے تو وہ اپنے قابلِ فخر سرمایہ کے بڑے حصّے سے محروم ہوجائے گا۔

اسی احساسِ جمال کے باعث میر انیس مرثیہ کے فن کو جمالِ مُطلق اور جمالِ الٰہی یعنی DIVINE BEAUTY تک لے گئے ہیں۔

ڈاکٹر سیّد صفدر حسین

پروفیسر مجتبیٰ حسین

○

صفدر صاحب مرثیہ کہتے بھی خوب ہیں پڑھتے بھی خوب ہیں۔ اسی لئے اُن کے مرثیے سامع اور قاری، مرثیہ خوان اور مرثیہ گو ان چاروں عناصر سے مل کر تشکیل پاتے ہیں۔ اُن کے مرثیوں میں فکر بھی ہے اور ذکر بھی ہے۔ اُن میں روائتی شان اور نیا اندازِ بیان دونوں موجود ہیں۔ آپ کو اُن کے مرثیوں میں تاریخ اور تاریخی ارتقاء کے اشارے بھی ملیں گے اور گھوڑے اور تلوار کی تعریف بھی۔

وہ شاعر جو صرف مرثیہ گو ہے اور جس نے مجلس کا سامنا کبھی نہیں کیا ہے، شاید مصرعوں کی ترتیب اور بندوں کی تشکیل میں وہ اہتمام ملحوظ نہ رکھ سکے جو ایسے شاعر کے یہاں مل سکتا ہے جو منبر پر بھی مرثیہ خوانی کا حق ادا کرسکتا ہو۔ صفدر صاحب مرثیہ خوانی کا حق ادا کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے ذہن میں مرثیہ ایک ڈرامائی صنف کی حیثیت سے تازہ رہتا ہے۔ اُن کے مرثیے طویل مسدس یا سپاٹ بیانیہ نظموں کی صورت نہیں اختیار کرتے بلکہ ان میں وہ تین لازمی مرحلے ہوتے ہیں جن سے کوئی بھی واقعہ ترتیب پاتا اور وحدتِ تاثیر میں بدل جاتا ہے۔ اُن کے یہاں چہرہ بھی ہے، رزم بھی ہے، اور شہادت بھی ہے یعنی ابتدا بھی ہے، وسط بھی اور انتہا بھی ہے۔ یہی مرثیہ جو "مقامِ شبیری" کے نام سے اُنھوں نے کہا ہے اِس میں وہ تمام اجزا مل جاتے ہیں جن سے قدیم مرثیہ پہچانا جاتا ہے اور لطف یہ ہے کہ اِسی کے ساتھ وہ جدید فکر بھی ملتی ہے جو صفدر صاحب کے مرثیوں کو اُن کے عہد کے حوالے کرتی ہے۔

مرثیہ شروع ہوتا ہے۔ فخریہ یا تعلّی سے ؎

میں ہوں خدیوِ سخن، امیرِ کاروانِ سخن
ہر اِک نفس ہے مرا بادِ بوستانِ سخن

حریمِ اہلِ خرد میرا آستانِ سخن
مرے دیار کے ذرّے ہیں کہکشانِ سخن

جو میری طبعِ رسا بانکپن میں ڈھلتی ہے
تو آسمانِ سخن پر دھنک نکلتی ہے

کئی بند اسی طرح کے کہے گئے ہیں۔ اپنی طبّاعی اور زورِ کلام کے اظہار اور ادّعا سے مرثیہ شروع کرنا کوئی نئی بات نہیں ہے لیکن ذرا ٹھہر کر تعلّی کے ان بندوں پر نظر ڈالئے تو آپ کو کئی ایسے مصرعے چمکتے نظر آئیں گے جو عہدِ حاضر ہی میں کہے جاسکتے تھے ؎

پیامِ امن و مساوات ہے مرا مشرب
مری خودی کی نظرگاہ لامکاں تک ہے
یہ مرثیہ نہیں طوفاں کا استعارہ ہے

فخریئے کے بعد ساقی نامے کے بند شروع ہوجاتے ہیں اور ایک بار پھر صفدر صاحب کا مرثیہ اپنی روایت سے رشتہ جوڑتا نظر آتا ہے۔ اُن کے مرثیوں کا یہ ایک مثبت انداز ہے کہ وہ دورِ جدید کی فضا میں سانس لینے کے باوجود مرثیے کی شاندار روایت کے منکر نہیں ہیں بلکہ اسی روایت کی ایک ارتقائی کڑی ہیں۔ ساقی نامے کا اختتامیہ بند اس مرثیے کی داخلی اور خارجی تشکیل کو اُس ارتفاعی مرحلے کی طرف لے جاتا ہے جہاں پڑھنے یا سننے والے کا ذہن مرثیے کے اصل موضوع کے استقبال کے لئے پوری طرح تیار ہوجاتا ہے۔

جو نشّے میں سرِ منبر یہ مدح خواں پہنچا
تو غُل ہوا مہ و انجم کا راز داں پہنچا
زمیں کی خاک تھا، بالائے آسماں پہنچا
بفیضِ صاحبِ معراج میں کہاں پہنچا

جہاں سے عرش کے تارے دکھائی دیتے ہیں
تجلّیوں کے اشارے دکھائی دیتے ہیں

اس بند پر پہنچ کر دفعتاً مرثیہ تیزی کے ساتھ متعدد ڈرامائی مناظر پیش کرتا ہے۔ انسانی جدوجہد اور تاریخ کے سفر کے مناظر اور پھر کربلا ؂

بہتّر اِن میں جو حاضر دکھائی دیتے ہیں
تو کربلا کے مناظر دکھائی دیتے ہیں
رہِ وفا کے مسافر دکھائی دیتے ہیں
زُہیر و ابنِ مظاہر دکھائی دیتے ہیں
کھُلا ہے دیدۂ احساس دیکھتا ہوں میں
شکوہِ حضرتِ عباسؑ دیکھتا ہوں میں

یہ مناظر شاعر کے موقلم کی جاں آفرینی سے زندہ بن گئے ہیں۔ ان میں حرکت ہے عظمت ہے۔ فرض شناسی اور جذبۂ شہادت کا گہرا رنگ ہے۔ صفدر صاحب بڑے اختصار کے ساتھ مگر فنکارانہ اور مؤثر انداز میں مجاہدوں کی زندگی بخش تصویر کھینچتے ہوئے اُس منزل کی طرف بڑھ رہے ہیں جہاں سالارِ کارواں، انصار اور عزیزوں کی لاشیں دفن کرکے آخری فرض یعنی شہادت ادا کرنے کی تیاری کر رہا ہے۔ قدیم مرثیوں میں اختصار کرکے ساتھ حسینؑ کے رُفقا اور اعزہ کی شہادت کا بیان ہوتا آیا ہے۔ یہ بھی کوئی نئی بات نہیں ہے مگر جو بات دیکھنے کی ہے وہ یہ کہ واقعۂ کربلا خود کوئی نیا موضوع نہیں ہے۔ یہ ہر شاعر کے اندازِ فکر کے ساتھ نئی معنویت لئے ہوئے اُبھرتا ہے۔ صفدر صاحب کے یہاں اختصار کا یہ رنگ بظاہر ایک طائرانہ نگاہ کا اندازہ رکھتا ہے لیکن حقیقتاً یہ ایک بڑے منظر کی تصویر کشی کی تیاری ہے ـــ بلندی سے نگاہ مختلف مناظر کا جائزہ لیتی ہوئی (ان مناظر میں کتنی مرتبیت ہے یہ بھی دیکھیے) ایک ایسے شخص پر آکر مرکوز ہو جاتی ہے جس سے یہ تمام مناظر تابانی پاتے ہیں۔ اس شخص کا نام محمد مصطفےٰ نے حسینؑ رکھا تھا ـــ علیؑ اور فاطمہؑ کا بیٹا اور حسنؑ کا چھوٹا بھائی ـــ جب مرثیہ نگار کی نظر اس "شخص" پر ٹھہرتی ہے تو زمین نہ آسمان سب پر یہ عظیم شخصیت چھائی نظر آتی ہے۔ صفدر صاحب کی فنکاری اور چابکدستی اس میں ہے کہ چھوٹی چھوٹی تصویریں

تصویریں بناتے بناتے یکایک وہ ایک بہت بڑی تصویر کے لئے نظر کو تیار کر دیتے ہیں۔ یہ تصویر ملاحظہ ہو ؎

میں دیکھتا ہوں کہ مقتل میں بعدِ دفن پسر
کھڑا ہے مالکِ مُلکِ رضا جھکائے سَر
ہے اک قدم سوئے خیمہ تو اک قدم ہے اُدھر
نظر جو دور سے آتی ہے تُربتِ اصغرؑ

رباب خیمے سے سینہ تپاں نکلتی ہیں
اب آنکھیں موند لو سیدانیاں نکلتی ہیں

اور صبر و رضا کی اس جمالی تصویر کے بعد جلالی تصویر سامنے آتی ہے ؎

بس اب مجاہدِ صبر و رضا جلال میں ہے
امامِ مسلکِ کرب و بلا جلال میں ہے
مسیحِ اُمتِ خیر الوریٰ۔ جلال میں ہے
امینِ مرضیِ ربِّ علیٰ جلال میں ہے

دلیلِ نصرتِ حق بے نیام ہوتی ہے
خدا کی آخری حجّت تمام ہوتی ہے

اس بند کے بعد پہلے مصرعے کو دیکھیئے ۔ ع

بس اب مجاہدِ صبر و رضا جلال میں ہے

"بس اب" کے ٹکڑے نے مرثیے کو رزمیہ موڑ کی طرف بڑھا دیا ہے اور "مجاہدِ صبر و رضا" کی معنویت پر غور کیجیے۔ صبر و رضا کے جہادِ اکبر کے تمام کٹھن مراحل سامنے آتے جائیں گے۔ مگر یہ دلبری بے قاہری نہیں ہے۔ یہ محمدِ عربی کے اُس نواسے کی شخصیت کی تصویر ہے جس کے لئے آپ نے کہا تھا کہ "حسینؑ مجھ سے ہے اور میں حسینؑ سے ہوں"۔ اسی لئے اس میں وہ جمال و جلال ہے جو خود رسولؐ میں تھا۔ صفدر صاحب نے ایک مصرعے میں قولِ رسولؐ سے حسینؑ کے

جلالی پہلو کی سند پیش کی ہے ؎

گواہ قولِ نبیؐ ہے مری جلالت پر

اس کے بعد مرثیہ میدانِ جنگ میں آجاتا ہے۔ شروع میں کہا جاچکا ہے کہ صفدر صاحب مرثیہ پڑھتے بھی خوب ہیں۔ اس ٹرہت نے ان کے مصرعوں میں جوش اور نرتی پیدا کی ہے اور ٹیپ میں وہ زور پیدا کیا ہے کہ مجلس گونج اُٹھے ؎

چلی جو تیغ تو بازوِ اجل کا کَسنے لگا
قضا کا سانپ سیاہِ عدو کو ڈسنے لگا
جنودِ کفر جہنم میں جا کے بسنے لگا
جھڑی سروں کی لگی خوں کے مینہ برسنے لگا

خلا میں وقت کی کشتی بہاؤ پر آئی
خدا کے قہر کی ندی چڑھاؤ پر آئی

وہ خوفِ جاں ہے کہ رہوار مُنہ چھپاتے ہیں
فرس لرزتے ہیں، اسوار تھرتھراتے ہیں
ہوا اُکھڑتی ہے، جرّار مُنہ کی کھاتے ہیں
صفوں کو چھوڑ کے سردار بھاگے جاتے ہیں

ہے شام صبح سے اور صبح شام سے آگے
زمین بڑھ گئی اپنے نظام سے آگے

جنگ کے بعد مرثیہ اپنی روایتی ترتیب کے مطابق منزلِ شہادت پر پہنچ جاتا ہے ؏

بس ایک مرحلۂ خنجر و گلو ہے اب

آخری جتنے بند ہیں وہ اِس شہادتِ عظمیٰ کے تاریخ ساز اثرات کا جائزہ اور خود تنقیدی کا درجہ رکھتے ہیں۔ یہ شاعر کی تاریخی آگہی، اندازِ فکر اور اندازِ نظر کا ثبوت ہیں۔ یہ بند ہمیں بتاتے

ہیں کہ مرثیہ اس آشوبِ فکر کے دَور میں بھی زندہ رہ سکتا ہے اور اپنے شعری محاسن اور بلند مقام کو برقرار رکھ سکتا ہے۔

اُردو کے قدیم مرثیوں پر صفدر صاحب گہری نظر رکھتے ہیں اور مرثیہ نگاری کے رموزِ فنی سے آگاہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس اہم ترین صنف کو سلیقے سے برتنا جانتے ہیں۔ مگر اسی کے ساتھ وہ قدامت پسند نہیں ہیں۔ وہ روایت کا احترام کرتے ہیں۔ خود روایت زدہ نہیں ہیں۔ زندگی اور فن کے جدید تقاضوں کے لئے اُن کی فکر کے دروازے کھُلے رہتے ہیں اسی لئے اُن کی آواز میں توانائی ہے۔ اُن کی فکر میں جراُت اور اُن کے قلم میں طاقت ہے۔!

کوئٹہ

۱۴۔ اگست ۱۹۷۵ء

ڈاکٹر نیّر مسعود

(۲)

علامہ جمیل مظہری نے اپنا ایک مرثیہ اِس بیت پر ختم کیا ہے۔

پھول سب ڈھونڈتے ہیں، داغ دکھاؤں کس کو
سُننے والا نہیں ملتا ہے سُناؤں کس کو

مرثیے کا رواج اور مقبولیت کم ہو جانے اور قارئین کے فقدان کی وجہ سے نئے مرثیہ نگار کو جس حوصلہ شکنی سے دوچار ہونا پڑتا ہے، یہ بیت اُس کا اظہار کرتی ہے۔ لیکن نئے مرثیہ نگار کی راہ میں اور بھی کئی مُشکلات ہیں۔ چونکہ مرثیے کے زوال سے اِن مشکلات کا براہِ راست تعلق ہے، اِس لیے اِن کا مختصر تذکرہ ضروری ہے۔

میر انیس کے زمانے تک صنفِ مرثیہ اپنے عروج کو پہنچ چکی تھی، اور یہ عروج اُسے خاص طور پر میر انیس ہی کے ہاتھوں حاصل ہوا تھا۔ دَورِ عروج میں مرثیے کا ایک مخصوص سانچہ بن گیا اور اس کے اجزائے ترکیبی معیّن ہو گئے۔ گو شروع میں مرثیے کی کوئی مقرر شدہ ہئیت نہیں تھی لیکن اب اس کے لیے مسدّس کی ہئیت مُسلّم ہو چکی تھی۔ انیس اور اُن کے باکمال معاصروں نے اس ہئیت میں اپنے فن کے جوہر اُتار دیئے اور مرثیے کی ایک ایسی فضا بنا دی جس سے جُداگانہ کسی فضا کا تصوّر نہ صرف مرثیے کے ساتھ بلکہ واقعۂ کربلا کی تصوّراتی فضا کے ساتھ بھی میل نہیں کھاتا۔

یہیں سے نئے مرثیہ نگار کی مُشکلوں کا آغاز ہوتا ہے۔ وہ مجبور ہے کہ مُسدّس میں مرثیہ کہے۔ اِس لیے کہ اگر وہ کسی اور ہئیت میں مرثیہ کہتا ہے تو اُس کو مرثیہ سمجھا ہی

نہ جائے گا۔ مُسدّس میں بھی وہ مجبور ہے کہ مرثیے کی مانوس فضا کو برقرار رکھّے۔ یہ مانوس فضا برقرار رکھنے کے لیے وہ مجبور ہے کہ انیسؔ اور اُن کے معاصرین کا انداز اختیار کرے۔ مختصراً اُس کے مرثیے کا منتہائے کمال یہ ہونا چاہیے کہ اُس پر انیسؔ کے مرثیے کا گمان ہو۔ اور انیسؔ کا سا مرثیہ کہنا کارے دارد۔ چنانچہ بعد کے اچھے اچھے مرثیہ نگاروں نے اِسی سعیِ لاحاصل میں اپنی صلاحیتیں ضائع کر دیں اور اُن کا مرثیہ انیسؔ کے مرثیے کی کمزور سی بازگشت کے سوا کچھ نہ رہا۔

* بعض نئے مرثیہ نگاروں نے (جن میں جوشؔ ملیح آبادی کا نام سب سے پہلے ذہن میں آتا ہے) جب دیکھا کہ بیانیہ مرثیے میں وہ انیسؔ کے سحر سے نہیں نکل سکتے تو اُنھوں نے ایک اور سبیل نکالی۔ وہ یہ کہ اُنھوں نے مرثیے میں سے بیانیہ عنصر نکال کر واقعۂ کربلا کے محض اخلاقی اور حکیمانہ پہلوؤں پر مُبصّرانہ نظر ڈالنا شروع کی اور اس واقعے کی معنویت کو اپنے عہد کے سیاق وسباق میں ظاہر کرنے لگے، مگر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس طرح کے بیشتر نئے مرثیے اقبالؔ کے اُن متفرق اشعار کی طویل مگر پھر بھی کمزور بازگشت بن کر رہ گئے جن میں امام حسینؑ کی شہادت عہدِ حاضر کے لیے ایک علامت بن کر سامنے آتی ہے۔ اور اقبالؔ نے اس علامت میں جو قوّت بھر دی ہے، نئے مرثیے ایک طرف تو طولِ کلام کے باعث اُس قوّت سے محروم رہے، دوسری طرف اُن میں سے حُزنیہ کیفیت بھی رُخصت ہوگئی۔ اس کے علاوہ بیانیہ عنصر تقریباً ختم ہو جانے کی وجہ سے اُن میں مرثیے کی مانوس فضا بھی باقی نہ رہی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بعض حضرات نے اِن نئے مرثیوں کو مرثیہ ماننے سے انکار کر دیا اور انھیں محض مُسدّس نظم قرار دے دیا۔ یہ کچھ زیادتی تھی۔ بہر کیف اس میں بھی شک نہیں کہ یہ حکمت مآب مرثیے فقط اپنے بنیادی موضوع اور مُسدّس ہیئت کی وجہ سے مرثیے تھے۔

اب اگر کوئی حوصلہ مند شاعر مرثیہ کہنا چاہتا ہو، مرثیے کی مانوس فضا بھی برقرار

رکھنا چاہتا ہو، مگر اسی کے ساتھ یہ بھی چاہتا ہو کہ اُس کا مرثیہ میر انیسؔ وغیرہ کی بازگشت بن کر نہ رہ جائے، تو وہ کون سا راستہ اختیار کرے؟ اس سوال کا جواب ہمیں ڈاکٹر صفدر حسین کے مرثیوں میں ملتا ہے۔ ڈاکٹر صفدر نے نئے مرثیہ نگار کے مسائل کو بڑی خوش اسلوبی سے حل کر لیا۔ انھوں نے مُسدّس کی ہئیت میں واقعۂ کربلا کی معنویت، پیغام اور اثرات کو نمایاں کرنے کے ساتھ ساتھ مرثیے کی مانوس فضا بھی دکھانا شروع کی جس کا اثر یہ ہے کہ اُن کے مرثیوں میں ہم وہی میدانِ کربلا اور اُس کی وہی فضا دیکھتے ہیں جس سے ہم کو انیسؔ وغیرہ مانوس کر گئے ہیں لیکن اس میدان میں روشنی کئی زاویوں سے پڑ رہی ہے۔ انھیں نئے زاویوں کے وسیلے سے ڈاکٹر صفدر حسین کی اپنی شاعرانہ شخصیت بھی ان مرثیوں میں حلول کر جاتی ہے۔ اور یہ مرثیے ایک ایسی فضا قائم کرتے ہیں جو بہ یک وقت مانوس بھی ہے اور منفرد بھی۔

پیشِ نظر مرثیہ "مقامِ شبیریؑ" بھی ڈاکٹر صفدر حسین کے دوسرے مرثیوں کی طرح قدیم و جدید عناصر سے مُرکّب ہے۔ مرثیہ شاعرانہ تعلّی سے شروع ہوتا ہے، لیکن جلد ہی اِس تعلّی کو ساقی نامے میں اس طرح مُدغم کر دیا گیا ہے کہ دونوں لازم و ملزوم ہو گئے ہیں اور روایتی مرثیے کے دو الگ الگ رسمی اجزا نہیں معلوم ہوتے۔ اِس اِدغام کی ایک اور خوبصورت مثال ساقی نامے سے واقعۂ کربلا کا ربط ہے۔ یہی صورت جہادِ حسینؑ میں رَجز، جنگ اور شہادت کے اجزا کی ہے۔ کہیں بھی یہ محسوس نہیں ہوتا کہ شاعر، مرثیے کے اجزائے ترکیبی میں سے ایک جُز ختم کر کے دوسرے جُز پر آ گیا ہے۔ یہ ڈاکٹر صفدر حسین کی غیر معمولی فنّی دستگاہ کا کرشمہ ہے کہ اُن کے مرثیے میں ایک جُز دوسرے جُز کی جگہ لیتا دکھائی نہیں دیتا بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہی جُز تبدیلِ ماہیت کرتا ہوا دوسرے اجزا کی شکل میں ڈھلتا چلا جا رہا ہے۔ گویا مرثیہ ایک

بنیادی وحدت ہے اور یہی وحدت کبھی شاعرانہ تعلّی بنتی ہے، کبھی ساقی نامہ، کبھی رَجز، کبھی جنگ اور کبھی شہادت۔ مختلف اجزا کے ارتباط کا یہ کمال کم مرثیوں میں نظر آتا ہے۔

ڈاکٹر صفدر حسین اُنیسی مرثیے کی فضا برقرار رکھنے میں بھی حیرت خیز طور پر کامیاب ہیں۔ یہ فضا اِس قسم کے بندوں میں قائم ہوئی ہے۔

بڑھا اِدھر سے جو مرکب اُدھر فرس چمکے    یہ حال دیکھ کے نشّے ہرن ہیں ضیغم کے
زمیں سے اُٹھتے ہیں جب اُس کے پاؤں جم جم کے    ندا یہ آتی ہے افلاک سے کہ تھم تھم کے
زمیں کا حال جو ہے وہ ہمارا حال نہ ہو
ٹھہر کہ کھیت ستاروں کا پائمال نہ ہو

اور اس کے ساتھ شاعر کا اپنا معاصر لہجہ بھی برقرار ہے:

سلام آپ کی تشنہ لبی کو اَے مَولا    کہ جس نے موڑ دیا زندگی کو اَے مَولا
ستارے بخش دیئے تیرگی کو اَے مَولا    مقامِ عشق بلا رہبری کو اَے مولا
لہو سے اہلِ ستم کے دماغ کو دھویا
جبینِ دیں سے سیاست کے داغ کو دھویا

اِس مرثیے میں ایک حقیقی قوّت کا احساس ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ قوّت محض انیس کی تقلید کا نتیجہ نہیں ہے۔ دراصل شاعر مرثیے کی روایت سے بخوبی واقف ہے اور یہ روایت اُس کی شخصیت کا جُزبن گئی ہے، لیکن خود اُس کا مرثیہ انیسی مرثیے کی آوازِ بازگشت بن کر نہیں رہ جاتا، اس لیے کہ مرثیے کی گذشتہ عظیم روایت اُس کے لیے نمونے کا نہیں، مُحرّک کا کام کرتی ہے۔

"مقامِ شبّیری" کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس مرثیے میں واقعاتِ کربلا کو حکمت و اخلاق کے درسوں میں لپیٹنے کے بجائے خود ان واقعات کی طرف ذہنوں کو متوجہ

کیا گیا ہے۔ مگر یہ واقعات کا سیدھا سادھا بیان بھی نہیں ہے۔ شاعر کی انتہائی سلیقہ مندی کا ثبوت دراصل یہی ہے کہ اُس نے بیانِ واقعہ کو نہ تو مقصود بالذات رکھا ہے، نہ پند و موعظت کا وسیلہ بنایا ہے۔ اُس نے اپنے مرثیے کے تار و پود ایسے رکھے ہیں کہ اسے پڑھنے والا یہ سوچنے پر مجبور ہوتا ہے کہ کربلا میں جو کچھ پیش آیا وہ ایک نہایت المناک مگر اتنا ہی مہتم بالشّان واقعہ بھی تھا۔ وہ محض ایک تاریخی حادثہ نہیں تھا، وہ ایک زبردست قربانی تھی اور اس قربانی کی کہانی وہیں پر ختم نہیں ہوئی، اس قربانی کا کچھ نہ کچھ تعلق ہم سے بھی ہے، اور اس سلسلے میں ہمارے ذمّے بھی کچھ عائد ہوتا ہے۔

ڈاکٹر صفدر حسین نے یہ باتیں براہِ راست تلقین کے پیرائے میں نہیں کہی ہیں بلکہ اُن کا قاری مرثیہ پڑھ کر از خود اپنے ذہن میں کچھ سوالات بنانے لگتا ہے، اور اُن جوابوں کی تلاش میں واقعۂ کربلا کے مضمرات تک پہنچتا ہے اور شاعر کی کامیابی یہی ہے۔

لکھنؤ یونیورسٹی

۲ مئی ۱۹۷۶ء

مولانا مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی

(۳)

ڈاکٹر سید صفدر حسین، ادب، تاریخ، تنقید، شعر گوئی اور مرثیہ شناسی کے میدان میں نامور مصنف اور بلند پایہ محقق مانے جاتے ہیں۔ صفدر صاحب نے لکھنؤ میں اُس وقت مرثیہ کا مطالعہ کیا جب اُس شہرِ علم و ہنر میں اعلیٰ درجے کے مرثیہ گو موجود تھے۔ اُنھوں نے اب سے تیس بتیس برس پہلے لکھنؤ کی تاریخ و ثقافت پر تحقیقی کام کیا اور اس پس منظر میں فنِ مرثیہ نگاری و مرثیہ پر اعلیٰ درجے کے مقالات لکھے۔ اُن کی کتاب "مرثیہ بعدِ انیسؔ" اُن کی نظر کے طویل سفر کی دستاویز ہے۔

ڈاکٹر صفدر حسین خاندانی طور پر مرثیہ کی روایت کے حامل ہیں۔ قدیم و جدید اَدب کے عمومی مطالعے اور بے شمار مرثیوں پر نظر نے اُنھیں اس موضوع پر صحیح رائے قائم کرنے کا حق دیا ہے۔ مغربی ادب پر اُستادانہ دسترس اور روایتی مرثیہ سے والہانہ وابستگی کے بعد اُنھوں نے کئی مرثیے لکھے۔ ظاہر ہے اُن مرثیوں میں تجدد اور ترقی کی چھاپ اُبھری اور صفدر صاحب جدید مرثیہ نگاروں میں ممتاز درجہ کے مالک ہوئے۔

میں نے "آئینِ وفا"، "چراغِ مصطفویؐ" اور "مقامِ شبیریؑ" کا مطالعہ کیا ہے۔ اُن کا دوسرا مطبوعہ مرثیہ "جلوۂ تہذیب" بھی پڑھا۔ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ ڈاکٹر صاحب "رقصِ طاؤس" اور "نگارِ غزل" و "چراغِ دیر و حرم" کے شاعر ہونے کے باوجود مرثیہ میں کس قدر محتاط ہیں۔ مرثیہ کا تقدس اور اُس کی کلاسیکی حیثیت کو کس قدر عزیز رکھتے ہیں۔ اُن کے کسی مرثیے میں، سیاست، جا بہ جا جدلیاتی فلسفہ، نعرہ، انقلاب، اور خاص قسم کے ہلکے اور

شہرت طلب رُجحانات نہیں ہیں۔ وہ مرثیہ میں سنجیدگی کے قائل ہیں۔ وہ مرثیہ کے ڈھانچے کو بدلنے کے روادار نہیں۔ وقت اور نئے تقاضوں کے پیشِ نظر، لہجہ میں نیا پن ہے۔ یعنی تقلید سے گریز ہے۔ نئے فلسفوں کا سایہ تو ہے مگر اُس کا پرچار نہیں ہے۔ سادہ اور سڈول انداز، مرثیہ کے روایتی مزاج کا رکھ رکھاؤ اور اُس کی بنیادی علامتوں کا اظہار ڈاکٹر صفدر کا فنی رُجحان ہے۔

چہرہ، ساقی نامہ، رجز، تلوار، جنگ، بھگدڑ، شہادت، بین، اور اسی میں سراپا اور دوسرے لوازم کے اشارے مل جاتے ہیں۔ چہروں میں جدّت و تازگی، موضوع کی نمود اور اَنا کا اظہار ہے۔ جلوۂ تہذیب اور چراغِ مصطفویؐ کے چہرے وقت کے ترجمان ہیں اور مرثیہ، مقامِ شبیریؑ شاعر اور فن کی نمود سے شروع ہوتا ہے۔

مَیں ہوں خدیوِ سُخن، میر کاروانِ سُخن
ہر اک نفس ہے مرا بادِ بوستانِ سُخن
حریمِ اہلِ خرد میرا آستانِ سُخن
مرے دیار کے ذرّے ہیں کہکشانِ سُخن

جو میری طبع رسا بانکپن میں ڈھلتی ہے
تو آسمانِ سُخن پر دھنک نکلتی ہے

پیمبری سے مری فکر کا ملا ہے نسب
نزولِ وحی کا پرتو ہے میری جُنبشِ لب
پیامِ امن و مُساوات ہے مرا مشرب
مرے حضور مودّب ہیں عاملانِ ادب

غرورِ دانش و تقویٰ کو توڑتا ہوں مَیں
کہ پتھروں سے بھی پانی نچوڑتا ہوں مَیں

ایک قوس کے دو کنارے ہیں ایک بانکپن سے عبارت ہے جو دھنک ابھارتی ہے۔ دوسرا کنارہ پتھر کو نرماتا اور اُسے چشمہ میں بدل دیتا ہے۔ اس کیفیت کا نتیجہ یہ ہے کہ،

نہ پوچھ میرے تخیل کی حد کہاں تک ہے
جہاں خرد کی رسائی نہیں وہاں تک ہے
مری خودی کی نظرگاہ، لامکاں تک ہے
دراز دستِ جنوں، شاخِ کہکشاں تک ہے

کہ سطحِ نطق جہاں تک قریب لا کے اُسے
ستارے توڑ رہا ہوں، جُھکا جُھکا کے لئے

اَنا کے اِس اظہار میں شگفتگی اور دل کشی، شعریت و ذوق کا ایک عالم ہے۔ شاعر جس نشاط و سرخوشی میں ہے وہ ہر بیت کے آخری مصرع میں پوری طرح مجسّم ہے۔ رعنائیٔ خیال، شعورِ فن اور نزاکتِ ادا کی یہ نفیس تصویریں ہیں۔

بات بڑھ جائے گی اور ہر ہر بند پر نظر اور ہر ہر جُز پر بحث تفصیل طلب ہے، سرِ دست تو بقول صفدر صاحب:۔

مری نظر میں ہے ربط آفتاب و شبنم کا
میں دیکھتا ہوں ہبوط و صعود آدم کا

آفتاب، نئے افکار ہیں اور شبنم آبروئے روایات۔ نومولود سبزہ و گیاہ کی رعنائیٔ شبنم سے ہے اور حرارت و زندگی آفتاب سے، اسی تقابل نے روایت و جدّت کا آمیزہ تیار کیا ہے۔ ساقی نامے میں قطرۂ شبنم کی ڈھلک اور آفتاب کی تابنا کی ہے۔

مرا یہ جوشِ سخن، مستیٔ شرابِ طہور
مری گشادہ دلی اس کی برکتوں کا ظہور

ترے کرم سے ملا مجھ کو اک لطیف شعور
اِک انبساطِ خودی، ایک تندرست غرور

مئے خرد میں مئے عشق گھول دی تو نے
یہ جام دے کے مری آنکھ کھول دی تو نے

اِسی جذب و کیف، فکر و شعور کے جزر و مد میں مرثیہ ساقی نامہ سے آمد تلوار، رجز اور جنگ تک پہنچتا ہے اور مُقربانِ خدا، انبیاء کرام، جن و ہوا غرض سارا جہان صفِ بستہ امامؑ کے سامنے حاضر ہے :۔

مگر کسی کی اعانت کا اب سوال نہیں — اُبھر رہا ہے وہ سورج جسے زوال نہیں
چکھا دوں تیغِ شرر بار کا مزا اِن کو — یہاں بھی دے دوں کچھ اعمال کی سزا اِن کو
ابھی زمین کے طبقے ہلائے دیتا ہوں — غرورِ تاج و سیاست مٹائے دیتا ہوں

فرس پہ جلوہ نُما تھا جو کائنات کا نُور
چمک سے خانۂ زیں بن گیا تھا رُوکشِ طُور
بسانِ شیرِ الٰہی بڑھے جو تن کے حضورؑ
تو رنگِ چہرۂ فوجِ ستم ہوا کافور

وفورِ خوف سے سینوں میں دل ہلنے لگا
نمودِ تیغ سے پہلے شباب ڈھلنے لگا

عکاسی، بھرپور ابلاغ اور آہنگ کے ساتھ اختصار خوب صورت بند کی خصوصیت ہے اور صفدر صاحب کی قدرتِ فن کا نمونہ۔ اِسی طرح گھوڑے کی تعریف میں لکھتے ہیں :۔

بڑھا اِدھر سے جو مرکب، اُدھر فرس چمکے
یہ حال دیکھ کے نقشے ہرن ہیں ضیغم کے

زمیں سے اُٹھتے ہیں جب اِس کے پاؤں تھم تھم کے
ندا یہ آتی ہے اَفلاک سے کہ تھم تھم کے

زمیں کا حال جو ہے وہ ہمارا حال نہ ہو
ٹھہر کہ کھیت ستاروں کا پائمال نہ ہو

احساسِ نزاکت کا نتیجہ یہ ہے کہ صفدر صاحب لیڈروں کی طرح للکارنا پسند نہیں کرتے، اُن کے اندازِ پیام رسانی میں واعظانہ اسلوب نہیں ہے۔ وہ بڑی نرمی سے کہتے ہیں:۔

سلام آپ کی تشنہ لبی کو اَے مَولا
کہ جس نے موڑ دیا زندگی کو اَے مَولا!
ستارے بخش دیئے تیرگی کو اَے مَولا
مقامِ عشق ملا رہبری کو اَے مَولا

لہو سے اہلِ ستم کے بدماغ کو دھویا
جبینِ دیں سے سیاست کے داغ کو دھویا

تشنہ لبی کا معجزہ ہے جس نے زندگی کے سیلاب کا رُخ موڑ دیا، ورنہ اسلام کا سب کچھ بہہ جاتا۔ ہر طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا، امام حسین علیہ السلام نے اندھیرے کو بہتّر ستارے بخشے اب رہنمائی کے لیئے وہی ستارے روشنی دے رہے ہیں۔ اس رہبری کے نزدیک عشقِ کامل اور احساسِ ذات سے ماوراء ہونا ضروری ہے جس کا مقام یہ ہو ؏

"یقین جس سے خودی کو خدا کی قدرت پر"

اللہ کے بھروسے پر گھر لُٹا دے، بچّوں کی ہمّت اور جوانوں کا جذبہ قربان کر دے۔ بہتّر قربانیاں! جوان، بوڑھے، شیرخوار اور نونہال ہر قسم کے فدیئے، حضورِ باری میں پیش

کردیے، یعنی مقامِ شبّیریؑ یہ ہے کہ شاعر نے سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم سے عرض کی ہے

حضور آپ کی عترت نے جو مہم سر کی
وہی کمائی ہے اس ملّتِ بد اختر کی
نواسیوں نے بھی دی بھینٹ اپنی چادر کی
وہ پُشت، اُٹھ نہ سکی جس سے لاش اکبرؑ کی

اُٹھایا اُمّتِ عاصی کا بارِ فرض اُس نے
چُکائے آپ کی شفقت کے سارے قرض اُس نے

یزید جو دینی حکومت کا ٹائیٹل لیئے "خلیفہ" جیسا مقدّس منصب سنبھالے بیٹھا، روم وعجم کی سیاسی چالیں چل رہا تھا، اسلامی زعامت کا مُدّعی اور مکّہ و مدینہ کے در و دیوار مسمار کرنے کی فکر میں غلطاں و پیچاں تھا، جس نے ظلم و ستم کے طوفان کھڑے کیئے اور مطمئن ہو گیا کہ اب کون بول سکتا ہے۔ اُس وقت امام حسین علیہ السّلام نے اپنے کردار سے اُسے ٹوکا اور اپنے پاک لہو سے دین کی پیشانی کو دھویا۔ اِس پیشانی پر یزیدی سیاست نے دھبّہ ڈال دیا تھا۔ امام کے عزم و استقلال اور آپ کی عظیم قربانی پر یہ لطیف گفتگو اور شاعرانہ خراجِ تحسین اِس مرثیہ کا مقصد ہے۔

ڈاکٹر سید صفدر حسین کی اُستادانہ مہارت اور شاعرانہ قدرت، مرثیے کے بارے میں اُن کا جذبۂ احترام اور اس صنفِ سخن کی عظمت سمجھنے کے لیئے یہ مرثیہ پڑھ کر دیکھا تو میں نے محسوس کیا کہ تمام اَوصافِ فن اِس میں موجود ہیں۔ ہیئت، ترتیب، روح، اثر اور اصلاحی جذبات، فکری تاثرات، روایت کے لیے صحیح سمت کا تعیّن، صفدر صاحب کے ہر مرثیے میں ہے۔ اس مرثیے میں جو بات نمایاں ہے وہ مرثیے

ہے۔ یعنی مجلسِ عزا کے خاص روایتی مطالبات کا لحاظ اور ادائگی کے خاص خاص نکتوں کی رعایت، رزمیہ بند اور المیہ و بکائیہ بندوں کی معتدل مناسبت اور اثر انگیزی کا پورا پورا خیال۔ انھیں اصول و ضوابط کی بنا پر یہ مرثیہ نفیس و کامل مرثیہ ہے۔

۱۵۔ مغل پورہ لاہور

۲۷ر جمادی الاولیٰ ۱۳۹۶ھ

مرثیہ نگاری پر

# عمومی تبصرہ

پروفیسر سلیم اختر

ڈاکٹر اسد اریب

ڈاکٹر احراز نقوی

۱۰

## دلیلِ کم نگہی قصۂ قدیم و جدید!

ہر ذی شعور شاعر نہ اپنے ماضی سے بیگانہ ہوتا ہے اور نہ حال سے بے خبر! اُس کی نظر مستقبل کے امکانات و مطالبات کا بھی احساس رکھتی ہے۔ پھر یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ فلاں شاعر قدیم ہے اور فلاں جدید!

ہمارا نام نہاد جدید مرثیہ ابھی مسدسِ حالی کی صدائے بازگشت اور اقبال کے تصورِ مردِ مومن کی پرچھائیوں سے خود کو باہر نہیں نکال سکا۔ اِسے خواہ آپ تبلیغی کہیں یا استدلالی لیکن یہ عموماً ایک طرح کی APOLOGY یا عُذر خواہی ہے۔ اس کی فضا یہ تصور دیتی ہے کہ جیسے امامِ عالی مقام سامعین کی عدالت میں پیش ہیں اور شاعر اپنے دلائل سے اُن کی وکالت کر رہا ہے!

ڈاکٹر سیّد صفدر حسین

پروفیسر سلیم اختر

(۱)

ڈاکٹر سیّد صفدر حسین نے خود مرثیے لکھنے کے ساتھ ماضی کے معروف مراثی مُرتّب کر کے شائع کرانے کا جو سلسلہ شروع کر رکھا ہے، وہ اس قدر اہم ہے کہ جُدا عنوان کا متقاضی بن گیا ہے۔ ڈاکٹر صفدر نے "جلوۂ تہذیب" کے بعد "چراغِ مصطفویؐ" کے نام سے ایک اور مرثیہ حضرتِ امام حسینؑ کی سیرت و احوال پر لکھا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے بیاں و یزدانی کی کتابیں "رنگِ شہادت" اور "قندیلِ حرم" اور سیّد حسن رضا حسن کی "محفلِ اعجاز" بھی مفید دیباچوں کے ساتھ مُرتّب کر کے شائع کی ہیں۔ اور حال ہی میں "نادراتِ مرزا دبیرؒ" کے نام سے دبیر کے غیر مطبوعہ مراثی مرتب کئے ہیں۔ یہ تمام کام بذاتِ خود بے حد اہم اور مستقل اہمیت کا حامل ہے۔

مطبوعہ: اُردو ادب کی مختصر ترین تاریخ

صفحہ ۲۸۱ و ۲۸۲

ڈاکٹر اسد اریب

(۲)

مُسدّس کے مضامین میں فلسفیانہ جدّت اور خوبیِ اظہار کا بہترین مرقع، ڈاکٹر سید صفدر کے مراثی آئینِ وفا، جلوۂ تہذیب اور چراغِ مصطفویؐ ہیں۔ شاعرِ موصوف نے واقعاتِ کربلا کو فکر و نظر کے لئے آہنگ دیئے ہیں اور بعض واقعات اور سانحات کو تو تمثیل کی اُس خوبی تک پہنچا دیا ہے کہ اُنھیں یونگ کی اصطلاح نفسی میں "آرکی ٹائپ" کہنا چاہیئے۔ نام نہاد ترقی پسندوں اور اُن دوستوں کو بالخصوص جو یہ کہتے ہیں کہ مرثیہ مائل بہ زوال ہے، ڈاکٹر صفدر حسین کے "جلوۂ تہذیب" کا کم از کم چہرہ ہی دیکھ لینا چاہیئے تاکہ اُن کی رائے میں تبدیلی پیدا ہو سکے۔ ان تینوں مرثیوں کے کردار نہ تو خیالی ہیں، نہ موہوم اور نہ غیر ضروری۔ زبان ان کی جاندار ہے۔ خیالات ان کے شعور کی رَو کے ساتھ ساتھ تاریخ اور تمدن کی ہر سانس سے سانس ملاتے ہوئے چلتے ہیں۔

کربلا کے معرکے میں بشری معیارِ فضیلت کے سلسلے میں علم و آگہی کی اہمیت بیان کرتے ہوئے کہا گیا ہے۔

قلبِ فطرت میں خودی جب خلش انگیز ہوئی
یعنی شمعِ دلِ آدمؑ کی جو لَو تیز ہوئی
سینۂ ظلمت کا پھٹا، صبح جنوں خیز ہوئی
زندگی ابلقِ ایام کو مہمیز ہوئی
کھا کے ٹھوکر قدمِ عزم کی جادے جاگے
سینۂ دہر میں خوابیدہ ارادے جاگے

نازِ تخلیق یہی رازِ تجلّی بھی یہی
جلوۂ طور یہی آتشِ سینا بھی یہی
سینۂ گوتم و زرتشت کا شعلہ بھی یہی
حُسنِ یوسفؑ بھی یہی ہے یدِ بیضا بھی یہی

یہی ناگاہ دلِ کوہِ صفا سے نکلا
مشعلِ نور لئے غارِ حِرا سے نکلا

(جلوۂ تہذیب)

آئینِ وفا میں حضرتِ عباسؑ کے ادب و آگہی کا منظر ان لفظوں میں کھینچا گیا ہے۔ وہ دریا پر جاتے ہوئے حضرتِ امام حسینؑ سے وعدہ کر رہے ہیں کہ :۔

وعدہ کرتا ہوں کہ تلوار نہ لے جاؤں گا
مشکیں خاموشی سے بھر لوں گا چلا آؤں گا
صبر حضرت کا نمونہ انھیں دکھلاؤں گا
سر جھکا کر تبر و تیر و سناں کھاؤں گا

ایک نیزے کی اجازت ہو ضرورت کے لئے
وہ بھی اپنی نہیں، مشکوں کی حفاظت کے لئے

اقتباس از "مرثیے کاسیمی کولن"

ڈاکٹر احراز نقوی

(۴)

جدید مرثیہ کا ورثہ ہمارے یہاں بہت ہی کم ہے۔ مرثیے کے معاملے میں بیسویں صدی کی دوسری اور تیسری دہائی کے شعرا کو بھی ہم جدید مرثیہ نگار تسلیم کرتے ہیں یا اُس عہد کے مرثیہ گویوں کو ہم جدید مرثیے کا اب بھی شاعر تسلیم کرتے ہیں۔ یعنی جوشؔ ادب کی اور اصناف میں اب جدید نہیں ہیں، مگر مرثیے میں جدید ہیں۔ یہی حال جمیلؔ مظہری اور آلِ رضا کا ہے۔ مجھے اس سے انکار قطعاً نہیں ہے کہ ان اصحاب کا مرثیہ گوئی میں مقام بلند ہے۔ بلاشبہ ہماری تاریخ میں ان کے مرثیے نئے اسباق کا درجہ رکھتے ہیں بلکہ ان کے مراثی ہمارے جدید نصاب زندگی سے بہت قریب ہیں اور خصوصاً جوشؔ کے مراثی ہمارے مرثیے کا ایک نیا سنگِ میل اور اُفقِ مرثیہ نگاری کا منشور بھی ہیں مگر اس کے باوجود ہم اُنھیں اب جدید مرثیہ گو نہیں کہہ سکتے۔

اب جہاں تک جدید مرثیے کا تعلق ہے تو اس کا میدان صاف ہے۔ دو چار نام اگر بابِ ذہن میں آکر دستک دیتے ہیں تو اُن کی صورت کچھ تو منزلِ مزاولت میں ہے، باقی مجالسِ عزا کی واہ اور آہ سے آگے نہیں ٹھہرتی۔ ان کے مرثیے ادب کا ورثہ نہیں بن سکتے۔

"جو سچ پوچھئے تو باقاعدہ جدید مرثیہ گو شاعر ایک ہی ہے اور وہ ڈاکٹر صفدر حسین ہیں جنھوں نے پچھلے دس برسوں میں جم کر مرثیے کی شاعری کی ہے۔ مرثیہ گوئی کے لئے اُنھوں نے بڑے پاپڑ بیلے ہیں۔ میرے اندازے کے مطابق مرثیہ کہنے کے لئے اُنھوں نے پندرہ برس کا علمی بن باس لیا ہے اور

س عرصے میں اُنھوں نے مرثیے کے گیان اور دھیان کی تپسیا کی ہے، دبستانِ مرثیہ کا عمیق اور اک حاصل کیا ہے نہ صرف اپنے یہاں بلکہ بعض دوسرے ادبیات میں! رزمیہ، ایپک اور المیہ شاعری کا مطالعہ بنظرِ غائر کیا، اور اس کے پس منظر میں اُردو مرثیے کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ مرثیے کے بڑے سنجیدہ مسائل پر تنقیدی اور تحقیقی مقالے اور کتابیں لکھی ہیں جن کے نام گنوانے کی یہاں فرصت نہیں ہے۔ فقط ڈاکٹر صفدر حسین کی صنفِ مرثیے سے گرویدگی اور تشویق کی ایک مثالِ واقعی کی نشاندہی کرنا مقصودِ خاطر ہے۔ گویا اس طویل علمی بن باس کے بعد ڈاکٹر موصوف نے سب سے پہلا مرثیہ ۱۹۶۲ء میں آئینِ وفا کے نام سے رقم کیا۔ یہ مرثیہ ہر اعتبار سے نئی جہت کا حامل اور پرانی روایت کا عامل، نیز نئے اور پرانے امتزاج کا بڑا دلکش مرقّع ثابت ہوا، مگر اس کے باوجود پورا مرثیہ پڑھنے والے کو آخر میں یہ ضرور اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مرثیہ ابھی کئی اعتبار سے ادھورا ہے۔ احساس یہ ہوا کہ ابھی فن اور فکر کی بہت سی منزلوں کی راہیں کھلی تو ہیں مگر شاعر ابھی ایک طرح کی ذہنی ہجرت میں مبتلا ہے، اپنی منزل سے ہمکنار نہیں! جلوۂ تہذیب (جو اُن کا دوسرا مرثیہ ہے) پڑھنے کے بعد وہ خلش تو ختم ہو جاتی ہے مگر پیاس نہ شاعر کی بجھتی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور نہ قاری کی۔ درحقیقت اس مرثیے میں شاعر پہلے سے زیادہ اعتماد کے ساتھ فکر اور فن کا سفر طے کرتا ہے۔ شروع ہی سے مرثیہ فکر کی ایک نئی سمت سے طلوع ہوتا ہے اور اُفق در اُفق تہذیب کے ارتقا میں امامِ عالی مقام کی شہادتِ عظمیٰ کا ایک تناظرِ دلنشیں پیش کرتا ہے۔ حسینؑ کو عمرانی تسلسل کی مرکزی علامت بنا کر آتشِ سینا، سینۂ گوتم و زرتشت کا شعلہ اسی کے سیاق و سباق میں پیش کرتا ہے اور آخر میں خونِ حسینؑ کو تہذیب کے ارتقا کی بہت بڑی معراج سمجھتا ہے۔ مرثیہ کا یہ موضوع نیا ہے۔ اُن کا تیسرا مرثیہ بھی اِسی سلسلے کی فکری اور فنی کڑی ہے۔ "چراغِ مصطفویؐ" میں بھی انسانی ارتقا اور ارتفاع کا ایک فکری اور ادبی رشتہ قائم کیا گیا ہے۔ آدمؑ سے رسولؐ اور رسولؐ سے امامؑ تک پیغمبری، الہام، وحی اور

جہاد کے تسلسل میں شہادتِ حسینؑ کو بڑے فنکارانہ تجدد کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر صفدر حسین کا چوتھا مرثیہ "علمدارِ کربلا" میرے مطالعہ میں نہیں آسکا البتہ اُن کے پانچویں مرثیہ "مقامِ شبیریؑ" کے مطالعے سے میں مستفیض ہوا ہوں۔ اِس مرثیہ میں اُن کی قادرالکلامی اپنی پُوری انا کے ساتھ فن کے جلوے اور جوہر دکھاتی ہے۔ اس مرثیے میں کلاسکی رنگ کا غلبہ زیادہ ہے اور وہ جو ڈاکٹر ناظر حسین نے ڈاکٹر صفدر حسین کو انیسؔ کا روحانی شاگرد کہا تھا، ڈاکٹر صفدر نے کچھ اُس کا حق زیادہ ادا کیا ہے۔ اس مرثیہ میں قابلِ تحسین نکتہ یہی ہے کہ اسے ہئیتی تغیرات کا بہترین اور کامیاب تجربہ کہا جاسکتا ہے۔ ڈاکٹر موصوف نے اس تجربے سے نئے مرثیے کے فنّی امکانات روشن کر دیئے ہیں۔

مجھے اندازہ ہے کہ ان مرثیوں کے فکری اور فنّی جائزہ کے لئے جس تفصیل کی ضرورت تھی اُس کا مجھے موقع نہ مل سکا تاہم اتنا عرض کروں گا کہ یہ مراثی اپنی صنف کی ایک ایسی دستاویز ہیں جو ہمارے مرثیے کے تاریخی تسلسل میں ایک ایسے نئے باب کی حیثیت رکھے گا جس کا عنوان ——"نئے اور پرانے مرثیے کا سنگم" ہوگا اور جسے رثائیہ ادب میں نقشِ نافراموش کا شرف ہمیشہ حاصل رہے گا۔

۴۔ اکتوبر ۱۹۷۶ء